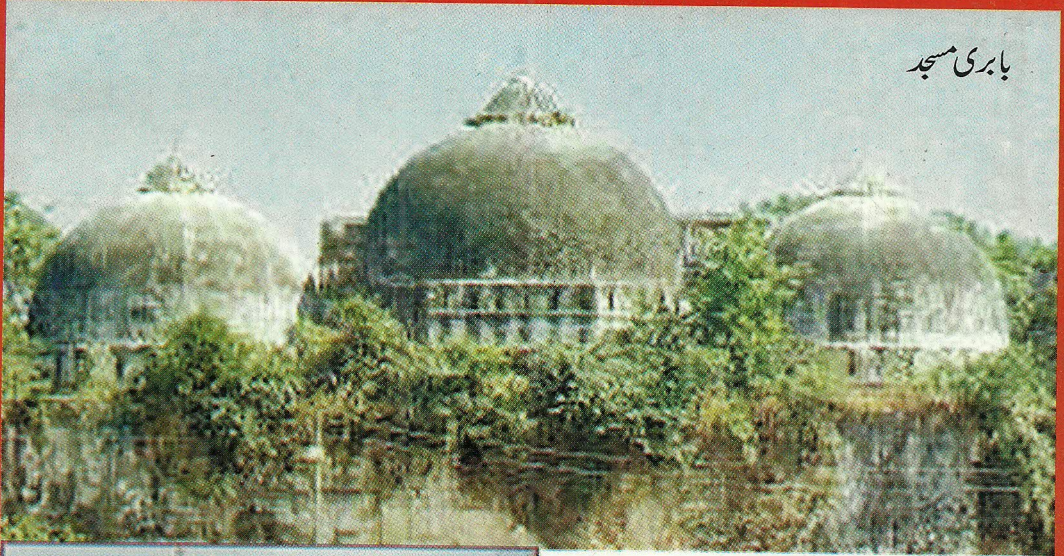
سیاست میں رذالت

بابری مسجد کی شہادت

(تاریخ کے اہم واقعات)

پروفیسر خان محمد عاطف خان







سیاست میں رذالت

بابری مسجد کی شہادت

تقسیم بنگال سے بابری مسجد کی شہادت تک

(تاریخ کے اہم واقعات)

ڈاکٹر خان محمد عاطف

معصومہ اینڈ کمپنی

H-76، سیکٹر 11، پرتاپ وہار، غازی آباد، اتر پردیش -

سیاست میں رذالت: بابری مسجد کی شہادت

مصنف : ڈاکٹر خان محمد عاطف

اشاعت : 2010ء

غلاف : چودھری سلطان الدین

مطبع : نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔

ناشر : معصومہ اینڈ کمپنی

H-76، سیکٹر 11، پرتاپ وہار، غازی آباد، اتر پردیش

Masooma & Co.

H-76, Sector 11, Pratap Vihar
Nr. Vijay Nagar, Ghaziabad, U.P., India

Price Rs. 250/-

Library Edition : Rs.350/-

Distribution and Marketed by:

M.R.PUBLICATIONS
Communication Address:
3871, 4th Floor, Kalan Mahal
Daryaganj, New Delhi-110002

Showroom
1645, Patuadi House
Daryaganj, New Delhi-110002
Cell: 9810784549, 9211532140
E-mail: abdus26@hotmail.com

Aks-o-Awaz
2724/16, Metropole Market
Behind Moti Mahal
Restaurent
Daryaganj, New
Delhi-110002

Siyasat me Razalat: Babri Masjid ki Shahadat

By : Prof. Khan Mohammad Atif

سیاست میں رذالت

اور

بابری مسجد کی شہادت

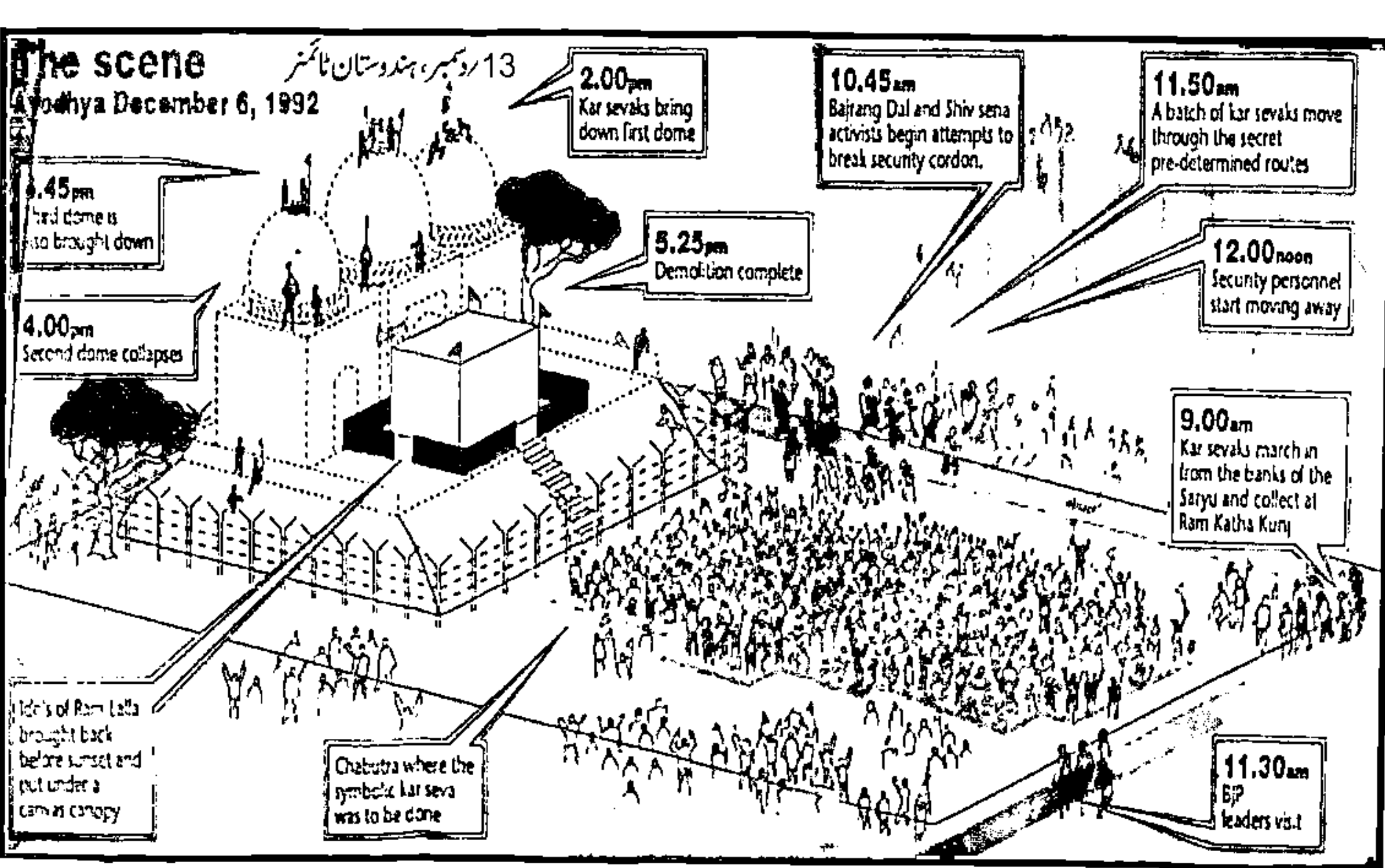








انہدام کے لئے بابری مسجد کے اوپر چڑھے کارسیوک۔



The scene
odhya December 6, 1992
13 دسمبر، ہندوستان ٹائمز
2.00pm Kar sevaks bring down first dome
10.45am Bajrang Dal and Shiv sena activists begin attempts to break security cordon.
11.50am A batch of kar sevaks move through the secret pre-determined routes
.45pm ird dome is so brought down
5.25pm Demolition complete
12.00noon Security personnel start moving away
4.00pm Second dome collapses
9.00am Kar sevaks march in from the banks of the Saryu and collect at Ram Katha Kunj
Chabutra where the symbolic kar seva was to be done
11.30am BJP leaders visit

مسجد انہدام
کے بعد کے
کچھ مناظر





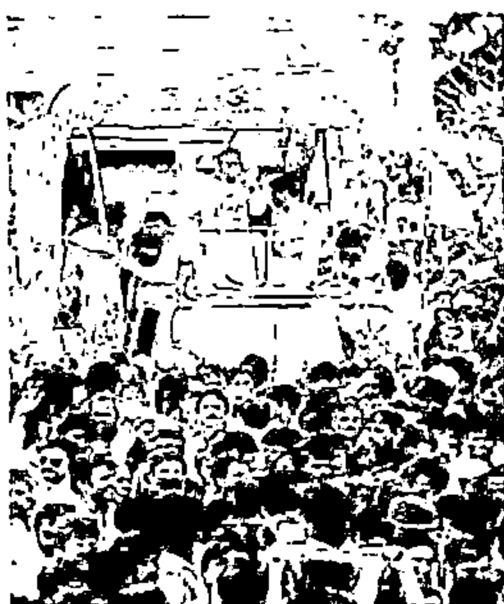




مسجد پر دھاوا بولنے کا منظر







مذہبی وسیاسی رہنماؤں کی رتھ یاترا



مذہبی وسیاسی رہنماؤں کی رتھ یاترا



کارسیوکوں کا مسجد پر حملہ





فہرست

☆☆☆

سیاست میں رذالت
بابری مسجد کی شہادت

درست آگہی کے لئے وسعت نگاہ اور جمہوری قدروں کے تحفظ کے لئے فراخ دلی کی ضرورت ہوتی ہے اسلئے کہ جمہوریت کسی خاندان جماعت یا اکثریت کی جائیداد نہیں ہے، اس کی حدیں اقتدار کی کرسیوں سے شروع ہو کر کھیتوں، کھلیانوں اور غریبوں کے جھوپڑوں تک جاتی ہیں اسلئے کہ سب کے تعاون سے ہی جمہوری عمل شروع ہوتا ہے اور دستور و آئین سبکو باوقار زندگی گزارنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس طرز حکومت میں اقلیت واکثریت کی بنیاد پر حق و ناحق کا طریقہ دستور و آئین کی روح کے خلاف ہے۔۔۔ اور ہم انہی خلاف ورزیوں کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔

ڈاکٹر خان محمد عاطف

اک نظر بھی قدر دانِ جوہر قابل نہیں
ہند کے اُجڑے ہوئے سینہ کے اندر دل نہیں

اِنتباہیہ

آزادی ہند اور بنگال و پنجاب کی تقسیم کے بعد مسلمان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا. مگر کیرالا میں ایک مرد مومن ترکی ٹوپی لگائے مضبوطی سے اپنی جگہ پر انڈین یونین مسلم لیگ لیے کھڑا تھا یعنی مولوی محمد اسمٰعیل صدر مسلم لیگ مگر ابوالکلام آزاد مسلمانوں کے خطیب اعظم کے شانے جھک گئے تھے. سنہ ۱۹۱۲ء سے سنہ ۱۹۴۲ء تک مسلمانوں کو آگے آگے چلنے کا مشورہ دینے والا سنہ ۱۹۴۸ء میں مشترکہ سیاست کی نہ صرف وکالت کرنے لگا تھا بلکہ ہندستانی سیاست کا غلام بنکر رہنے کا مسلمانوں کو حکم دے رہا تھا. کل کہا تھا تمھارے پاس اسلام ہے اور اسلام آگے چلنے کے لیے ہے پیچھے چلنے کے لیے نہیں اسلئے ہندستان کی آزادی کا جھنڈا تمھارے ہاتھ میں ہونا چاہئے تاکہ ہندستان کی دوسری قومیں تمھارے پیچھے پیچھے چلیں اور اب حکم تھا اپنی الگ سیاسی پارٹی نہ بناو بلکہ کانگریس میں ضم ہوکر اپنی تقدیر کو اسی سے جوڑ دو اسلئے کہ اسوقت تک دوسری کوئی سیاسی پارٹی تھی نہیں ...... یہ وہ پہلی اینٹ تھی جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی سیاسی عمارت کی بنیاد آجتک سیدھی نہ ہوسکی اور پھر جب سیاسی پارٹیوں کی بھرمار شروع ہوئی تو مسلمانوں کی سیاسی وحدت بکھرنے لگی اور ہر سیاسی پارٹی میں پرساد یا تبرک کی طرح امت واحدہ اور خیر امت تقسیم ہوتی چلی گئی اور ہر پارٹی کا ہندو لیڈر اسے اپنا غلام سمجھنے لگا. یہی حالت کانگریس میں ابوالکلام آزاد اور رفیع احمد قدوائی کی ہوئی ان کے جذبات کا احترام نہ کرکے پنڈت نہرو کے زمانہ میں جو مولانا کے مشورہ کے بغیر کہا جاتا ہے کوئی کام نہیں کرتے تھے بابری مسجد کو بتکدہ بنایا گیا اور ان کے جذبات کا احترام نہیں کیا گیا.

میں نے خود سنہ ۱۹۶۶ء سے سنہ ۱۹۸۰ء تک جن سنگھ کی خدمت کی اور مجھے پنڈت دین دیال اپادھیا، نانا جی دیش مکھ، کنج بہاری لال راٹھی، اٹل بہاری واجپئی، رام

پرکاش گپتا، کلیان سنگھ، سندر لال بھنڈاری اور بلراج مدھوک کے ساتھ کام کرنے اور انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ راجیندر سنگھ عرف رجو بھیا سے مختلف مسائل پر پہروں گفتگو ہوئی ہے۔ پنڈت دین دیال اپادھیا میری عزت کرتے تھے رام پرکاش گپتا آج بھی محبت کرتے ہیں۔ اٹل بہاری واجپئی پہچانتے ہیں۔ یہ دونوں فرقہ پرست نہیں ہیں مگر کمیونل سیاست انکی مجبوری ہے۔ میں نے اٹل بہاری واجپئی سے جب وہ وزیر خارجہ تھے کہا تھا کہ آپ نے مسلم ملک دیکھے تو کیسے لگے۔ کہنے لگے تیل کی دولت نے انھیں مالامال کردیا ہے۔ میں نے کہا ابھی اور بھی خزانے ان زمینوں میں چھپے ہوئے ہیں یہ میرے رسولؐ کا قول ہے کہ دنیا کی دولت میرے ان قدموں کے نیچے ہے۔ اگر آپ ان ملکوں کے حاکم ہوجائیں تو یہ دولت نکالی جاسکتی ہے۔ ہنسنے لگے کہ میں کیسے وہاں کا حاکم ہوسکتا ہوں۔ میں نے کہا میرے پاس ایک نسخہ ہے اگر آپ اسے استعمال کرلیں تو ہندستان، پاکستان بنگلہ دیش اور پورا عالم اسلام آپ کے قدموں تلے آجائے گا۔ بولے وہ کیا؟ میں نے کہا آپ ہندستان کی حکومت نفرت پھیلاکر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ حکومت کے لیے اتنی اوچھی کٹار کو ترک کرکے اسلام کی ذوالفقار اٹھا لیجئے اور اپنی پوری قوم کو لیکر اسلام کے سمندر میں اتر جایئے تو ہم آپ کو امیرالمومنین خلیفۃ المسلمین بنا کر قیام خلافت کا اعلان کرکے سب کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کردیں گے اگر اسلام قبول کرکے آدھی دنیا کی حکومت ملے تو کیوں نہ ہمت کرکے لے لیجئے۔ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا ہاں یہ ہو تو سکتا ہے مگر اتنا تلخ نسخہ حلق کے نیچے کیسے اترے گا؟

اصل یہی ہے کہ مسلمان کے لیے بھی یہ نسخہ اتنا ہی تلخ بن گیا ہے جتنا اٹل بہاری کے لیے اور اسی کے نتیجہ میں مسلمان ہندوؤں کی سیاسی غلامی میں پڑا سسک رہا ہے اور چند سکوں، سرکاری گاڑیوں، بنگلہ کی لالچ میں بابری مسجد میں داخل ہوکر قسم بھی کھا آیا کہ یہیں مندر بنائیں گے اور اسے بابری مسجد کی شہادت پر اتنا دکھ بھی نہیں ہوا جتنا اپنے بیت الخلا کی دیوار گرنے پر ہوتا۔

کانگریس نے رفیع احمد قدوائی اور مولانا آزاد کے جذبات کا احترام نہیں کیا تھا تو

بی۔ جے۔ پی اپنے زر خرید غلاموں کے جذبات کا کیا احترام کرتی۔ اور جب اس کے لیڈر دیکھ رہے تھے کہ چند سکوں کی لالچ میں وہ خود ہی اونچی آواز سے جے شری رام پکار رہے ہیں تو ان کے جذبات کا احترام کیسا؟

جب سیاست مشترک ہو گئی تو جذبات میں مشترک ہو گئے مگر یہ چند مسلمانوں کی کہانی ہے عام مسلمان آج بھی ان حرکتوں سے بیزار ہے اور اسی بیزاری اور ہندو لیڈروں کی ناروا داری کا غیر جانبدارانہ تجزیہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

مسلمانوں نے تقسیم سے پہلے بھی کوشش کی تھی کہ دستوری ضابطے مقرر کرکے ہندو مسلم مسئلہ کو حل کر دیا جائے آج پھر فرقہ پرستی کا طوفان اسی ڈگر پر لیے جا رہا ہے مسلمان کو سبق پڑھانے کا عمل بند کر دیا جائے اسلئے کہ وہ پورا قرآن یاد کر لیتا ہے۔ سبق پڑھنے کے بعد جب وہ یاد کر کے دہرائے گا تو خطرات کا بھی سامنا کرنا ہوگا ابھی اس عمل کو روکا جا سکتا ہے مگر دونوں ہاتھوں سے تالی بجے گی مسلمان ہر باعزت حل کو قبول کرے گا لیکن کثرت تعداد بتا کر گردن توڑ مروڑ دینے کی کوشش میں بے شمار ہاتھ بھی گنوانا پڑیں گے۔

مسلمانوں نے ہر سیاسی پارٹی کی خدمت کی اسلئے مسلمان پر علاحدگی کا کوئی الزام نہیں لگا سکتا ہم سب کے ساتھ چلے مگر ہمارے ساتھ نہ صرف یہ کہ کوئی چلا نہیں بلکہ سب نے دھوکا دیا اور ہندستانی سیاست کے اسی... پن کے کے نتیجہ میں بابری مسجد شہید کروا دی گئی۔

اگر ملک کے سیاسی لیڈروں نے کھلے دل سے کتاب کو پڑھا اور بدی کی نشاندہی کو خیر سے بدلنے پر عمل کیا تو ہمیں امید ہے کہ نئی بنیادوں پر ہندو مسلم تعلقات کو استوار کرکے ایک بار پھر مضبوط ہندستان بنایا جا سکتا ہے۔

ہندستان کی دیوار کے اندر اور دیوار کے باہر نوے کروڑ مسلمان کھڑے ہوئے ہیں۔ اسکی دیوار کے باہر پچاس لاکھ مسلمان فوجیں صبح و شام فوجی مشقوں میں لگی ہوئی ہیں۔ یہ ہم ایک واقعہ کا ذکر کر رہے ہیں کسی کو خوفزدہ کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے۔

ایک ہزار برس کے ہندو اور مسلمان کے بیچ گہرے اور قریبی تعلقات ہیں۔ ان دونوں کے بیچ یہودیوں اور عیسائیوں جیسی مذہبی جنگیں بھی نہیں ہوئیں سارے اختلافات سیاسی رہے ہیں جبکہ چودہ سو برس سے مذہبی نفرتوں کے شکار یہودی اور مسلمان۔ یعنی اسرائیل اور فلسطینی اپنی پرانی عداوتوں کو ختم کرکے ایک پرامن معاہدہ کرکے شریفانہ زندگی گزارنے کا عہد کر رہے ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ اسرائیل اور عرب چچازاد بھائی ہیں تو یہ بھی سچ ہے کہ ہندو اور اکثر مسلمان سگے بھائی ہیں۔ صرف دونوں کے بیچ طریق زندگی کا فرق ہے اور ہم جب حاکم تھے تو ہم نے سبکو گوارہ کیا تھا۔ سبکو زندہ رہنے کا حق دیا تھا۔

اسلام میں حکمرانی کے دو نام تھے خلیفہ اور امیر لیکن ہندستان میں ہم نے حکومت پر مذہب کا پرچم نہیں بلند کیا تھا اسلئے کہ یہ ملک مختلف مذاہب اور عقاید کا گہوارہ تھا۔ اسوقت "سیکولر" کا لفظ ایجاد نہیں ہوا تھا مگر آج کی اصطلاح میں ہم نے عملی سیکولر حکومت قائم کی تھی۔ جس کے لیے ہم نے سلطان یا بادشاہ کا لفظ استعمال کرکے یہ بتا دیا تھا کہ ہم حکومت میں اسلام کا عدل و مساوات تو داخل کریں گے مگر ہماری حکومت سب کے لیے ہوگی اور لیاقت کی بنیاد پر سبھی کو آگے بڑھنے کا موقع ملے گا اور حاکم ہونے کے ناطے ہم اپنے وعدے پورے کرین گے یہ کوئی ڈینگ نہیں تاریخ کے روشن صفحات پر اس کے روشن ثبوت ثبت ہیں۔

مسلمان ہندستان کا دشمن ہو نہیں سکتا اسلئے کہ پچھلے ایک ہزار برس سے یہ اسکا گھر ہے اور جب ہم اس گھر کے مکھیا تھے تو ہم نے گھریلو اتحاد کو مضبوط کرکے دنیا کے نقشہ پر اسے سونے کی چڑیا بنا کر پیش کیا تھا۔ جب ہمارے چھوٹے بھائی حاکم ہوئے تو انھوں نے اسے چھوٹا کرکے تین ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ ہم نے مسلمان کو بڑا بھائی کہا۔ وہ اسلئے کہ ہم نے ہر موقع پر بڑے ہونے کا ثبوت دیا ہے کثرت تعداد سے کوئی بڑا نہیں ہو جاتا۔ جب ہم حاکم تھے ہندستان کا ذرہ ذرہ ہماری بڑائی کی شہادت دے رہا تھا۔ جب انگریز آیا تو قائداعظم محمد علی جناح نے دستوری اور آئینی ضابطوں کا ایک خاکہ مرتب کیا

ہندو لیڈروں نے اسے نہیں مانا بلکہ کہا ہم تم کو بنگال اور پنجاب بانٹ کر دیں گے پورا ہندستان نہیں بانٹیں گے ان صوبوں کے مسلمانوں نے اسے بھی قبول کرلیا۔

آزادی کے بعد ہندو لیڈروں نے ایک آئین بنایا مسلمانوں نے اسے قبول کرلیا اور اس آئین کے مطابق عدالتوں، اقتصادی ضابطوں اور سیاسی نظام کے تحت سارے ہندو لیڈروں کو اپنا لیڈر مان لیا۔ پھر بے شمار مسائل میں جو فیصلے تم نے کئے قبول کر لئے۔ بابری مسجد کا مقدمہ تم عدالت میں لے گئے ہم نے کہا ہم عدالت کا فیصلہ قبول کریں گے پھر تم نے عدالت کے فیصلہ کو نہ قبول کر کے اسے اپنی آستھا (عقیدہ) سے جوڑ دیا بابری مسجد کو توڑ کر ۲۶/ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء کے اپنے ہی بزرگوں کے بنائے ہوئے آئین کو روند دیا تو ہم سوچنے لگے کہ کیا جس طرح بابری مسجد کی وحدت کو پارہ پارہ کردیا ہے یہ لیڈر اس ملک کو بھی پارہ پارہ کر دیں گے؟

امریکہ اور اسرائیل کی نظر کرم کے نتیجہ میں اگر بابری مسجد پارہ پارہ ہوئی ہے تو وہیں ملک کی وحدت کا نقشہ بھی بگاڑا جا رہا ہے۔ ہمارا کام ہے انتباہ دینا کہ روس کے بعد امریکہ کی نظر میرے عزیز و محبوب وطن پر ہے وہ شمال مشرق میں ایک عیسائی ریاست بنا کر ملک کو کئی حصوں میں تقسیم کرنے کی تیاری میں لگ گیا ہے۔ مشرق وسطی میں اسے فلسطین و عرب و اسرائیل سمجھوتہ کے بعد اپنی توانائی کو یہیں لگانا ہے ملک کے ہندو لیڈروں کے لیے نہ اسرائیل کی چورائی کار آمد ہوگی نہ امریکہ کی پر فریب رفاقت، ہاں اگر کام آسکتی ہے تو ہندستانی مسلمانوں کے ساتھ رواداری اور اس کے لیے ہندو لیڈر سچے دل سے آئین ہند کے سانچے میں اپنے کو فٹ کرلیں اور بدلے ہوئے حالات میں بڑے بھائی کا رول ادا کرنے کے لیے فراخدلی، قربانی اور صبر وضبط کا نمونہ پیش کریں تو ہم ہندستان کو بچالیں گے۔

گذشتہ چند برسوں میں جس طرح کے سیاسی بچے پیدا ہوئے ہیں تاریخ کے کسی دور میں اتنی بڑی تعداد میں پیدا نہیں ہوئے دو چار نام زبانوں اور تاریخ کی کتابوں پر ہیں۔ میر جعفر، میر صادق، الٰہی بخش، امی چند سوداگر مگر آج تو گلی کے ہر نکڑ پر نہ جانے کتنے غدار

جھنڈا لئے کھڑے ہیں ان ہی سیاسی بچوں کی قیادت میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اسی اہم نکتہ کو سمجھ کر اپنی سیاسی وحدت سے ملت کی سربلندی جڑی ہوئی ہے۔

اسپین کا بڑا ذکر ہے ملک کے فرقہ پرستوں اور مسلم پچ نصیبوں کے پاس [سندھ پاکستان میں گدھا گاڑی چلتی ہے جس میں اصل گدھا جس پر گاڑی کا بوجھ ہوتا ہے اور دوسرا گدھا اس کے ساتھ اس طرح لگایا جاتا ہے کہ وہ بغیر بوجھ کے دوڑتا ہے اسے دوڑتا دیکھ کر بوجھ والا گدھا بھی اسی رفتار سے دوڑنے لگتا ہے اور اس خالی گدھے کو پخ کہتے ہیں] آج کا ترقی پسند مسلمان اسی فکری پخ کے ساتھ دوڑ رہا ہے۔

اسپین کی تاریخ میں زندہ قوموں کے لیے، حکمران قوموں کے لیے۔ اپنے ملکوں کو ترقی کی راہوں پر لے جانے والوں کے لیے اور زمین پر زندہ رہنے کے اصول سے واقفیت کے بڑے رموز چھپے ہوئے ہیں۔

اسپین کے ایک شہر غرناطہ میں تین ہزار مسلمانوں کو جلایا گیا۔ تیرہ ہزار کو مختلف قسم کی سزائیں دی گئیں۔ اسی ہزار کتابیں جلادی گئیں۔ پھر اجتماعی جلاوطنی کا حکم دیا گیا۔ تیس لاکھ غیرت مند مسلمان جنھوں نے غلامی قبول نہیں کی۔ اسپین سے نکل گئے۔ تاریخ عالم کا اجتماعی قتل انسانی وحشت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ جس پر تاریخ کی آنکھ آج بھی نم ہے۔ مگر ہندستان کی آزادی نے بھی دس لاکھ انسان اِدھر سے اُدھر کیے۔ اور چھیالیس برسوں میں بیس ہزار فسادات میں دولاکھ سے زیادہ مسلمان مارے گئے۔ اس میں سات لاکھ [illegible] بابری ایکشن مارے جانے والوں کا ذکر نہیں ہے

اسپین کے ایک شہر طلیطلہ میں دولاکھ بالغ مسلمانوں میں سترہ ہزار سے بھی کم زندہ بچے تھے۔ اور قرطبہ میں دس لاکھ میں پیالیس ہزار زندہ بچے۔

لیکن اس وحشت و بربریت کا نتیجہ کیا نکلا۔ اسپین کے ایک سو پچاس شہروں میں صرف تیرہ شہر تباہی سے بچے۔ تاریخ میں کسی ملک پر ایسی تباہی نہ آئی ہوگی جو اسپین میں وہاں کے مسلمانوں کی بربادی کے بعد آئی۔ دنیا میں کوئی ایسی مثال نہ ملے گی۔ آج کے جاپان، فرانس اور امریکہ جیسے ملکوں کا مرتبہ رکھنے والا اسپین اتنی تیزی سے تباہ ہو جائے۔ علم و فن، کھیتی باغبانی تباہ۔ بڑے بڑے کارخانے بند ہو گئے۔ کاشتکاری کے اوزار برباد ہو گئے۔

زرخیز زمینیں بنجر ہوگئیں، اور شہروں پر ویرانی و وحشت طاری ہوگئی۔

اشبیلیہ میں سولہ سو کارخانے تھے، ایک لاکھ تیس ہزار مزدور کام کرتے تھے ختم ہوگئے۔ طلیطلہ میں کپڑا تیار کرنے کے پچاس کارخانے تھے۔ صرف تیرہ بچے۔ ریشمی کپڑا بنانے والے سارے کارخانے تباہ ہوگئے۔ جن میں چالیس ہزار مزدور کام کرتے تھے۔

قرطبہ، سقوبیہ، اور برغش بڑے بڑے شہر ویرانی کا شکار ہوگئے۔ سنہ ۱۴۹۲ء میں تباہی کے بعد اٹھارھویں صدی میں سقوبیہ میں ایک کپڑے کا کارخانہ کھل سکا اور اسکو بھی چلانے کے لیے ہالینڈ سے کاریگر بلائے گئے۔ سنہ ۱۷۷۶ء تک دوا سازی کرنے والا اسپین میں ایک شخص بھی موجود نہیں تھا۔ اور نہ جہاز بنانے کے کاریگر رہ گئے تھے۔ مسلم دشمنی کی آگ میں سب کچھ بھسم ہوگیا۔

جو لوگ مسلمانوں کو مٹنے کے خواب دیکھ رہے ہیں اور ہندستان کو اسپین بنانے کی دھمکی دے رہے ہیں وہ مسلمانوں کی بربادی کے ساتھ اسپین کی اقتصادی، سماجی اور علمی بربادی پر بھی نظر ڈال لیں اور یہ یاد رکھیں کہ مسلمان مٹنے کے لیے نہیں ہے وہ چاند کی طرح گھٹتا بڑھتا رہتا ہے مگر فنا نہیں ہوتا۔

سنہ ۷۱۱ء سے سنہ ۱۴۹۲ء تک مسلمانوں نے اسپین میں تہذیب و تمدن کے چراغوں کو روشن کیا۔ یورپ میں یہ جہالت و تاریکی کا زمانہ تھا۔ انھوں نے گرتی ہوئی یونانی تہذیب و علم کو انکی کتابوں کے ترجمے کرکے سہارا دیا۔ یونان کی طب کو بہت آگے بڑھا دیا مگر اسکا نام نہیں بدلا طب یونانی ہی کہا۔ چاہتے تو طب عربی کہنے لگتے مگر دوسروں کے سہارے بڑا بننے کا شوق مسلمانوں کو کبھی نہیں رہا۔ انھوں نے قدیم تہذیب و تمدن اور جدید تمدن میں مضبوط رشتوں کو فروغ دیا۔ تحقیقی کاموں کے ذریعہ علم و فن کی مختلف شاخوں میں کمال پیدا کرکے علم و ادب کی ہر طرح خدمت انجام دی۔ شہروں کو خوبصورت بنایا۔ باغات، نہریں، محل اور شاندار مساجد بنوائیں۔ ان کے شہر تہذیب و تمدن، علم و فن، اور ادب و سائنس کی عظمت کے نشان تھے۔ اسپین کا شہر "کوردوا" مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا شاندار مرکز تھا۔ انھوں نے محراب و گنبد بنا کر

فن تعمیر کو نئی تخلیق عطا کی۔ عربوں کے فن عمارت سازی سے دنیا کو بڑا فائدہ پہونچا۔

انھوں نے ادب میں نصیحت آمیز قصے، عشقیہ داستانیں، تاریخ کی کتابیں، سوانح، جن میں اسماءالرجال کے نام سے پانچ لاکھ انسانوں کی مکمل سوانح پیش کر کے دنیا کو حیرت زدہ کر دیا۔ انھوں نے بین الاقوامی تعلقات و روابط پر مستقل کتابیں لکھیں۔ محمد بن حسن الشیبانی متوفی سنہ ۱۸۱ھ نے بین الاقوامی قانون پر ایک کتاب لکھی۔ جرمنی میں سنہ ۱۹۷۲ء میں اسکی یاد میں ایک سوسائٹی عمل میں آئی ہے اسکا نام شیبانی سوسائٹی برائے بین الاقوامی حقوق ہے۔ تاریخ کو سائنس بنایا۔ واقعات کی تحقیق کر کے تاریخ اور کہانی میں فرق قائم کیا۔ فن کتابت کو ایجاد کیا اور رواج دیا۔

عربوں نے اسپین میں زراعت کو ترقی دی۔ فلاحت کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا۔ مختلف قسم کے پھولوں کو رواج دیا۔ نہریں نکالیں اور زمین کو زرخیز بنانے کے طریقے ایجاد کئے۔ انھوں نے پہاڑوں اور ریگستانوں میں زراعت کو ترقی دی۔ اور شہروں کو آباد کیا۔ مویشیوں کی اعلیٰ نسلیں تیار کیں۔ اس طرح انھوں نے نسل انسانی پر جو احسانات کئے تھے اسپین میں انکی بربادی نے ترقی کی اس شاہراہ کو بند کر کے اسپین کو بھی مٹی کا ڈھیر بنا دیا اور آج تک اسپین وہاں نہ پہونچ سکا جہاں سات سو برس تک اپنا خون دیکر مسلمانوں نے پہونچایا تھا ملک کے بیمار ذہنی مریضوں نے ہندستان کو اسپین بنانے کا نعرہ تو دیا۔۔۔۔ مگر یہ نہیں دیکھا کہ مسلمانوں کی بربادی کے ساتھ ہی اسپین کا کیا ہوا؟

ملک میں حکومت و سیاست و دولت کا مزہ لینے کے لیے اور جمہوریت کی برکتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے مسلمانوں سے زیادہ ہندووں کو امن کی ضرورت ہے ورنہ خوف و دہشت کی نذر ہو کر وہ خود بے خوفی کی زندگی کے بجائے دہشت گردی کا شکار ہو کر بے کیف زندگی کا پیکر بن جائیں گے۔

وطن کو خون کے دریا میں مت نہلاؤ جلادو
مسلماں ہو گیا تم سے جو بیگانہ تو کیا ہوگا

گفتار ناتمام

کون آئے ذہن کے تاج و علم کے سامنے
کانپتی ہے تیغ چنگیزی قلم کے سامنے

ہندستان کے مسلمان ایک زندہ قوم کی طرح رواں دواں ہیں۔ کل بھی وہ زندہ تھے اور کل بھی وہ زندہ رہیں گے۔ ہندستان کی کوئی قوم اس راہ میں انکا مقابلہ نہیں کر سکتی اس لئے کہ آج بھی اس قوم کے افراد میں بے شمار صلاحیتیں موجود ہیں۔ مسلمان اچھا کسان ہے۔ اچھا کاریگر ہے۔ ایماندار مزدور ہے۔ بار برداری اور بوجھ اٹھانے میں سب سے آگے ہے۔ ان پیشوں کو طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ طاقتور ہے۔ بہادر ہے محنت کش ہے اچھی صحت کا مالک ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو حلال روزی پر زندہ ہیں۔ رات و دن محنت کرتے ہیں عورت و مرد سب ملکر اپنا رزق کماتے ہیں۔ یہی لوگ مسلم امت کی جان بھی ہیں۔ غریب ہونے کے باوجود بے پناہ صبروضبط ان کے اندر موجود ہے۔ عمل کی طاقت کے یہ مالک ہیں۔ مسجدیں ان سے آباد ہیں۔ عیدگاہوں اور الوداع کی رونق ان کے دم سے ہے۔ ان کے اللہ اکبر میں جان ان کے درود وسلام میں بے ریائی کی شان ہے۔ فقیروں کو آٹا یہ دیتے ہیں۔ مدرسے ان کے حلال مال سے چلتے ہیں۔ نیکی کے ہر کام میں آگے۔ بدی اور شرارت سے دور۔

ان میں کپڑا بنانے والے بھی ہیں۔ ڈیزل انجن کے مکینک بھی اور فٹر بھی۔ بازاروں میں گرمی کے زمانہ میں بہترین کورے گھڑے انہی کے دم سے ہیں۔ لکھنؤ کا راج بھون ہو یا دہلی کا پریسیڈنٹ ہاؤس اسکی چھت کے نقش ونگار انہی ہاتھوں کی دین ہے۔ اس کے علاوہ کشیدہ کاری، قروشیہ، بنارسی ساری، کشمیری شال، زردوزی، سلمہ ستارہ، بہترین سناری

میناکاری، (لکھنؤ کی شیشے والی مسجد) معماری لکھنؤ کا کان رکھنے والا اما باڑہ، بھدوہی کا قالین، مرزاپور کی دری اور قالیچے۔ رفوگری، عمارتوں میں گلکاری، سنگ تراشی، لوہاری اور بڑھئی گری جیسے تہذیب وتمدن کو روشنی دینے والے پیشے مسلمان مردوں اور عوتوں کے ہاتھوں میں محفوظ ہیں۔

چیزوں کو بنانا مٹی کو لہو دیکر خوشرنگ کرنا۔ مردہ چیزوں میں جان ڈالنا۔ اللہ کا بندہ رہ کر اللہ کے کام کرنا صنعت وحرفت کو پروان چڑھانے میں اسطرح دوسری کوئی قوم مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ چیزیں بناتے مسلمان ہیں مگر ہندو سیٹھ ساہوکار ان کے بنائے ہوئے مال سے زیادہ نفع کما کر اپنی کوٹھیاں بنا لیتے اور کاریں خرید لیتے ہیں۔ مگر یہ سب اسی مسلمان محنت کش کے ہاتھوں کا کرشمہ ہے۔ حضرت موسیٰ کے ید بیضا کا معجزہ ہے۔

ہندستان کی ساری قومیں سرمایہ داری کرتی ہیں۔ مال کی طاقت سے مال کھینچتی ہیں سودی لین دین کرتی ہیں۔ بڑی بڑی ملوں کی مالک ہیں۔ خاتمہ زمینداری کے بعد ٹیکس چوری کے لیے فارمنگ کرتی ہیں۔ مگر مسلمان کا زور اپنے ہاتھوں میں ہے۔ ہاتھوں اور انگلیوں کے ہنر میں۔ اپنی دستکاریوں اور ان دستکاریوں کے حسن میں ہے۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ مسلمانوں نے یہ پیشے آج مجبوری کی حالت میں اپنا لیے ہیں۔ اسکا تعلق ان کی آزاد روی سے ہے دوکان پر بیٹھ کر خوشامد اور چاپلوسی والے پیشے ان کی اسلامی زندگی کی آزاد روی والی روح کے خلاف تھے۔ یہ پیشے اسلامی تعلیم کی آزاد روی اور آزاد زندگی کی دین رہے ہیں۔ اس میں اسوۂ حسنہ کی پیروی کو دخل ہے۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تجارت کرتے تھے۔ بکریاں چراتے تھے۔ دفاع کیلئے خندق کھودتے تھے۔ بیلچہ اٹھاتے تھے۔ پیٹ پر پتھر بھی باندھتے تھے اور پھر بھی فیاضی سے کام لیتے تھے۔ نبی کی بیویاں اور بیٹیاں چکی پیستی تھیں کپڑے گانٹھتی تھیں۔

جب مسلمان حاکم تھے تو ان کے شاعر وادیب وعالم اپنے نام کے ساتھ اپنے پیشے کو ضرور لکھتے تھے۔ فارسی کا شاعر فریدالدین عطار پڑیاں باندھتا تھا۔ امام غزالی (سوت کاتنے

والا)، عمادالدین کاتب (کتابت کرتا تھا)، محمود الوراق (الف لیلیٰ کا خالق) ٹھٹھیرا تھا۔ عباسیوں کا وزیر ابو سلمہ خلال (سرکہ بنانے والا) تھا۔ فارسی کا بڑا شاعر، معلم اور فلسفی عمر خیام (خیمہ سینے والا) تھا۔ یہ اپنے پیشوں پر فخر کرتے۔ خود شاہوں کا معاملہ یہ تھا کہ ٹوپیاں سیتے۔ قرآن لکھتے اور اپنے پیٹ کی روٹی حاصل کرتے۔ دنیا کی کسی قوم نے نہ ان پیشوں کو اپنایا نہ ان پر فخر کیا۔ اسی لیے کسی قوم کے عالموں کی تاریخ میں پیشہ وروں کا کوئی ذکر نہ ملے گا۔ مگر مسلمانوں نے وہ بادشاہ رہے ہوں یا فقیر انھوں نے ہنر کو کبھی نہیں چھوڑا۔ صنعت و حرفت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جسکے پیچھے خدا کا یہ اعلان کہ ہم نے زمین و آسمان کو دونوں ہاتھوں سے بنایا مسلمانوں کو کچھ بنانے کی دعوت دیتا تھا۔ ڈھاکہ کی ململ ہو یا پتھروں پر گلکاریاں ہوں یا احمد آباد (گجرات) میں پتھروں کی جالیاں ہوں یا مینار جنباں ہو، یہ سارے کام انھوں نے صرف ہندستان ہی میں نہیں انجام دیئے۔ ایران و ترکستان میں بہترین قالین بنائے۔ افغانستان میں واسکوٹ، قراقلی ٹوپیاں اور جوتوں کو زرنگار بنایا۔ بخارا میں ریشم کاتنا۔ مشہد میں لنگیاں تیار کرنا۔ دمشق میں تلواریں بنانا اور اسی کے دوش بدوش اطلس و زربفت و کمخواب تیار کرنا پھر گجرات و احمد آباد میں توپیں ڈھالنا۔ اور شیرشاہ سوری کا اپنے کاریگروں سے ہر مورچہ پر تانبے کے برتنوں سے توپیں بنوالینا اور جنگ کے بعد ان توپوں کو گلوا کر پھر برتنوں میں تبدیل کروادینا ایسا کارکردگی اور حسن انتظام کا نمونہ ہے جسکی نظیر کسی قوم میں ملنا دشوار ہے۔ ان کے جہازرانی اور جہاز سازی کے کارخانے یورپ روم و فرانس کو دہلاتے رہتے تھے۔ مسلمان شاعروں تک کی فیاضی کا یہ عالم تھا کہ سمرقند و بخارا کی سلطنتیں اپنے معشوق کے رخسار کے تل کے بدلہ دینے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ بغداد میں ہیروں کی ایک تاجر عورت کا ذکر تاریخ میں زندہ ہے اور ایسی ستر دوکانوں کی موجودگی بیان کی گئی ہے۔ ہیرے بیچنے کے باوجود ہیروں کو رگڑ کر ان میں جلا پیدا کرنے کا کام بھی انھیں کا تھا جنکو حکاک کہا جاتا تھا۔ یہ سب مسلمان تھے جو نیت کے بھی سیر تھے۔ جڑاؤ زیور بھی تیار کرتے ان پر نگینے بھی جڑتے اور ان میں توازن و حسن کاری بھی پیدا کرتے۔ آج بھی جدہ اور عرب کے بازاروں میں

ہندی مسلمان جڑاؤ زیوروں کا کام کر رہے ہیں جبکہ اب وہ کچھ بھی نہیں ہیں۔

اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ کا چاندنی چوک کا شیشہ بازار بڑی شہرت کا مالک تھا ایک فرانسیسی لکھتا ہے کہ اس بازار کے مقابلہ میں لندن و پیرس کے بازاروں کی کوئی حیثیت نہیں ہے آگے اس نے کہا کہ مسلمانوں نے ان پیشوں کو حقیر جان کر دوسروں کے سپرد نہیں کیا۔

کل عہد حکمرانی میں بھی وہ ہنرمند تھے۔ ان کے امراء و بادشاہ بھی ہنرمند تھے۔ آج وہ حاکم نہیں ہے تو آج بھی یہی مسلم پیشہ ور اور ہنرمند ہی ہندستان کی اقتصادی طاقت کا اصل سرچشمہ ہیں۔

آج کا مسلمان کوڑھی نہیں ہے۔ سارے ملک کو کھلا کر کھا رہا ہے۔ ہندستان سے جو مال باہر جاتا ہے اس میں یہی زردوزی، یہی چکن کا کام، بنارس کی ساریاں، کشمیر کی شال، مراد آباد کے برتن، سہارنپور کا لکڑی کا سامان، موتیوں کے ہار اور دیگر ساز و سامان ہی باہر جاتا ہے جس کے ذریعہ پورے ملک میں ساٹھ فی صد زرمبادلہ آتا ہے، جو مسلمان کماتا ہے۔ انکا یہی جذبہ فنکاری اور صنعت گری ملک و قوم کی زندگی کی علامت ہے۔ ملکی سیاست کی طاقت و قوت کا سرچشمہ ہے۔ یہ مسلمانوں کی محنت اور پسینہ کی عظمت کا نتیجہ ہے کہ آج بھی ہندستان زندہ ہے اور اسی صنعت و کاریگری کے زور پر باقی ہے ابتک نام و نشاں ہمارا۔ اگر مسلمانوں نے ان کاموں کو چھوٹا سمجھا ہوتا تو آج ہندستان کی یہ حیثیت نہ ہوتی جو دنیا میں بنی ہوئی ہے۔ مگر ملک کی فرقہ پرست آنکھ اندھی ہو چکی ہے جو انھیں ہاتھوں کو شل کرنے کا کام کر رہی ہے جو سب کو کھلا کر کھا رہے ہیں اور اپنی ہی تھالی میں چھید کر رہی ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی مسلمان ہمت کے ہتھیار لگائے کھڑا ہے اور اپنے وطن عزیز کی خدمت کر رہا ہے۔

اگر مسلمانوں میں ہمت کا یہ جوہر نہ ہوتا تو وہ اتنی تیزی سے ترقی نہیں کر سکتے تھے اگر کسی حادثہ یا معجزہ کے تحت کر بھی گئے تھے تو ایک لمبی مدت تک اسے برقرار نہ رکھ سکتے۔ مسلمانوں نے اپنے بل پر دنیا کے بے شمار علوم میں جو ترقی کی اور نئے علوم و

فنون کو جس طرح کمال عطا کیا اس میں دنیا کی کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔
آپ فن معماری میں تاج محل کو لے لیں جسکو دیکھ کر دنیا کا بڑے سے بڑا ماہر حیران رہ جاتا ہے۔ نہ جانے کتنی محبوبائیں اپنے عاشقوں سے ویسی ہی یادگار قائم کرنے کے بدلہ مر جانے کی آرزو کرتی ہیں۔ اس عمارت کی موجودگی میں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں نے فن معماری کے نئے اصول و زاویہ قائم نہیں کئے تھے یہ ایک شہنشاہ کا غریبوں کی محبت کا مذاق اڑانے کا عمل نہ تھا بلکہ مسلم معماروں کی خلاقانہ لیاقت کا سکہ بٹھانے اور اقوام عالم میں انکی تمدنی برتری قائم رکھنے کے مستقل عمل کا اظہار تھا۔ تاج کا معمار اگر یورپ میں ہوا ہوتا تو کوئی بھی طبقہ وارانہ نفرت کا شکار ہو کر غریبوں کی محبت کے مذاق اڑانے کا طعنہ نہ دیتا بلکہ ریاضی کے ماہر، صاحب نظر شاعر، مصوّری کے سرتاج، انتھراپالوجی اور علم حیاتیات کے ماہر اور عظیم انجنیئر تاج کے خالق کے قدموں میں اپنا دم توڑ چکے ہوتے۔
لیکن مسلمانوں کی شان بے نیازی دیکھیں کہ انھوں نے اسے اپنے لیے سرمایہ افتخار نہ سمجھا اسلئے کہ انکی زندگی کا معیار ہی کچھ اور ہے اور وہ ہے مومنانہ زندگی۔
تاریخ مسخ کرنے کا فن بعض ہندو کہانی کاروں نے انگریزوں سے سیکھا ہے۔ جن کے سردار اس دور میں پی-این-اوک تاریخ میں جوک کرتے رہتے ہیں (یعنی مذاق) انگریز نے اٹلی کے معماروں کو اسکا خالق بتایا۔ پی-این-اوک نے ہندو راجہ کا محل ایک کا دماغ وسکی میں مست دوسرے کا گانجے میں ست، لکھنو کا امامباڑہ جس میں وائرلس سسٹم فٹ ہے آج بھی یورپ کے انجنیئروں کی حیرت کا موجب بنا ہوا ہے۔
ایک فلسفی کا قول ہے کہ اگر کسی قوم کے اخلاق کی زندہ تصویر دیکھنا ہے تو اس کے فن تعمیر کو دیکھو۔ اس قول کی روشنی میں اگر ہم دیکھیں تو شاہجہاں کے زمانہ کے مسلمانوں کی خصوصیات ابھر کر سامنے آجائیں گی۔ اس دور کے علم کا پتہ چل جائے گا۔ امن و فارغ البالی کی نشاندھی ہو جائے گی مسلمانوں کی محنت و جفا کشی کا اندازہ ہو جائے گا ان کے نظام کی مضبوطی، حسن نظر، خیال کی بلندی اور پاکیزگی و عظمت و جاہ و جلال، فن و کمال،

عزت نفس اور قوت خودداری جیسے جوہر جس کے نتیجہ میں تاج محل جیسی لافانی عمارت کے بنانے کا خیال پیدا ہوا سامنے آجائیں گے۔ اور یہ سلسلہ لکھنو میں آخری مغل عہد میں آصف الدّولہ کے زمانہ میں امامباڑہ کی شکل میں موجود رہا۔ اور تاریخ نے محفوظ کرلیا کہ مسلمان علم دین ودنیا دونوں کے سرتاج رہے ہیں۔

اسلام ایک کھلا میدان ہے۔ اس میدان کا مرد میدان وہی بن سکتا ہے جو اسلام اور امت کا کام کل کے وعدہ پر کرے۔ خدا اور رسول ﷺ کے احکلات پر دوڑے اور امت کا بیڑا پار لگانے کیلئے بے غرض و بے مزدوری محنت کرے۔ بندہ بن کر رہے۔ بندگی میں ہی بندہ بنکر رہنے میں بزرگی ہے۔ روح کو ترقی دیکر اوتار یا خدا میں سما جانے یا اسکی شکل میں زمین پر آنے میں نہیں۔ مسلمانوں کا نبی خاتم النبیین، ختم المرسلین اور رحمتہ اللعالمین ہے اس کے بعد اب کسی اور انسان کے لیے بچا بھی کیا؟

صنعت وحرفت کی موجودگی قوم کی اصل طاقت و زندگی ہے۔ اس زندگی کے جوہر کو مسلمانوں نے ملک کے لیے استعمال کیا تھا۔ یہ زندگی آج بھی موجود ہے۔ اگرچہ جسم بیمار ہوچکا ہے۔ مگر دوا قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے جو زندہ رہنے کی علامت ہے۔ مریں گے اسوقت جب محنت چھوڑ دیں گے۔ دستکاریوں سے ہاتھ کھینچ لیں گے۔ الفقر فخری کے دائرہ سے نکل کر سرمایہ پرستی پر ناز کرنے لگیں گے۔

مسلمان آج بھی اپنی کوشش و محنت سے قوم کو بڑا بنا سکتے ہیں۔ اسلئے کہ ان میں مذہبی حس اور جوش کی کمی نہیں۔ صنعت وحرفت و بہادری و حوصلہ مندی سبھی کچھ تو موجود ہے۔ غریبی اور فاقہ مستی میں بھی مالی قربانی کے جذبہ کی کمی نہیں۔ جانی قربانیوں کا بازار بھی سرد نہیں پڑا۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد عام مسلمانوں کی بغیر کسی قیادت کے سرفروشی بے مثال ہے۔ کمی ہے تو اوپری طبقہ میں کسی ایک کے آگے گردنیں جھکا کر اللہ کے حکم کے مطابق اطاعت کی۔ اصلاح نفس کی۔ جس کے بغیر قوم وہاں پہونچ گئی ہے، دوسروں کے سامنے سرنگوں ہوگئی۔ جس کی داستان دردانگیز اور عبرت خیز آیندہ صفحات میں آرہی ہے۔ جہاں ہم پر کوئی بھروسہ نہیں کرتا۔ سب ہم ہی سے اپنے کو بدل دینے کو کہتے

رہتے ہیں۔ غیروں کو تو چھوڑئے اپنے ہی مذہب کو اب شخصی احوال بتا کر اسے نجی اور ذاتی زندگی تک محدود کردینا چاہتے ہیں۔ یعنی اپنی نجی زندگی کے چند لمحات میں تو باری تعالیٰ کو مانا جائے باقی زندگی کے معاملات پر غیر اللہ کا حکم چلایا جائے اور مسلمانوں نے اپنی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھال لیا ہے دستور ہند کو قبول کرلیا، اسکی عدالتوں کو مان لیا۔ دیوانی اور فوجداری کے قوانین قبول کرلیے، سیاست میں ہر پارٹی کے ہندو کو اپنا لیڈر اور رہنما تسلیم کرلیا۔ بس مسجد میں نماز اور قاضی جی سے نکاح پڑھوانے اور ختنہ کروانے کے گناہ گار ہیں اب اگر یہ بھی ناگوار ہے تو گردنیں حاضر ہیں انھیں اتروالیں ورنہ ہندو لیڈر اپنے کو آئین کے سانچے میں فٹ کریں مسلمان تو کرچکے اور اگر یہ نہیں تو:

وقت لکھے گا کہانی اک نئے مضمون کی

سیکولرازم اور ہندستان

میں مسلمان ہوں، اسلام کے شاندار ماضی اور پر جلال تاریخ اسلام نے مجھے حوصلہ عطا کیا ہے۔ ایسا حوصلہ جو وقت کے نمرود و فرعون ابوجہل و دیگر ظالم طاقتوں کے سامنے پست نہیں ہو سکتا۔ میں نے زندگی کے حادثوں اور انکی گہرائیوں میں ڈوب کر حقایق کے موتی نکالے ہیں۔ میرے ذہن و دماغ پر جو تاثرات ابھرے ہیں انھیں حقایق کی روشنی میں عوام کے سامنے، اقوام عالم اور سبھی انصاف پسندوں کے سامنے اور اپنی ملت کے فرمانرواؤں یعنی عالم اسلام کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

ایک مسلمان جسے سچائی کا علم ہو جائے، اس کے لیے یہ بات کسی طرح مناسب نہیں کہ وہ موت کے خوف سے سچائی کو چھپالے جائے۔ اسلئے کہ حقایق سے منہ موڑ لینا ہی ابوالحکم کو ابوجہل بنا دیتا ہے۔ ایک مومن و مسلم اور کافر میں اتنا ہی تو فاصلہ ہے۔ اظہار حق سے انکار اور سچائی سے چشم پوشی ہی تو مسلم و کافر کے درمیان حد فاصل ہے۔

ہندستان ایک آزاد ملک ہے۔ یہ بات ٹھیک اور درست ہے، مگر کس کے لیے؟ اکثریت کے افراد کے لیے!!!

پر فریب جمہوریت اور سیکولرازم کے خاکہ بردار کہیں گے کہ یہ جھوٹ ہے۔ مسلمانوں کو ہندستان میں بڑی بڑی جگہیں حاصل ہیں۔

بڑی بڑی جگہوں کا ملنا ہی اگر آزادی ہے تو انگریزی عہد اس سے بھی زیادہ تعریف کا مستحق اور آزادی کی سچی تعریف پر اترنے والا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ پھر ہندستان کے لیڈر مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ عہد کو گالیاں کیوں دیتے ہیں خاص طور پر اورنگ زیب عالمگیر کو جس نے کبھی کسی مسلمان کو اپنی فوجوں کا سپہ سالار نہیں بنایا ہمیشہ جے سنگھ اور جسونت سنگھ اس جلیل القدر عہدہ پر فایز رہے۔

آزادی کی یہ تعریف ادھوری ہے۔ ہندستان مختلف نظریات اور خیالات کا گہوارہ ہے۔ لیکن یہ نظریات و خیالات ایک مخصوص تہذیبی طرز فکر کے محتاج ہیں۔ اور یہ نظریات و خیالات اس مخصوص طرز فکر کے اندر ہی پرورش پا سکتے ہیں اور ہندو اکثریت کے کسی گروپ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اور یہ طرز فکر "دیوی، دیوتاؤں" کا تصور ہے ـــ اس بنیادی تصور کے تحت تو کسی بھی فرقہ کو برداشت کیا جا سکتا ہے اور اس فرقہ کی نوعیت کے اعتبار سے اسے سانس لینے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ اس تصور کے باہر رہنے والے کسی فرقہ کے لیے ہندستان کی زمین پر اگر وہ حکمراں نہیں ہے اور کمزور ہے اور دفاعی طاقت نہیں رکھتا ـــ زندگی گزارنا بہت مشکل مسئلہ ہے۔

آج کا ہندستان اپنی رواداری اور فراخ دلی کا اقوام عالم میں بڑا چرچا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جو ہمارے یہاں آیا ہم نے اس کا استقبال کیا ایک جھوٹی بات ہے۔ ہر آنے والا اس زمین پر فاتح بنکر آیا تھا اسکی مرضی کے سامنے یہاں کے لوگوں کو جھکنا پڑا تھا۔ اسلئے کہ اس ملک کے مزاج میں طاقت کی پرستش رچ بس گئی ہے، وہ پہاڑوں کی طاقت ہو، جانوروں کی ہو یا کسی انسانی گروہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ اقوام عالم میں "بہترین محکوم" ہندو رہے ہیں اور آج جب حکومت ملی تو "بدترین حاکم" ثابت ہو رہے ہیں۔

یہاں جب بودھ مذہب کا غلبہ ہو گیا تو برہمنت اور ہندو مذہب ختم ہو گیا۔ ہندستان کے بڑے بڑے ہندو حکمرانوں نے اس کے سامنے گردنیں جھکادیں اور پورے ملک کا سرکاری مذہب بودھ مذہب قرار دیدیا گیا۔ لیکن آٹھویں صدی عیسوی کے آخر اور نویں صدی عیسوی کے شروع میں شنکر آچاریہ نے اپنی کاوشوں سے برہمن ازم کا احیاء کیا تو بدھ مذہب کو ملک کے باہر نکالدیا گیا اور ہندستان کے چاروں کونوں پر نگراں چوکیاں قائم کردی گئیں تاکہ دوبارہ بودھ مذہب کے لوگ ملک میں داخل ہو کر اپنے اثرات قائم نہ کرلیں۔ یہی نگراں چوکیاں "چار دھام" کے نام سے ہندؤں کے بڑے مذہبی مراکز قرار دیئے گئے جو آجتک قائم ہیں۔

ہندستان کی نام نہاد سیکولر حکومت کا ایک نشان بھی سیکولر نہیں ہے۔ دعوت امن

وعدم تشدد کے پردے میں ہندستانی حکومت خوفناک اور بھوکے شیروں کو چھپائے ہوئے ہے۔ جس کی مثال بھارت کا سرکاری نشان "اشوک چکر اور چار شیر" ہیں۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ ان شیروں کی دہاڑ سے چاروں سمتوں میں خوف و ہراس پیدا کیا جائے اور اگر کوئی اس کے بعد بھی مرعوب نہ ہو تو ظلم و جبر کے اس چکر میں ڈالکر اسے پیس دیا جائے..... کوئی معمولی سمجھ کا آدمی بھی کیا شیروں اور چکر کو امن کا نشان کہہ سکتا ہے؟

اشوک ہندستان کی تاریخ میں خونخوار اور فاتح گذرا ہے۔ اس نے اپنی عظیم طاقت اور قتل و غارت گری کے بل پر برصغیر کو اپنے جھنڈے کے نیچے جھکانے کی کوشش کی اور لاکھوں غیر آریائی اور دراوڑوں کو قتل کر کے آبادیوں کو ویرانیوں میں بدل دیا، خون کی ندیاں بہنے لگیں اور ساری طاقتوں کو زیر کرلیا تو وقت کی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر بودھ مذہب قبول کرلیا۔ بودھ مذہب قبول کرنے کے بعد بھی خوفناک اور خطرناک درندوں کو اپنی عظمت کا نشان قرار دیا۔ ہندستان کی حکومت نے آزادی کے بعد اشوک کے اسی نشان کو اپنا لیا اور جو گروہ اس خانہ میں فٹ نہ ہو سکا۔ اسے پولیس اور پی۔اے۔سی کے درندوں کے ذریعہ اشوک کے تاریخی "چکر" میں ڈالکر پیس دیا گیا۔ یہ کھیل پچھلے چھیالیس برسوں سے جاری ہے اور ہندستان کے مسلمان تختہ مشق بنے ہوئے ہیں۔

تاریخ کا سبق

آزاد ہندستان کے ہندوؤں کو تاریخ سے سبق سیکھنا چاہئے۔ اسلئے کہ ہندستان، اس ملک میں صدیوں سے بسنے والوں کا ملک ہے صرف ہندوؤں کا نہیں ہے۔ سنہ ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے سندھ کے راجہ داہر پر مسلمان عورتوں کی زندگی کی حفاظت کے لیے ہی حملہ کیا تھا۔ تاریخ اپنے کو دہرا سکتی ہے۔ جغرافیائی حالات مسلمانوں کے موافق ہیں۔ اسلئے کہ ایشیا اور افریقہ کے سارے ساحلوں پر انکا قبضہ ہے۔ یہ صحیح ہے، کہ سردست وہ سیاسی الجھنوں میں پھنسے ہوئے ہیں لیکن قدرتی وسائل کے اعتبار سے جلد ہی وہ دنیا کی عظیم

طاقت بن جائیں گے۔ ہندستان اور دنیا کی دوسری طاقتوں کا مسلمانوں کے خلاف دائمی نفرت کا عمل مسلم ممالک کو نا صرف مضبوط بلکہ متحد کرکے ایک مرکز پر لاجمع کرے گا۔ مسلم ممالک کا کسی ایک مرکز پر جمع ہو جانا اور ایک عظیم الشان طاقت کی شکل میں ابھر کر دنیا کے نقشہ پر آنا اتنا ہیبت ناک نہیں ہے۔ جتنا کہ ایسی حالت میں "ممالک متحدہ اسلامیہ" کے کسی پڑوسی ملک میں مسلمانوں کی قتل و غارت گری!

میں اپنے علم اور تاریخ اسلام کی روشنی میں یہ بات یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر کسی مسلم ملک کو عسکری اعتبار سے روس، چین یا امریکہ والی حیثیت حاصل ہو جائے تو دنیا کے کسی حصہ میں مسلمانوں پر ظلم نہیں ہوسکتا، جیسا کہ چھیالیس برسوں سے ہندستان میں جاری و ساری ہے اور اگر ہوگا تو وہ ملک برباد کردیا جائے گا۔

ہندستان کے ناعاقبت اندیش لیڈروں کو اپنے پڑوس کے بدلتے ہوئے حالات پر نظر رکھنی چاہئے۔ دنیا کے نقشہ پر ابھرتی ہوئی اسلامی طاقتوں سے دوستانہ تعلقات کی ایک ہی صورت ہے ہندستانی مسلمانوں کی عزت و آبرو اور جان و مال کا تحفظ کیا جائے۔ ورنہ مستقبل میں کیا ہوگا:

ہم تو کیا تاریخ انسانی بتا سکتی ہیں
کھا چکی ہے کتنے قاہر تاجداروں کو زمیں

آزادی میں قوموں کے ذہن کھلتے ہیں۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آزادی کے بعد ایسا نہیں ہوا بلکہ وسیع النظری کی جگہ تنگ نظری وسیع القلبی کی جگہ تنگ دلی نے غالب آکر جنت نظیر ہندستان کو جہنم بنا دیا!

فرقہ وارانہ سرمایہ داری اور سامراجیت

ہندستان میں ہندوؤں نے دو عظیم لیڈر پیدا کئے۔ گاندھی جی اور پنڈت جواہرلال نہرو۔
گاندھی جی نے ہندو قوم کو بیدار کر کے اسے عقل سکھانے کا کام کیا۔ ہندوؤں کو بتایا کہ
موجودہ عہد میں اچھوتوں کو الگ رکھ کر آگے بڑھنا بہت دشوار ہو جائے گا اور ہندو سماج
کا سیاسی اقتدار خطرے میں پڑ جائے گا۔ ہندوؤں کو سیاسی اقتدار کی خاطر اچھوتوں کو سماجی
مراعات دینا ہوں گی۔ اچھوتوں کو اس احساس کے ساتھ کہ وہ اچھوت ہیں ساتھ لیکر چلنا ہوگا۔
پرانی بوتلوں میں نئی شراب بھرنا ہوگا۔ اسی جذبہ کے تحت ملازمتوں میں ان کا کوٹہ مقرر کیا
گیا۔ لوکل باڈیز سے لیکر اسمبلی اور پارلیمنٹ تک انکی سیٹوں کا ریزرویشن ہوا... مگر اس
شرط کے ساتھ کہ وہ "ہندو" رہیں گے اگر بودھ، عیسائی یا مسلمان ہوگئے تو یہ مراعات
نہیں ملیں گی۔ اسطرح ایک کچلی ہوئی قوم ہریجن اور اچھوت کے نام پر تعلیمی وظیفے،
سرکاری نوکریاں اور سیاسی عہدے حاصل کر لیتی ہے لیکن سماجی برابری سے آج بھی
محروم ہے...... گاندھی جی نے اونچی ذات کے ہندوؤں کو اتنی سمجھ دے دی کہ وہ پیر کی جوتی
کو ہاتھ میں لیکر اس کو مسلمانوں کے خلاف صف آرا کر دیں۔ اسطرح گاندھی جی نے
اچھوتوں کو ہندو سماج اور اسکی نفرتوں سے باندھ کر ہندو قوم کو طاقتور بنانے کا عظیم
کارنامہ انجام دیا۔ اور ایسا کرنے کا وہ حق رکھتے تھے اپنے گروہ اور فرقہ کی مضبوطی کے لیے
کام کرنا اچھی بات ہے۔

لیکن گاندھی جی کی یہ کوشش اور کام ادھورا رہ جاتا اگر ہندؤں کو پنڈت نہرو جیسا
جادوگر نہ مل جاتا۔ جواہرلال نہرو ایک ایسا عظیم ہندو لیڈر تھا جس نے اپنے سورہ سال نو ماہ
کے دور حکمرانی کو پورے ملک میں مسلمانوں کی طاقت کو توڑنے اور احساس برتری فنا
کرنے میں اسطرح صرف کیا کہ مسلمان اپنے قاتل ہی کو محافظ بھی خیال کرتا رہا۔ پنڈت نہرو

کا ہندستان مسلمانوں کے خلاف نفرت اور فسادات کی آگ میں چلتا رہا۔ انھوں نے فرقہ واریت کو ہوشیار سیاست داں کی طرح اپنے اقتدار کے لیے قائم رکھنے میں کوئی کمی آنے نہیں دی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ پنڈت نہرو کا عہد ہندستان کی تاریخ کا بدترین عہد ہے۔ جس میں ساری تعمیری طاقتوں کو مسلمانوں کے خلاف قتل و غارت گری، انکی تباہی و بربادی اور ہندستانی سماج میں انکو ایک پست، بزدل اور گری ہوئی قوم بنانے پر لگا دیا گیا۔ نہرو سرکار اس میں کہاں تک کامیاب ہوئی یہ آنے والی تاریخ کا ایک دلچسپ باب ہوگا۔ یہی عہد ہے جس میں ہندستانی مسلمانوں کے خلاف شدید ترین مصائب کی روایت قائم کی گئی بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ معصوم بچوں کی جان لینا اور عورتوں کی بے آبروئی کرنا ہندستانی سیاست کا معمول بن گیا۔ مسلمانوں کے بچوں کو قتل کرکے انکی ماؤں کو اپنے ہی جگر کے ٹکڑوں کا خون پینے پر مجبور کیا گیا اور اس کے پیچھے ایک ہی جذبہ کارفرما تھا کہ مسلمانوں کے سینوں میں یہ احساس پیدا کر دیا جائے کہ "قوت ایمانی اور اللہ کی نصرت" فقط واہمہ ہے اصل طاقت و قوت کثرت میں ہے۔ لیکن ان فسادات نے مسلمانوں کے اس جذبہ کو اور شدید کر دیا۔ اسلئے کہ بڑے بڑے بلوائیوں کے جتھے مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں پر غلبہ حاصل نہیں کرسکے، جب تک ان کی مدد کو سرکار کی تنخواہ دار، نیم فوجی تنظیم پولیس اور پی۔ اے۔ سی نہیں آ گئی۔ ہندستان کے مزاج میں اساطیری قصے اور کہانیاں پائی جاتی ہیں۔ جو کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح اس کے سیاسی نعرے بظاہر اچھے لگتے ہیں لیکن عمل میں عدم تشدد، نہ رواداری، نہ سیکولرازم۔

تقسیم ہند اور مسلمان

ہندستان کی تقسیم سے مسلم مسائل کو جوڑا نہیں جاسکتا۔ مسلم مسائل سے عدم دلچسپی کارد عمل تقسیم کہی جاسکتی ہے۔جسکا مطالعہ آپ آگے کریں گے۔ہندستان نے تقسیم کے بعد ۲۶/ جنوری سنہ ۱۹۵۰ کواپنا دستور نافذ کردیا۔ ۱۵/ اگست سنہ ۱۹۴۷ سے ۲۵/ جنوری سنہ ۱۹۵۰ تک جو کچھ ہوا۔ قابل معافی ہے۔ لیکن دستور کے نفاذ کے بعد جس میں ہندستان کے ہر شہری کی عزت و آبرو، جان و مال کے تحفظ اور ترقی کے یکساں مواقع دیئے جانے کی بات کہی گئی تھی اس کے بعد بھی، ظلم، شورش، تباہی، بے آبروئی، فسادات، غارت گری غرضیکہ ہر ناکردنی کو روار کھ کر ہر میدان سے مسلمان کو پیچھے ڈھکیلنے کی کاروائی جاری رہی اور ہنوز ہے۔

ملک میں دوسرے بہت سے علاقوں نے اپنے خلاف ہونے والے مظالم کو آناً فاناً حل کرالیا۔ ہندی زبان کی سامراجی یلغار کے خلاف جنوبی ہند کی ریاستیں کھڑی ہو گئیں اور انھوں نے اپنے علاقوں سے اسے بیدخل کردیا، لیکن کسی صوبے کے عوام اور سیاسی پارٹی نے شمالی ہندستان کی ریاستوں میں مسلمانوں کی زبان اردو کاٹے جانے پر انکی عملی مدد نہیں کی اور اردو کو پاکستان کی زبان اور اس کی بحالی کے مطالبہ میں ایک نیا پاکستان انھیں دکھائی دینے لگا۔ جبکہ تامل ناڈو کے وزیراعلیٰ رام چندرن نے ایک اعلان کے ذریعہ ہندی کے خلاف ہلاک ہونے والے اشخاص کے ورثاء کو دس ہزار روپیہ کی رقم دینے کا اعلان کیا ہے۔ ہندو قوم کی تنگ دلی کھیل کے میدان تک میں اپنا رنگ دکھاتی ہے اور اگر پاکستان کسی میچ میں جیت جائے یا ہار جائے تو ہر حال میں مسلمانوں کے گھروں کو نذر آتش کردیا جاتا ہے پہلی حالت میں وہ مسلمانوں کے چہروں پر مسرت کی لکیریں ڈھونڈھ لیتے اور دوسری حالت میں مسلمانوں کے مردہ چہروں سے انھیں اندازہ ہوتا ہے کہ

یہ پاکستان کی ہار سے غمگین ہیں۔ ہندستانی عوام کے مزاج کے خلاف ایک جمہوری اور سیکولر دستور سیاسی مصلحتوں کی بناپر لاگو کرکے بطور پالیسی ہندستان کے لیڈروں نے عالمی برادری کو فریب میں مبتلا کرنے کا کام کیا ہے۔

منصوبہ کے حقیقی خدوخال

ہندستانی مسلمانوں کے قتل و بربادی کا اگر کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہیں ہے جیسا کہ سبھی لیڈر اسکی صفائی دیتے ہیں۔ تو بھی واقعات جس شکل میں رونما ہوئے ہیں، فسادات جس وبائی بیماری کی طرح پھیل رہے ہیں ان کو روکنے کے موثر اقدامات کہاں کئے گئے؟ اور جب مرکزی سرکار اور صوبائی حکومتیں دونوں ان پر قابو پانے میں ناکام ہو گئیں تو اس سے یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ حکومتوں کی مرضی اس امر میں شامل ہے..... دوسری طرف ملک کی سیاسی پارٹیوں نے اس انسانی مسئلے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور اس نفرت انگیز رجحان کے خلاف عوامی ذہن کو بیدار کرنے کا کام نہیں کیا۔ بار بار کے تجربات اور مسلمانوں کے خلاف ہونے والے فسادات کو روکنے میں ناکامی کے بعد بھی مسلمانوں کو ان کے دفاع کے لیے اسلحہ نہیں دیئے گئے۔ سرکاری انتظامیہ کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی گئی، جب حکومت اسطرح کے واقعات پر قابو نہ پاسکے، اس فتنہ و فساد کے خلاف کوئی موثر کاروائی نہ کرسکے یکے بادیگرے ملک کے ہر حصہ میں ایک ہی جیسے واقعات پیش آتے رہیں تو اس سے نتیجہ یہی نکالا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ان سیاسی منصوبوں کا مقصد ان کو میٹ دینے کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

حکومت نہیں چاہتی کہ مسلمانوں کے خلاف فسادات ہوں، اس کے اعلیٰ حکام چاہتے ہیں کہ فسادات ہوں؟ اعلیٰ حکام نہیں چاہتے، پولیس چاہتی ہے؟ پولیس نہیں چاہتی سیاسی پارٹیاں چاہتی ہیں؟ وہ بھی نہیں چاہتیں، تو پھر چاہتا کون ہے؟ اور کیوں یہ سلسلہ بند نہیں ہوتا؟

بات پھر وہیں پہونچتی ہے چونکہ حکومت کے پاس طاقت ہے اور وہ اپنے شہریوں

سے ٹیکس اس لیے وصول کرتی ہے کہ اس کے بدلہ میں انکی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے گی مگر ہندستان کی ہر حکومت ایسا کرنے میں ناکام رہی ہے، اور اگر ناکامی کالفظ مزاج حکمرانی پر بار ہو تو پھر اسکی تغافل کیشیاں کہہ لیجئے۔

سیاسی پارٹیاں اور مسلمان

دنیا کے تمام مسلمان مزاجی ساخت کی بنا پر ایک ہیں۔ موجودہ دنیا نے ایک ایسے مسلم معاشرہ کو دیکھا جو کسی وجہ سے اپنا سب کچھ کھو چکا ہے۔ غلط قیادت اور تقدیر کے غلط مفہوم نے مسلمانوں کے پیروں تلے سے ٹاٹ کھینچ لیا ہے۔ حالانکہ قرآن نے کہا ہے......
"وہ قومیں جو بچوں کی طرح دعائیں کرتیں اور عورتوں کی طرح نسوے بہاتی ہیں ہم انکی تقدیر نہیں بدلتے۔"

دوسری جگہ پر کہا.... "اے محمدؐ! تمھارے دشمنوں کو ہلاک کردینا ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ تم اور وہ ٹکراو تاکہ ہم دیکھیں تم میں زیادہ ثابت قدم کون ہے۔"

لیکن غلط قیادت نے ہمارے اعضاء شل کرکے حالات کے سپرد کرنے کی تلقین کی۔ بھلا سوچنے کی بات ہے کہ ایک ایسی قوم جو شاندار ماضی رکھتی ہو، جس نے صدیوں ایشیا، افریقہ، یورپ اور معلوم دنیا پر شاندار طریقہ پر عدل و مساوات کے ساتھ حکمرانی کی ہو وقت اور حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہندستان کی مکر وریا، جھوٹ اور فریب سے پر سیاسی پارٹیوں کے طوفانی سمندر میں اپنا سب کچھ بھول کر کیسے گم ہو جائے، جن کے پاس نہ کوئی عادلانہ پروگرام ہے اور نہ ہی ان جیسا پر جلال و پر ہیبت ماضی، کسی بھی سیاسی پارٹی کی فکر و نظر کا غلام ہندستانی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ ماضی کی بات رجا گیردارانہ عہد کی دین ہے، دنیا کے عوام کو مزدور اور غیر مزدور میں تقسیم کرنے والے، "مومن و کافر" کی تقسیم پر بے چین کیوں ہو جاتے ہیں۔ اگر سنجیدگی سے ماضی کے مفہوم پر غور کیا جائے تو چودہ سو برس کی بات بھی ماضی کی بات ہے، سو برس کی بات بھی اور کل کی بات بھی ماضی

کی کہانی ہے۔

ہندستان کی سیاست ووٹ کی سیاست ہے، اصول وضوابط کی نہیں، ہندستانی سیاست کی یہی سب سے بڑی بدنصیبی ہے اور اسی کے نتیجہ میں ساری سیاسی پارٹیاں ہندو معاشرہ کی روایتی تنگ نظری سے بندھی ہوئی ہیں۔ سیاسی پارٹیوں میں کمیونسٹ پارٹیوں نے ہندستان کے سیاسی جھگڑوں کی جڑ مذہب کو جانا اور اپنے ترکش کے سارے تیر آسمان پر پھینک مارے۔ لیکن روایتی تنگ دلی کے دائرہ نے مذہب کے زمرہ میں صرف اسلام کو رکھا۔ سماجی عدم مساوات اور معاشی ناانصافیوں کے خلاف ملک کے سبھی طبقوں کو متحد کرنے کے بجائے یہ ذات اِلہٰ میں الجھ کر رہ گئیں اور مزدور و کارخانہ دار میں انسانوں کو بانٹنے کا کام کرتی رہیں۔

زندہ جماعتیں اپنے تحفظ و بقا کے لیے متحدہ اور مشترکہ مسائل پر یکجا تو ہو سکتی ہیں لیکن کسی دوسری جماعت میں اپنے کو ضم نہیں کر سکتیں۔ اسلام مذہب کے ساتھ ہی ایک سیاسی تحریک بھی ہے، لیکن ملک کی سیاسی پارٹیوں نے اسے سیاسی تحریک ماننے سے انکار کرکے اپنے مذہب کی طرح عبد و معبود کے درمیان صرف ایک رشتہ ماننے پر رضامندی دی اور فکر اسلامی کو سیاست سے دور رکھنے کی تلقین کی۔ آج مسلم معاشرہ پست ضرور ہے۔ لیکن گذر چکی ہے یہ فصل بہر ہم پر بھی، ہم نے زندگی کے اتنے اچھے دن دیکھے ہیں جو شاید کم ہی اقوام کے حصہ میں آئے ہوں گے۔

اسلئے ہندستان کی سیاسی پارٹیوں کو سیاسی تنگ نظری سے نکل کر اور سیاسی کج فہمیوں سے الگ ہو کر ایک ایسا متحدہ پروگرام بنانے کی ضرورت ہے کہ جس میں مسلمان اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے، بحیثیت ایک سیاسی گروپ کے شامل ہو کر سماجی ناانصافیوں کے خلاف کام کر سکیں اور اپنی ان خدمات جلیلہ کے بدلے شریک اقتدار بھی رہیں۔

موجودہ ہندستان میں مسلمان محفوظ نہیں ہے۔ پولیس کا افسر ہو یا اسمبلی و پارلیمنٹ کا ممبر، وزیر ہو یا اسکاڈرائیور یا خود صدر جمہوریہ مسلمان ہو جس لمحہ وہ سوچتا ہے کہ میں مسلمان ہوں اسکا احساس تحفظ ہوا میں معلق دکھائی دیتا ہے۔ اس احساس کی وجہ سرکار کی

سوچی سمجھی پالیسی اور سیاسی پارٹیوں کی بے رُخی اور مسلمانوں کے مسائل سے عدم دلچسپی ہے۔ غریبی ہٹاؤ اور سوشلزم کے نعروں کے ذریعہ ہندو کاروباری طبقہ، ساہوکاروں اور سودی نظام سے وابستہ لوگوں کو ہی فائدہ پہونچا ہے۔ سرکار، ملک کی سیاسی پارٹیاں، عام سوجھ بوجھ رکھنے والے ہندو بتائیں کہ مسلمانوں کو کس خانہ میں جگہ دیں گے، قتل، جلاوطنی اچھوتوں یا ہندستان کے قدیم شودروں والی زندگی، ہندستان کے نام نہاد سیکولر ڈھانچہ نے مسلمانوں کیلئے کون سی جگہ طے کی ہے؟

ہندستان کے مسلم رہنما

میں رہنمایان ملت کے اخلاص پر شک نہیں کرتا لیکن ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کے حل کاان کے پاس کوئی نہ تو سیاسی پروگرام ہے نہ دینی اسلئے کہ جب یہ خود متحد نہیں ہوسکتے تو مسلم عوام کی رہنمائی کیا کریں گے؟ یہ فسادات کے بعد ملک کے سیاسی لیڈروں کی طرح فساد زدہ علاقوں کے سرکاری تحفظات کے سایہ میں دورہ کرکے رپورٹیں شایع کراتے اور مسلم عوام کو ذلّت ورسوائی پر راضی رہنے کا مشورہ دید یتے ہیں۔ کبھی انھوں نے عالم اسلام کو ہندستان کے برادران اسلام پر ہونے والے مظالم کی بات نہیں بتائی۔ یہ قوم کی غیرت وعزت کو سرکاری جج اور راجیہ سبھا کی ممبری کے عوض ہمیشہ بیچتے رہتے ہیں اور عالم اسلام میں اسکو ہندستان کا اندرونی مسئلہ بتاتے ہیں۔ اور ہندستان کے اندر اپنے مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ اپنے کو بدلو، یہ دستور ہند اور گاندھی جی کے اقوال سے اپنی بات شروع کرکے ہمیشہ سرکاری عتاب سے اپنے کو بچالے جاتے ہیں۔ قوم وملت کے مسائل جس طرح الجھے ہوئے ہیں انکو حل کرنے کے لیے جس حوصلہ، جرأت اور ایمانی طاقت کی ضرورت ہے اس سے یہ کوسوں دور ہیں...... ہندستان کے مسلم عوام جانتے ہیں کہ یہ گروہ عالم اسلام میں گھوم کر اپنے کو ہندستانی مسلمانوں کا رہنما بتاتا پھرتا ہے، تو عالم اسلام کے روبرو ہندستان کے عام مسلمان ان نام نہاد و خود ساختہ رہنماوں سے پوچھتے ہیں کہ چھیالیس برسوں میں لگ بھگ مسلمانوں کے خلاف بیس ہزار فسادات ہوئے جن میں دو لاکھ مسلمان قتل کر دیئے گئے کروڑوں کی املاک برباد کردی گئی، مسلمانوں کے خلاف اٹھنے والی اس قیامت صغریٰ کے وقت جناب کہاں تھے؟

آسام میں لاکھوں مسلمان اجاڑ دیا گیا اور ہزاروں کا قتل ہوا اسوقت سرکار عالی کہاں تھے؟

عہد انگریزی میں اکابرین ملّت اور علمائے کرام کو پھانسی کے پھندے اور جلاوطنی ملی تھی آپکو حکومت کے درباروں میں باریابی کیوں حاصل ہے؟

اور رہنمایان ملت کے اس طرز عمل کے نتیجہ میں مسلمان غلاموں سے بدتر زندگی گزارنے کے لیے مجبور کردیا گیا ہے، اقتدار سے محرومی قوموں کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی، سورج ہمیشہ ایک جگہ قائم نہیں رہ سکتا۔ زوال و عروج فطرت کائینات ہے، لیکن اصل چیز زوال کے بعد عروج کی تڑپ ہوا کرتی ہے۔ اصل غلامی وہاں سے شروع ہوتی ہے جب قوموں کے ذہن اور فکر غلام ہوجاتے ہیں۔

بزرگوں کے اس طرز عمل نے ملی زندگی کا مقصد فنا کرکے رکھدیا ہے، انکی اجتماعی حیثیت کو میٹ دیا ہے، مسلمانوں کی سیاسی وحدت کو غیر متحرک لاشہ بنا کر رکھدیا ہے۔ الگ الگ دائروں میں اپنے کو تقسیم کرکے پورے مسلم معاشرہ کو فنا کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔

انسانیت کوئی مذہب نہیں

مسلمانوں کی بقا اسلام سے ہٹ کر کہیں نہیں ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ میرا مذہب انسانیت ہے تو یہ محض فلسفہ اور شاعری ہے ہندستان میں اسکا فیشن چل پڑا ہے۔ انسانیت کو بڑھاؤ، اس سے پیار کرو، انسانیت کو پھیلاؤ لیکن یہ ہے کیا؟ کہاں یہ جنس ملتی ہے؟ کچھ پتہ نہیں۔ اگر انسانیت ہی سب کچھ ہے کے اصول کو تسلیم کرلیا جائے تو پھر دین و مذہب کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ اگر کوئی قوم سیکڑوں برس سے کسی نظریہ کو مانتی چلی آئی ہے اور وہ اسکی زندگی میں رچ بس گیا ہے تو وہ کیونکر اسکو چھوڑ کر دوسروں کی فکر و نظر کی اسیر ہوسکتی ہے؟ ہندستان کی سیاسی پارٹیاں تو چاہتی ہی ہیں کہ مسلمان صحرا نہ بنکر ذرہ بنیں تاکہ اپنی چمک دمک کے لیے آفتاب کفر کی شعاعوں کے محتاج رہیں، قطرہ بنیں، قلزم نہ بنیں تاکہ اکثریت کا سمندر انھیں اپنے میں جذب کرلے، وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان راکھ بنیں شعلہ نہ بنیں تاکہ وہ اس سے اپنی فکر و نظر کے برتنوں کو مانج کر گندی نالیوں میں بہا کر بے حقیقت بنادیں۔

ہندستان کے موجودہ ماحول میں اگر مسلمان اسلام کو چھوڑ کر انسانیت سے پیار کرنے کی بات کرتا ہے، دیر و حرم کے فرق کو میٹ کر صرف انسان بنکر رہنا چاہتا ہے تو اسکی وجہ ایک ہی ہوسکتی ہے کہ وہ احساس کمتری کاشکار ہے اور اسلام کے سانچے میں اپنے کو فٹ کرکے مخالف طاقتوں کے مقابلہ کی سکت نہیں رکھتا ہے۔ ہندستان کے علماء نے مختلف بہانوں سے ملک کے نام نہاد سیکولر نظام کو تسلیم کرلیا ہے، کہ اگر اسکا مطلب دہریت نہیں ہے تو ہم اسے قبول کرتے ہیں۔ سیکولرازم کا صاف مطلب ہے کہ سرکار کا کوئی مذہب نہیں اور سرکار تمام مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان ہونے والے جھگڑوں میں غیرجانبدار رہے گی! کیا یہ ہوسکا ہے؟ ہندستان میں اگر مسلمان کو زندہ رہنا ہے تو وہ اسلامی اقدار کی بحالی کے ساتھ ہی رہ سکتا ہے، انسانیت کے نام پر نہ تو وہ اپنی زندگی بچا سکا ہے نہ بچا سکے گا۔ لفظ انسانیت میں ایک بیچارگی اور شکست خوردگی کا احساس پایا جاتا ہے! مسلم و مومن کی شان و عظمت نہیں۔ انسانیت کے نام پر ہندستان کے سیاست دان ہم پر ترس نہیں کھائیں گے اور ہم وحدت اسلامی کے دھارے سے بھی کٹ جائیں گے اور اس نعرہ کے پیچھے مخالفوں کی یہی سازش کارفرما ہے۔ لہٰذا اس غلط نظریہ کو ترک کرکے ہندو اکثریت کے سمندر میں ہمیں ایک جزیرے کی طرح روشنی کا کام کرنا چاہئے تاکہ بھولے بھٹکے جہاز اپنی منزل پانے میں کامیاب ہوسکیں۔ اور ہم ان کے لیے روشنی کا کام کرتے رہیں۔

کتنی شرم ناک بات ہے کہ "مسجد" کے بابرکت نام کو ترک کرکے "عبادت گاہ" مسلمان لکھنے لگیں۔ جیسا کہ لکھنؤ کے مسلم مسافر خانہ میں کیا گیا ہے! یہ ذہن غیروں کو شر کی دعوت دیتا ہے اور کسی مذہب کا شرپسند کہہ سکتا ہے کہ میں بھی اپنے طریقے پر یہاں عبادت کروں گا جب یہ عبادت گاہ ہے (مسلمانوں کی عبادت کی جگہ کا "سرکاری" یا اسلامی نام تو مسجد ہے)! تو پیام انسانیت کا درس دینے والے کیا کریں گے؟

عالم اسلام اور ہندستانی مسلمان

آگ ہے اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے!
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

ہم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ دین حنیف کے پیرو ہیں۔ نمرود کی آگ کی نذر ہمکو کردیا گیا ہے۔ پورے ہندستان کی زمین ہمارے لیے جہنم بنی ہوئی ہے۔ ہم سے لڑائی ٹکری ہے۔ کلمہ لاالہ الااللہ سے جنگ ہے۔ برسوں سے ہم اس آگ میں جل رہے ہیں۔

عالم اسلام کی بھی کچھ دینی ذمہ داریاں ہیں۔ جن سے مسلم حکمراں اپنا دامن بچا نہیں سکتے۔ وہ غیروں کے علاقوں میں بھی مسلمانوں کی عزت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت کے لیے "مامور من اللہ" ہیں اور ایسا نہ کرنے پر وہ اللہ تعالیٰ کے روبرو میدان حشر میں جواب دہ ہوں گے۔ جب کروڑوں مظلوموں کی آہیں۔ بیواؤں کی سسکیاں، یتیموں کی آہ و بکا، بے سہارا اور ضعیف باپوں کی فریاد، آبروریز دوشیزاؤں کی چیخیں ان کے دامن سے لپٹ لپٹ کر، خداوند قدوس اور مالک یوم الدین کے تخت جلال سے انصاف کی طالب ہوں گی تو وہ کیا جواب دیں گے؟

آج بھی یہ سسکیاں، آہ و بکا، فریادیں، اور چیخیں پتھروں کو پانی اور پہاڑوں کے سینوں کو دہلا دینے کے لیے کافی ہیں۔۔۔ مگر آہ وہ مسلمان جنکو اللہ تعالیٰ نے، دولت اور طاقت و ثروت کا مالک بنایا ہے۔ اللہ کی عطا کی ہوئی اس دولت و طاقت کے بعد بھی ہندی مسلمانوں کے لیے کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ یا ہماری آواز ان تک نہیں پہونچ رہی ہے۔ اسی آواز کو پہونچانے کی یہ ایک کوشش ہے۔

کروڑوں ڈالر کی رقم ممالک اسلامیہ ہندستان کی ترقی اور پروجکٹوں کے لیے دے

رہے ہیں اور مسلمانوں کی ہی دولت اور وسائل استعمال کر کے ملک کا فرقہ وارانہ نظام سرمایہ داری طاقت و قوت حاصل کر کے ہندستان کے اندر حامیان اسلام کو ذلت و رسوائی، اور بے روزگاری کی دلدل میں ڈھکیلتا چلا جا رہا ہے۔ ممالک اسلامیہ کی اس دولت امداد اور اعانت کے سہارے ہندستان کے کروڑوں مسلمان ذلت و رسوائی کی زندگی کی طرف لے جائے جا رہے ہیں اور اس یقینی صورت حال کے علم کے بعد بھی کیا آپ کی روح کو حقیقی مسرت حاصل ہو سکتی ہے؟

اگر ہندستان کی زمین پر ہماری قوت برداشت نے جواب دیدیا اور کلمہ لاالہ الااللہ کا ورد ہماری زبانوں پر جاری نہ رہ سکا تو یہ عالم اسلام کے لیے حادثہ عظیم ہوگا، ہندوازم کے احیاء کی طاقتیں، حکومت ہند کی خاموش رضامندی کے ساتھ، "اپنے بچھڑے بھائیوں کو اپنے گھر واپس لانے کے نام پر "ہندو وراٹ سمیلن کے نام سے ایک سابق مرکزی وزیر ڈاکٹر کرن سنگھ کی قیادت میں جمع ہو کر ہندستان سے اسلام کا نام و نشان مٹا دینے کی تیاریوں میں لگی ہوئی ہیں اور یہ پروگرام محترمہ اندرا گاندھی کی عدم دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

ممالک اسلامیہ کا ہر ریال یا ڈالر جو ہندستانی سرکار کو بطور امداد یا قرض مل رہا ہے وہ یہاں کے مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور قتل و غارت گری کے سامان فراہم کر رہا ہے، تیل کا ہر قطرہ مسلمانوں ہی کے گھروں اور املاک کو جلانے کے کام آ رہا ہے۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ یتیموں کی آہ و بکا خاموش ہو جائے، بیواؤں کی سسکیاں ان کے گلوں میں دم توڑ دیں، اس سے پہلے کہ ہماری زبانیں کلمۂ محمدِ عربی کے ورد سے گونگی ہو جائیں، اپنے لیے، شافع محشر محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمۂ، دین برحق کے لیے، اسلام کے لیے، اللہ کے لیے کچھ کریں، ہمیں بچائیں، سہارا دیں، ہم کمزور ہیں، انتشار کا شکار ہیں، استعمار کے زیر سایہ زندگی گزار رہے ہیں مدد، المدد . . . . اللہ ان ظالموں کے مقابلہ میں تو ہی کسی کو ہمارا حامی اور مددگار مقرر فرما، یہاں کی عورتوں اور بچوں کی فریاد سن لے اے رب کائنات!

کیا آج ملت اسلامیہ ایک وحدت نہیں رہ گئی؟ کیا امت کے کسی فرد پر چلنے والے خنجر کی ٹیس کا احساس ختم ہو گیا؟ کیا اہل اسلام ایک ملت واحدہ اور جسم نہیں رہ گئی۔ کیا فقۂ اسلامی کا آج یہ مسئلہ ختم ہو گیا؟ کہ........ "ایک مسلم خاتون اگر مشرق میں قید ہو جا تی ہے تو اہل مغرب پر اسکا فدیہ دینا اور اسے رہا کرانا واجب ہو گا۔ خواہ اس میں مسلمانوں کی ساری دولت لگ جائے۔"

آج مشرق میں کروڑوں مسلمان مرد اور عورتیں ظلم وستم کا شکار ہیں۔ ان کے حقوق و حرمت پامال کر دیئے گئے ہیں اور کیا عالم اسلام کو اللہ ربّ العزت کی یہ پکار سنائی نہیں دے رہی ہے؟

کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی ان اللہ لقوی عزیز

اگر سنائی نہیں دیتی تو ان پچیس کروڑ جنگی قیدیوں کے لیے اجتہادی ضابطوں کو ہی عالم اسلام اپنے علماء کے ذریعہ مرتب کروا کر ہمارے حق میں فیصلے سنا دے، عید الاضحٰے میں جانوروں کی قربانی سے ہندستانی مسلمانوں کو آزاد کر دے، عید الفطر کی نمازوں سے بری کر دے۔ ہندستان میں محرم اور یوم عاشورہ کی تقریبات آٹھ سو سال سے منائے جانے کے سبب مذہبی مراسم کا جز وخاص بن چکی ہیں۔ اسی طرح یوم میلادالنبی بھی پورے ملک میں جوش وعقیدت سے منایا جاتا ہے اور اس کے بھی بڑے بڑے جلوس نکلتے ہیں جو شوکت اسلام کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

ہر سال بقرعید کے موقع پر جانوروں کی قربانی پر دنگے ہوتے ہیں اسلئے کہ ہندؤں کے مذہبی عقیدہ کی بنا پر گائے ان کی ماں ہے، آزادی کے بعد ملک کے بیشتر حصوں میں گائے کی قربانی پر سیکولر ملک میں سرکاری طور پر پابندی ہے، بھینسا یا بھینس کی قربانی بھی شرارتوں کا شکار ہو جاتی ہے، اور نام نہاد عدالتیں تک موشگافیوں کا شکار ہو کر مذاق اڑاتی اور کہتی ہیں کہ قرآن میں کہاں بھینس یا بھینسے کی قربانی کا ذکر کیا گیا ہے،؟ اونٹ اور دنبہ کی قربانی کی جا سکتی ہے پھر انگریزی حکومت کے زمانہ میں جن جگھوں پر قربانی لکھی ہوئی ہے وہیں لڑ، جھگڑ کر قربانی کی جا سکتی ہے کسی نئی جگہ قربانی کرنے کی اجازت نہیں

ہے۔

عیدالفطر میں بھی ہر سال نئے جھگڑے کھڑے کر دیئے جاتے ہیں، کسی مسجد میں پیپل کا پیڑ نکل آیا تو گویا بھگوان (خدا) نے استھان (جگہ) بنا لیا۔ عید گاہ یا قبرستان کی کسی آراضی پر کھودا تو وہاں کسی دیوتا یا دیوی کی مورتی (مجسمہ) نکل آئی۔ اس پر جھگڑا شروع کر دیا۔ پھر فسادات شروع ہو گئے آناً فاناً پولیس کی چھتری کے سایہ میں فسادیوں نے مسلم آبادیوں کو نذر آتش کر دیا، اسباب لوٹ لیا، اور مسلمانوں کو تہہ تیغ کر دیا، مسلمان بے چارہ حسرت اور بیچارگی کے عالم میں سب کچھ دیکھتا رہ جاتا ہے اور یہ سلسلہ سال کے بارہ مہینوں میں چلتا رہتا ہے، کبھی عید، کبھی بقرعید۔ کبھی محرم اور کبھی عید میلادالنبی کی تقریبات اور اس کے علاوہ بھی۔

سنہ ۱۹۸۳ء کے سال میں اسطرح کے فسادات نے پوری شدت سے سر اٹھا لیا ہے۔ اسکا سبب یہ ہے کہ افغانستان سے آسام تک مسلمانوں کے قتل میں مسز اندرا گاندھی کی خاموش رضامندی نے مسلمانوں کو بری طرح مایوس کر دیا ہے اور انکی خفیہ سروس نے انھیں مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کر دیا کہ مسلمانوں کا ووٹ ان سے بھاگ رہا ہے جس کی وجہ سے انھوں نے ہندو فرقہ پرست تنظیموں کو کھلی چھوٹ دیدی ہے۔

۱۸/۱ اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء کو ملک کے بیشتر مقامات پر جبکہ مسلم آبادیوں کو لوٹا اور جلایا جا رہا تھا تو دہلی کی مساجد کے اماموں کے امام "تنظیم ائمہ مساجد دہلی" کے صدر مولانا جمیل احمد اصلاحی محترمہ اندرا گاندھی سے مل کر یقین دلا رہے تھے کہ "وہ انکی پالیسیوں کی مکمل حمایت کریں گے اور خدائے قادر مطلق سے انکی کامیابیوں اور انکی راہ میں آنے والی رکاوٹوں کے خاتمہ کے لیے دعا کریں گے۔"

اور یہ اسوقت کہہ رہے تھے جب تین روز پہلے ہی وہ واضح کر چکی تھیں کہ فرقہ پرستی اور ہندو عصبیت پھیلانے والی تنظیموں پر پابندی نہیں لگے گی۔

ہندستان کے علمائے کرام اور مساجد کے امام سرکار کے ہاتھوں بک چکے ہیں جن کے سب سے بڑے امام جمیعتہ العلماء ہند کے صدر اسعد مدنی ہیں۔ اسوقت جمیعتہ العلماء ہند

پر پوری طرح کمیونسٹوں کا غلبہ ہے، جمیعت کے صدر، اندرا کانگریس یو۔ پی کے نائب صدر ہیں اور جنرل سکریٹری سید احمد ہاشمی چندر جیت یادو (جو روسی لابی کے آدمی ہیں) کی پارٹی میں شامل ہیں...... یہ نام نہاد سادات کی ٹولیاں اپنے ناموں کے ساتھ سید مدنی اور ہاشمی لگاکر عام مسلمانوں کے جذبہ احترام کا غلط فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ مسلمان سید ہاشمی اور مدنی کی نسبتوں کا احترام کرتے ہیں۔

اسلئے دنیائے اسلام کو موجودہ مسلم غلاموں کے لیے دینی معاملات میں نئی فقہ مرتب کرکے دینے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے نامہ اعمال کے ساتھ اس کو لیکر بروز حشر خدا کے حضور میں جاسکیں...... اور یہ بتاسکیں کہ ہم مجبوروں نے اپنی عزت اور آبرو پر قائم رہنے کیلئے اسلامی روایات اور رسومات کی ادائیگی کے لیے عالم اسلام سے مدد مانگی تھی اس کے بدلہ انھوں نے ہمیں فقہ اسلامی کا یہ نیا ایڈیشن دے دیا۔

میں پھر کہتا ہوں کہ ہندستان کا کوئی شہر، کوئی قصبہ اور کوئی گاؤں نہیں ہے جہاں مسجد، قبرستانوں اور مسلمانوں کی وقف املاک کے خلاف اکثریتی گروہ کے افراد نے سرکاری سرپرستی میں جھگڑے نہ کھڑے کردیئے ہوں اور ملک کی نام نہاد عدالتوں نے ان معاملات کو الجھانے اور ہراساں کرنے کا رول مسلمانوں کے خلاف ادا نہ کیا ہو!

ہندستان دنیا کی وہ نسل پرست حکومت ہے۔ جس نے انسان دوستی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ ہندؤں کے اعلیٰ طبقہ کے لوگ دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنا نہیں جانتے۔ آج بھی انھیں کا ایک مذہبی گروہ انکی عبادت گاہوں یا بتکدوں میں داخل نہیں ہوسکتا اسلئے کہ ان کے داخلہ سے یہ بتکدے نجس ہوجائیں گے۔

اس گروہ نے اپنی نسل پرستانہ روش سے ملک کے مسلم اکثریت کے علاقوں کو الگ کرکے پاکستان کی شکل میں قبول کرلیا لیکن قائداعظم محمد علی جناح کی تجویز کے مطابق مسلمانوں کو قانونی تحفظات دینا قبول نہیں کیا۔

چھوٹا ہوکر بڑا بننے کا جذبہ جتنا اس ملک کے لیڈروں میں ہے دنیا کی کسی قوم میں نہیں۔ اور یہی وہ جذبہ ہے جو افریقہ کی نسل پرست حکومت کی شکل میں کہیں ظاہر ہوتا ہے

تو کہیں اسرائیل کی حکومت یا صیہونیت کا روپ لے لیتا ہے اور کہیں خود بھارتی سرکار کی شکل میں نقاب پوش رہزن بنکر ہندستان کے مسلمانوں کو، انکی دینی اقدار کو، انکی تاریخی روایات کو روندتا پھرتا ہے، لیکن کمال ہوشیاری سے ریاکاری کی نقاب اوڑھ کر مسلم ملکوں سے دوستی کا بھی دم بھرتا اور ان سے تمام دنیاوی فائدے حاصل کرلیتا ہے۔

خدا کی شان کہ آزر خلیل کہلائیں
دلوں میں اپنے بسائے ہوئے صنم خانے

نشتروں کی دنیا

موجودہ ہندستان کا کارواں جہاں ٹھہرا ہوا ہے، اسکا گرد و غبار بہت پیچھے نظر آسکتا ہے۔ اس کے لیے ماضی کے دریچوں میں آنکھیں ڈالکر تاریخ کے اوراق کو پلٹنا ہوگا۔ تب جا کر کہیں اس کارواں کی حقیقت سامنے آئے گی۔ ہندستان اپنے ذہن و مزاج کے اعتبار سے کبھی نہ تو رواداررہا ہے اور نہ سیکولر۔ ہندستان کی پوری تاریخ مذہبی تعصب، تنگ نظری، اور تنگدلی کی ایک ایسی جیتی جاگتی تصویر ہے، جس پر روشن خیالی اور لفاظیوں کے لاکھ غلاف چڑھائے جائیں، مگر پھر بھی اس کے خدوخال پکار پکار کر زبان حال سے ماضی کی تنگ دلی اور تنگ نظری کی داستانیں سناتے رہے ہیں اور سناتے رہیں گے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مسلمانوں سے پہلے اس تعصب، تنگ دلی اور تنگ نظری کا شکار پوری شدت سے اچھوت، شودر اور دوسری پست اقوام تھیں..... مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی یہ رُخ بدلا اور اسکا نشانہ مسلمان بننے لگے۔

اگر ابتدا سے ان حالات پر روشنی ڈالی جائے تو اس کے لیے کئی جلدیں درکار ہوں گی، یہاں ہم پچھلی نصف صدی کا جائزہ لیں گے، ہاں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہندستان کے حکمران ہمیشہ اپنے شدید ترین اختلافات کے باوجود مسلمانوں کے خلاف متحد تھے اور رہیں چاہے وہ محمد بن قاسم کا حملہ ہو یا محمود غزنوی کا یا محمد غوری کا یا قائداعظم محمد علی جناح کی سیاسی جدوجہد محمد بن قاسم کو چھوڑ کر دونوں افغان سپہ سالاروں نے ہندستان کے راجاؤں کی متحدہ طاقت کو شکست دی تھی، خود محمد غوری کے مقابلہ میں پرتھوی راج کے جھنڈے تلے ہندستان کے ڈیڑھ سو راجہ اپنی تین لاکھ افواج کے ساتھ موجود تھے جبکہ محمد غوری کے ساتھ صرف چالیس ہزار سپاہی تھے۔ ایک مورخ سجان رائے نے پرتھوی راج کی شکست کا نقشہ ایک شعر میں کھینچ دیا ہے:

چنان ہیمناک و ہراساں گریخت
کہ زنار از گرانی گسیخت

محمد غوری کے بعد ہندستان پر اسلامی غلبہ اور مسلم حکمرانوں کی رواداری سے فائدہ اٹھا کر ملک کے ہندو حکمرانوں نے ہمیشہ سازش کا بازار گرم رکھا۔ سامنے تو وہ اطاعت و فرمانبرداری کا دم بھرتے لیکن پس پردہ سازشوں میں لگے رہتے۔ جب افغانوں نے اس ملک میں ایک مضبوط اسلامی حکومت قائم کرکے ہندستان کو امن و سلامتی اور عدل و انصاف عطا کیا تو راجپوت حکمراں افغانوں کے خلاف بابر کے ہمنوا بن گئے۔ جس میں ابراہیم لودی کی غلط کاریوں کو بھی دخل تھا۔ اسطرح بابر اور راجپوتوں کی متحدہ طاقت نے افغان حکومت کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی، لیکن جیسے ہی راجپوتوں کو پتہ چل گیا کہ بابر کے ارادے اچھے نہیں اور وہ ہندستان پر مغل شہنشاہیت قائم کرنا چاہتا ہے تو راجپوت سردار راناسانگا کی قیادت میں بابر کے خلاف صف آرا ہوگئے بابر کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ بارگاہ رب العزت میں جھک گیا، اس نے شراب کے مٹکے تڑوا دیئے اور یہ کہنے والا:

بابر بہ عیش کوش کہ دنیا دوبارہ نیست

خدا کے حضور اسلام کی فتح و نصرت کا طالب ہوا۔ اللہ نے اسکی آواز کو سنا اور ایک انگریز مورخ کے بقول بابر نے راجپوت قوم کو ایسا آختہ کیا کہ پھر کبھی وہ نر پیدا نہ کرسکی۔ اب راجپوتوں نے مغلوں کے خلاف افغانوں کو استعمال کرنا شروع کردیا۔ بعد میں بابر کے پوتے اکبر نے راجپوتوں سے شادی بیاہ کے رشتے قائم کرلیے لیکن اس کے بعد بھی رانا پرتاپ مغلوں کے خلاف نبرد آزما رہا۔ اگرچہ متصل حکومت میں رہنے کی وجہ سے ہندستان کی اقوام میں راجپوت جو قدیم الایام ترک سمجھے جاتے ہیں شریف، بہادر اور جری قوم تھی اور اس کی شکست سے ہندستان اس جری قوم کی قیادت سے محروم ہوگیا۔

بابر کے بعد ایک بار پھر فرید حسن خاں "شیرہ شاہ عالم" جو تاریخ میں شیرشاہ سوری کے لقب سے جانا جاتا ہے نے پٹھانوں یا افغانوں کی منتشر طاقت کو یکجا کرکے بابر کے بیٹے ہمایوں سے حکومت چھین لی اور ایک مضبوط عدل و مساوات پر مبنی حکومت کی بنیاد

"شیر شاہ عالم" کالقب اختیار کر کے ڈالدی، مگر اسکی زندگی نے وفا نہ کی اور اس کے بعد ۳۳۶ برس تک تاج شاہی نسل بابر کے سر پر چمکتا رہا۔ اور اسی عہد میں ہندستان دنیا کے سامنے سونے کی چڑیا بن کر ابھرا۔ اس پورے عہد میں مغلوں سے رشتہ داریوں اور انکی فیاضی اور رواداری کے جواب میں ہمیشہ ہندو راجاؤں اور جاگیرداروں نے سازشوں، بغاوتوں اور شورش کا بازار گرم رکھا۔ اورنگ زیب عالمگیر جسے ایک ہندو دشمن اور متعصب حکمران کی شکل میں پیش کیا گیا ہے اس نے اپنی افواج کا سپہ سالار کبھی کسی مسلمان کو نہیں بنایا بلکہ جے سنگھ اور جسونت سنگھ ہی اس کے سپہ سالار رہے انھوں نے وقتاً فوقتاً بغاوتیں بھی کیں لیکن اس نے ہمیشہ انھیں معاف کردیا۔

یہ ہے اجمالی خاکہ جس کو سمجھے بغیر ہندستان کا تجزیہ کرنا دشوار ہوگا۔ اس سے آپ کو پوری قوم کے اندرونی مزاج، سازشوں، دلفریب اور دل خوشکن الفاظ کے کیپسول میں نفرت، شک، خوف اور تنگ دلی کے سوا کچھ نہ ملے گا۔

سنہ ۱۸۵۷ء میں انگریز کے قدم ملک میں جم گئے اور ہندستان کی تقدیر کا فیصلہ ہو گیا تو ہندو لیڈروں نے مسلمانوں اور انکی حکمرانی سے نجات کا بہترین موقع سمجھکر انگریز سے تعاون شروع کردیا۔ مسلمان لڑائی ہار گئے۔ تقریباً سولہ سو علمائے کرام پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیئے گئے۔ مسلمانوں کی آبادیوں کو منتشر کردیا گیا۔ سیکڑوں علماء اور مسلم عمائدین جلاوطن کردیئے گئے۔ انگریزوں کا ملک پر غلبہ ہو گیا۔ تاریخ نے کہا ہندستان غلام ہو گیا، حالات نے بتایا مسلمانوں کے پیروں میں غلامی کی بیڑیاں ڈالدی گئیں۔

مسلمان حکمرانوں نے اپنے عہد میں جس رواداری کا ثبوت دیا ہندستان کا مزاج اس سے واقف نہ تھا۔ پنڈت سندرلال نے اپنے ایک مضمون میں مسلمانوں کی رواداری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔۔ "اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اس کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانے میں ہندو اور مسلم یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں مذاہب کی یکساں عزت کی جاتی تھی اور مذہب کی بنیاد پر کسی قسم کی جانبداری نہ برتی جاتی تھی۔ ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں۔ آجتک متعدد ہندو

پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں۔ جن میں خیرات اور جاگیروں کے عطا کئے جانے کا ذکر ہے۔"

اورنگ زیب نے تخت نشین ہوتے ہی اڑتالیس قسم کے غیر اسلامی ٹیکس ہندوؤں کو معاف کردیئے اور صرف اسلامی ٹیکس جزیہ مقرر کیا جو ایک آدمی پر زیادہ سے زیادہ تیرہ روپیہ تھا۔ لیکن اس کے خلاف غیر عقلی کہانیاں ہندو عوام میں پھیلائی گئیں کہ اورنگ زیب روزانہ اتنے برہمن قتل کرواتا تھا کہ نو من جنیو ہوجایا کرتے تھے۔ ایک جنیو کا کتنا وزن ہوتا ہے؟ (یہ گلے میں پہنے جانے والا دھاگا ہے)

یہاں کے صاحب اقتدار ہندو گروہ نے مسلمانوں کو "ملکش" کا لقب دیا اور ان کے خلاف نفرت کا بازار گرم رکھا۔

کچھ سیاسی لیڈروں نے کبھی کبھی حقیقت کا اظہار بھی کیا۔ مسز سروجنی نائیڈو جو انگریزی کی اچھی شاعرہ تھیں انھوں نے مسلمانوں اور عربوں کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔۔۔ "عربوں نے صرف زمین اور ملک فتح نہیں کئے۔ بلکہ دل و دماغ فتح کئے۔ مسلمان بھائیو، ہمارے خواب و خیال (فلسفہ) کو حقیقت کا روپ تمہیں نے دیا۔ اور ہمارے افکار و تخئیل میں حرکت تمہیں نے ڈالی۔ آپ جانتے ہیں کہ مسلمانوں نے دنیا میں علوم و فنون کی کیا خدمات جلیلہ انجام دی ہیں۔ انھوں نے ہندوؤں کی طرح بخل روا نہیں رکھا۔"

لیکن دوسری طرح پنجاب کے لیڈر لالہ لاجپت رائے کہتے ہیں کہ شری سمرتھ رام داس سوامی برہمن نے شیواجی کو بار بار اسلام کے خلاف جنگ کرنے کا اپدیش دیا، شیواجی کی موت کے بعد اس کے بیٹے کو اسی برہمن نے ان الفاظ کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف ابھارا کہ آپس میں محبت سے رہو، اپنے مسلمان دشمنوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر راستہ سے ہٹادو۔ لوگوں کے دلوں میں ملکشوں کے مقابلہ کا خیال پیدا کرو اور مہاراشٹر کی سلطنت کو سب ملکر بڑھانے کی کوشش کرو۔

آزاد ہندستان کی تاریخ میں صرف مہاراشٹر کی سلطنت کے لیے لڑنے والا قومی ہیرو بنا دیا گیا اور پورے ملک کی وحدت اور سالمیت قائم رکھنے والا اورنگ زیب قابل نفرت قرار

دے دیا گیا۔

تلک جی مہاراج پرانے کانگریسی اور ہندستان کی آزادی کی لڑائی کے چوٹی کے لیڈر نے سنہ ۱۸۹۷ کو شیواجی کے ایک یادگاری جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف بولتے ہوئے کہا۔۔۔ "اگر ہمارے گھر میں چور داخل ہو جائیں اور انکو باہر نکالنے کی ہم میں طاقت نہ ہو تو ہمیں چاہئے کہ انکو اندر بند کرکے مکان کو آگ لگادیں اور انکو زندہ جلادیں۔ پرماتما (خدا) نے غیرملکی (مسلمانوں) لوگوں کو تانبے کے ٹکڑوں پر لکھ نہیں دیا ہے کہ جاؤ ہندستان کی حکومت تمھاری ہے۔" (جبکہ مسلمانوں کی طاقت ٹوٹ چکی تھی اور انگریزی غلامی آچکی تھی مگر نشانہ پر مسلمان تھے)۔

سوال یہ نہیں ہے کہ تلک جی نے جو کچھ کہا وہ درست یا غلط ہے اصل سوال یہ ہے کہ کیا ہندستان کے مسلم حکمرانوں اور عام مسلمانوں کی وہی حیثیت ہے جو اس ملک میں انگریز کی رہی ہے؟! اسی بنیادی سوال کے اندر اتحاد و یکجہتی کے سارے راز پوشیدہ ہیں، اگر یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں نے اس ملک کی خدمت کی ہے اور قطب الدین ایبک سے لیکر بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار ہند تک کوئی مسلمان ایک پتی لیکر آٹھ سو برسوں میں باہر نہیں گیا اور اپنے آبائی وطن کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا اور اور ہندستان ہی کو اپنا وطن سمجھا اور سب کچھ اسی زمین کے لیے کیا، وہ تاج محل ہو یا شیرشاہ کی شاہراہ عظیم (جی۔ ٹی۔ روڈ) لیکن اس کے بعد بھی انکو چور اور غیرملکی کہہ کر انکو گھیر کر آگ لگانے کی تلقین کرنا کہاں تک درست ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج پورے ملک میں مسلمانوں کو آگ و خون کے سمندر میں غرق کردیا گیا ہے۔

مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف اپنی پوری طاقت و توانائی لگا کر اپنے کو تباہ کرلیا تو ملک کے ہندو لیڈر دوسری طرف سے ان پر پل پڑے اور انگریزوں کی اس پالیسی پر عمل پیرا ہوگئے کہ مسلمانوں کو ہرگز ابھرنے نہ دو۔ انکو نیچا دکھانے کی ہر ممکن کوشش جاری رکھو۔

سنہ ۱۸۴۲ میں لارڈ النبرا نے ڈیوک آف ولنگٹن کو ایک خط میں لکھا کہ میں اس

بات سے کیسے آنکھیں بند کرلوں کہ مسلمانوں کی قوم دیوانہ وار ہماری دشمن ہے اسلئے ہماری سچی پالیسی یہ ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ مہربانی کی جائے۔

فرانس کے مشہور عالم علوم مشرقیہ مسٹر گارسن و تاسی نے سنہ ۱۹۲۸ء میں برصغیر کے دورہ کے وقت اپنے ایک لکچر میں کہا تھا کہ: "ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایسے امر کے خلاف کھڑے ہوجاتے ہیں جو انکو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے۔"

اور ہندستان میں مسلمانوں کا وجود اس زمانہ کو یاد دلانے کی ایک مسلسل کڑی ہے اور شدید ترین اکثریت اور حکومت، اقتدار و طاقت حاصل کرنے کے باوجود اس قوم کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے کہ نہ تو اس میں شان حکمرانی پیدا ہوئی اور نہ ہی مسلمانوں کا خوف سینہ سے نکل سکا۔ بے خوفی کوئی بازار کی چیز نہیں کہ خرید کر دیدی جائے، اور یہی خوف ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف فسادات پر اکساتا ہے۔ جہاں پولیس اور مقامی انتظامیہ مسلمانوں کے خلاف انکی مددگار ہوتی ہے۔

بال گنگا دھر تلک نے سنہ ۱۸۹۳ء میں بمبئی کے ہندو مسلم دنگوں کے بعد گنپتی[1] کا میلہ شروع کروایا جس میں مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز گیت گائے گئے۔

زبان کا مسئلہ بھی انھیں دنوں کھڑا کیا گیا۔ سرسید احمد خاں کی تحریک نے انگریزوں کے سینہ میں مسلمانوں کے خلاف پائی جانے والی نفرت کو کم کیا تو انگریز کی پالیسی مسلمانوں کے خلاف کسی قدر تبدیل ہوئی تو ہندو لیڈروں نے بنارس کے پنڈتوں سے اردو کے خلاف تحریک شروع کروادی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ عدالتوں سے اردو کو ختم کرکے ہندی کو دیوناگری رسم الخط میں رائج کیا جائے اس تحریک کا صدر مقام الہ آباد مقرر کیا گیا جو کانگریس کا گڑھ تھا۔

سنہ ۱۸۸۸ء میں سرسید احمد خاں نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن اور پیٹریاٹک سوسائٹی قائم کی تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں انگریز کی خوشامد کے سلسلہ میں رقابت شروع ہوگئی۔

---

(۱) گنپتی

یہی زمانہ ہے کہ جب لارڈ میکالے نے ہندستان میں ایک ایسی جماعت کی ضرورت پر زور دیا جو انگریز اور ہندستان کے کروڑوں لوگوں کے بیچ مترجم کا کام کرے اور خون و رنگ کے اعتبار سے تو ہندستانی ہو مگر رائے اور مذاق اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔

دھیرے دھیرے مسلمانوں کا ایک گروہ اپنے کو اس سانچے میں ڈھالنے کا کام کرنے لگا تو ہندو لیڈروں نے شورش برپا کرنا شروع کردی۔ اسلئے کہ انگریزوں بلکہ حکمرانوں کی چاپلوسی وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ اردو ہندی کا جھگڑا شروع ہوچکا تھا۔ بہار اور یوپی میں ہندی والوں کو کامیابیاں حاصل ہوگئیں۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں سر انٹونی میکڈانلڈ کی مدد سے سرکاری طور پر ہندی کو عدالتی زبان تسلیم کرلیا گیا۔

مسلمان دو چکی کے پاٹوں کے بیچ پس رہے تھے۔ ایک طرف انگریز کا شک دوسری طرف ہندو لیڈروں کا خوف و نفرت۔

انگریزی سرکار نے بعض انتظامی امور اور دیگر سیاسی وجوہ کی بنا پر سنہ ۱۹۰۵ء میں بنگال کو تقسیم کردیا۔ اس تقسیم سے مشرقی بنگال جو اب بنگلہ دیش ہے کے مسلمانوں کو سیاسی، سماجی اور معاشی فوائد حاصل ہونے کے امکانات تھے اور اس تقسیم کے بعد ہندو زمینداروں کا غلبہ اور ان کے ہاتھوں مسلمانوں کا استیصال ختم ہوجانا یقینی تھا۔ چنانچہ کانگریس نے اس کے خلاف تحریک شروع کرکے خالص فرقہ وارانہ رُخ دیدیا مسلمانوں پر حملے شروع ہوگئے۔

سنہ ۱۷۷۵ء میں بنکم چٹرجی کی چھپنے والی کتاب "آنند مٹھ" جس کے آخر میں "بندے ماترم" "ماں* تیرے بندے ہم" کا گیت تھا۔ اس گیت کو اس تقسیم کے وقت کارگر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا اور مسلمانوں کو مجبور کیا گیا کہ جب یہ گیت پڑھا جائے تو مسلمان احتراماً ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں۔

تاریخ کانگریس کے مصنف سیتا رامیہ کے بیان کے مطابق ـــ "کانگریس کی تاریخ میں سب سے پہلا ایجی ٹیشن سنہ ۱۹۰۶ء سے سنہ ۱۹۱۱ء تک پانچ سال رہا۔ جسکو

---

* ماں سے مراد زمین، وطن

دبانے کی بہت کوشش کی گئی جس کی وجہ سے شورش اور بڑھ گئی اور آخر کار شاہی اعلان کے وقت سنہ ۱۹۱۱ء میں کامیابی حاصل ہوئی جس میں تقسیم بنگال کے خاتمہ کا اعلان تھا۔ اس احسان کے بدلہ میں کانگریس کے لیڈروں نے حکومت انگلشیہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے انصاف و عنایات کی تعریف کی، اور کہا ہر شخص کا دل تاج و تخت برطانیہ کے ساتھ وفاداری، محبت اور خوشی میں بے چین ہے۔ ہم میں سے اکثر تو آزمائش کے مواقع پر بھی برطانیہ کے انصاف سے مایوس نہیں ہوئے۔"

تقسیم بنگال کے خلاف کانگریس کی مخالفت کا ردعمل یہ ہوا کہ ۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں نواب وقار الملک کی صدارت میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد پڑ گئی۔ اور اس کے ذریعہ مسلمانوں نے جداگانہ انتخاب، سرکاری ملازمتوں میں متناسب نمایندگی، میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں مسلمانوں کی نشستوں کو متعین کرنے کا سوال، یونیورسٹیوں، اسمبلی، کونسل اور ان صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں مسلمانوں کی موثر نمایندگی دینے کا مطالبہ کیا۔

اس کے بعد ہی کانگریس نے ہندو مہاسبھا کے نام سے ایک پارٹی کھڑی کر کے وہی مانگیں جو مسلمانوں نے اقلیت میں ہونے کے سبب رکھی تھیں ہندو مہاسبھا سے ہندووں کے لیے شروع کروادیں۔

اس سلسلہ میں مسٹر گوکھلے نے سنہ ۱۹۰۷ء میں ہندو مسلم اتحاد پر علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔۔۔ "چونکہ مسلمان تعداد میں ہندؤں کے مقابلہ میں بہت کم ہیں لہٰذا انھیں خوف ہے کہ کہیں وہ انگریزوں کی حکومت سے نکل کر ہندووں کی حکومت میں نہ آجائیں۔ یہ خیال ایسا نہیں ہے جسکو مذاق میں اُڑا دیا جائے۔ جو حالت مردم شماری کے حساب سے اسوقت مسلمانوں کی ہے اگر یہی حالت ہندووں کی ہوتی تو کیا یہی خیال ہمارے دلوں میں خطرہ بن کر نہ ابھرتا اور ہم بھی اسی خیال کو پیش نظر نہ رکھتے اور اسی پالیسی پر عمل کرنے کو تیار رہتے جس پر اس وقت مسلمان عمل کر رہے ہیں۔"

سنہ ۱۹۰۹ء میں سرکار نے جداگانہ انتخاب کو منظور کر کے مسلم لیگ کی سیاسی

حیثیت کو تسلیم کرلیا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں مسٹر ڈبلو ایڈ برن کانگریس کے صدر اور آغا خاں میں لندن میں ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر بات چیت شروع ہوئی۔ اور دونوں نے اتحاد کانفرنس بلانے پر اتفاق ظاہر کیا۔ مسلم لیگ کے اجلاس ناگپور میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا گیا۔ اس کے بعد الہ آباد میں اتحاد کانفرنس منعقد ہوئی۔ مگر کانگریس کے کچھ لیڈروں اور مالویہ جی نے اسے ناکام بنادیا۔

اسی سال مولانا محمد علی ملازمت چھوڑ کر سیاست میں آگئے اور ہندستانی سیاست نرم روی اور مصلحت اندیشیوں سے نکل کر انقلابی راہوں پر گامزن ہو گئی۔

سنہ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ نے سلف گورنمنٹ کا نعرہ دیدیا۔ اور کہا کہ ہندستان کی آیندہ سیاست کا دارومدار ہندستان کی دونوں قوموں ہندو اور مسلمان کے باہمی اتحاد پر اور اشتراک پر ہوگا۔

قائداعظم محمد علی جناح برابر ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے رہے۔ دسمبر سنہ ۱۹۱۵ء میں بمبئی میں کانگریس اور مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں نئی اصلاحات نافذ ہونے والی تھیں، اس کے لیے دونوں نے مشترکہ طور پر ریفارم اسکیم پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی۔

اس سمجھوتہ کے متعلق مولانا محمد علی جوہر نے جو اسوقت نظربند تھے اپنے کوکوناڈا کے خطبۂ صدارت میں کہا ــــ "مسٹر جناح کی موثر وکالت، صدر نشین لیگ کے زور بیان اور شمشیر بے نیام مسلمان وطن دوست مولانا حسرت موہانی کی جرأت و استقلال کی مجموعی طاقت سے آخرکار وہ مفاہمت ہو گئی جسکا ثمرہ لکھنؤ کے تاریخی میثاق لکھنؤ کی شکل میں سامنے آیا۔

نومبر سنہ ۱۹۱۶ء میں کلکتہ میں سریندر ناتھ بنرجی کی صدارت میں مسلم لیگ اور کانگریس کی مشترکہ میٹنگ ہوئی اور ایک معاہدہ ہوا جو لکھنؤ پیکٹ کے نام سے مشہور ہے دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس ہوئے کانگریس کے صدر امبیکاچرن مجمدار اور مسلم لیگ کے صدر جناح صاحب تھے۔

جناب محمد علی جناح نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا۔۔۔ "یہ بات میرے لیے اور ہر محب وطن کے لیے نہایت اطمینان بخش ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کی جماعتی حیثیت کو ہندو جماعت کے لیڈروں نے تسلیم کرلیا اور اس کے ساتھ فراخدلی کا برتاؤ کیا انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی کمیٹیوں نے گزشتہ نومبر میں کلکتہ میں ملکر جو عہد نامہ متفقہ طور پر منظور کیا تھا وہ اس کی بیّن دلیل ہے دونوں فریقوں میں چند ایسے نفوس ہیں جنکا رضامند ہونا محال ہے۔ اب بھی ممکن ہے کہیں کہیں ہوں لیکن بہ حیثیت مجموعی فرقہ وارانہ ابر کے خوف سے مطلع صاف ہو گیا ہے، اور مستقبل کے مناظر ان علامات سے چمک اٹھتے ہیں جو ہندستان کے وفادار فرزندوں کے دل خوشی سے معمور کردیتی ہیں۔"

سنہ ۱۹۱۷ء کے مسلم لیگ کے کلکتہ اجلاس کے لیے صدارت کا نام مولانا محمد علی جوہر کا طے ہوا مگر وہ جیل میں تھے اسلئے کرسئی صدارت پر انکی تصویر رکھی گئی۔ جس کے بارے میں انھوں نے کہا:

یہ صدر نشینی ہو مبارک تمھیں جوہر
لیکن صلہ روز جزا اور ہی کچھ ہے

ہندستانی سیاست کا نیا رُخ

سنہ ۱۹۱۸ء میں فضل الحق کی صدارت میں دہلی میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ مسلم لیگ ہی اسوقت تک آزادی ہند کی نمایندہ جماعت تھی۔ مولانا عبدالباری فرنگی محل (لکھنؤ) بھی بہت سے علماء کے ساتھ اس میں شریک تھے، انگریزوں سے موصوف کو شدید نفرت تھی، گاندھی جی اکثر لکھنؤ میں ان کے دولت کدہ پر حاضر ہوتے اور انھیں اپنا "سیاسی پیر" کہتے۔ گاندھی جی سے مولانا کو بھی بڑی محبت تھی۔ جس کے لیے وہ اکثر یہ شعر پڑھتے:

عمری کہ بہ آیات و احادیث گذشت
رفتی و نثارِ بُت پرستی کردی

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب کانگریس اور مسلم لیگ کے جلسوں میں یونین جیک (برطانیہ کا جھنڈا) لہرانا ضروری تھا، اور سارے جلسے اسی کے سایہ میں ہوا کرتے تھے کانگریس کے جلسوں میں ملک معظم سے وفاداری کا رزولیشن ضرور پاس ہوتا تھا۔ اس جلسہ دہلی میں مولانا عبدالباری صاحب صدر کی درخواست پر جب تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور جیسے ہی یونین جیک پر مولانا کی نظر پڑی تو غصہ سے منھ لال ہو گیا اور کہا ـــ "اس ہال میں کسی مذہبی مسئلہ پر ایمانداری کے ساتھ ایک لفظ بھی کہنا حرام ہے جبتک انگریزی جھنڈے کی لعنت یہاں موجود ہے۔"

سارے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ جناب فضل الحق نے میز پر کھڑے ہو کر اپنے ہاتھوں سے جھنڈا اتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

کانگریس اور ملک کے دوسرے سیاسی لیڈروں کا یہ دعویٰ کہ ہندستان کا موجودہ انقلاب گاندھی اور جواہرلال نہرو کی کوششوں کا نتیجہ ہے بہت بڑا جھوٹ ہے۔ تاریخی

شہادتوں کی نفی ہے۔ میرے قصبہ ملیح آباد جو ایک چھوٹی سی جگہ ہے جنگ آزادی میں کتنے ہی سورما نکلے۔ غدر میں ایک پٹھان زمیندار عبدالغفار خاں کو سات سال تک انگریز کی قید میں سیخچے لگا کر حالت رکوع میں رکھا گیا۔ کچھ کو گھوڑے کی دم میں باندھ کر کھینچا گیا۔ اس قصبہ کے مسلمان شاہ عبدالعزیز دہلوی اور سید احمد بریلوی کی تحریکوں سے وابستہ رہے اور ان کو تباہ و برباد کیا گیا۔ روہیل کھنڈ میں لاکھوں مسلمانوں کو اجاڑ دیا گیا۔ کانگریس کی تاریخ میں تاریخی دیانت داری کو پیروں سے روند کر مجاہدین آزای اور علمائے حق کو اتنا مقام بھی نہیں دیا گیا جتنا ہندو مہا سبھا کے لیڈر لالہ لاجپت رائے اور شردھا نند کو دیا گیا۔ اس زمانہ میں جب مسلمانوں کے خون سے انگریزی سرکار ہولی کھیل رہی تھی اور علمائے کرام قید و تنہائی اور جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے تو کانگریس کے لیڈر انگریزوں سے وفاداری کے رزولیوشن پاس کر کے اپنے اجلاس کا آغاز کر رہے تھے۔ جب کانگریس کے لیڈر ہندستان کی نام نہاد عدالتوں میں ججوں کے سامنے سر سر کر رہے تھے اس وقت ہندستان کے مسلمان اور علمائے کرام پھانسی کے پھندوں پر جھول رہے تھے۔

کانگریس کی بنیاد ایک انگریز نے اسلئے ڈالی تھی تا کہ ہندستان میں جمہوریت کا ناٹک کھیلا جائے اور کانگریس حزب اختلاف کا رول ادا کرے اور آخر وقت تک کانگریس یہی کرتی رہی وہ تو مسلمان لیڈروں کے جوش و ولولے نے اسے آگے بڑھانے کا کام کیا۔

مسلم لیگ اپنے وجود کے پانچویں سال حکومت برطانیہ کے لیے خطرہ بن گئی اور سنہ ۱۹۱۸ء میں اسکا خطبۂ صدارت ضبط کر لیا گیا اور اس نے یونین جیک کی لعنت سے سیاسی جلسوں کو نجات دلائی۔ لیکن کانگریس اپنے وجود کے آٹھویں سال بعد سنہ ۱۸۹۳ء کے سالانہ اجلاس میں یوں بول رہی تھی ..... "کانگریس اس ملک میں برٹش حکومت کی چمکتی ہوئی یادگار ہے، ہم اس آئینی دور میں رہنے کا فخر رکھتے ہیں جسکا نعرہ آزادی ہے اور جسکا سب سے بڑا ستون رواداری ہے۔"

دادا بھائی نوروجی بھی اپنے خطبۂ صدارت میں کہہ چکے تھے ..... "ہم کو مردانہ وار کہہ دینا چاہئے کہ ہم سر سے پا تک برطانیہ کے وفادار ہیں۔"

سنہ ۱۸۹۶ میں اپنے بارھویں اجلاس میں صدر کانگریس نے کہا تھا۔۔۔ "اس آفتاب کے نیچے انگریز قوم سے زیادہ ایماندار اور ثابت قدم کوئی قوم نہیں ہے۔"

سنہ ۱۸۹۸ میں مدراس میں کانگریس کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے۔۔۔ آنند بوس نے۔۔۔ اپنے خطبۂ صدارت میں کہا۔۔۔ "ہندستان کا تعلیم یافتہ طبقہ انگلینڈ کا دوست ہے نا کہ دشمن اور اس کار عظیم میں فطری قوت سے اس کے ساتھ ہے جو اس کے پیش نظر ہے۔"

یہ سب اسلئے تھا کہ انگریزوں نے ہندستان پر قائم ہزار سالہ سلطنت اسلامیہ کا خاتمہ کر دیا تھا اور کانگریس کے ہندو لیڈر سمجھتے تھے کہ انگریز ایک پابند قانون و دستور اور جمہوریت پسند قوم ہے چنگیز کا فرمان نہیں اسی لیے وہ کسی ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتے تھے۔ جس سے انگریز کے دل میں انکی طرف سے نفرت و عداوت پیدا ہو۔ اس کے لیے مسلمانوں کی کتنی ہی دل شکنی و دل آزاری ہو اسکی انھیں پرواہ نہ تھی۔ اسی لیے سنہ ۱۹۱۵ میں کانگریس نے اپنے بمبئی کے اجلاس میں جو تجاویز پاس کیں ان میں پانچویں تجویز انگریز سے وفاداری اور چھٹی تجویز میں برطانیہ اور اتحادیوں کو انصاف پرور کہتے ہوئے ان کے جہازی بیڑے کی کامیابی پر مبارکباد پیش کی جبکہ اس جہازی بیڑے کے بارہ میں مسلمان ہنگامہ کر رہے تھے، اسلئے کہ یہ جہازی بیڑہ ترکوں کو برباد کر رہا تھا اور اسی مخالفت کے سلسلہ میں مولانا محمد علی جوہر اور دوسرے مسلم لیڈر جیل میں تھے اور کانگریس اسکی کامیابی پر مبارکباد پیش کر رہی تھی۔

سنہ ۱۹۱۳ میں مسلم لیگ نے اپنا نصب العین ہندو مسلم اتحاد قرار دیا، لیکن کانگریس کے لیڈر اسکو اپنے لیے زہر سمجھتے تھے نتیجہ میں سنہ ۱۹۱۴ مظفرنگر، سنہ ۱۹۱۷ میں اعظم گڑھ اور سنہ ۱۹۱۸ میں کٹار پور (ہری دوار) میں فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعہ مسلمانوں کو روند ڈالا گیا۔ زندہ آگ میں جلادیا گیا۔ اسی سال دہلی میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں یونین جیک مسلمانوں کے قدموں میں تھا۔ ڈاکٹر انصاری نے اپنے خطبۂ صدارت میں کٹار پور کے اندوہ ناک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔۔۔

"بے جا نہ ہوگا اگر اس جگہ کٹار پور کے انڈہ ناک واقعات کاذ کر کیا جائے، جہاں ہندوؤں نے بے قصور اور صلح جو مسلمانوں کے ساتھ بغیر اشتعال کے وحشیانہ سلوک کیا ہے۔ ان ہولناک واقعات کو پڑھ کر مجھے جو صدمہ ہوا ہے وہ بیان سے باہر ہے ناراضگی اور غصہ کے جو جذبات سب کے دلوں میں ہیں انکا ذکر کرنے سے الفاظ قاصر ہیں۔ اس قسم کے واقعات دو نوں قوموں کے تعلقات خراب کرتے ہیں اور اس باہمی اتحاد کی بنیاد پر تیشہ چلاتے ہیں جس کے ہم سب آرزومند ہیں۔"

لیکن کانگریس کی تاریخ کے مصنف اور کانگریسی لیڈر اس واقعہ کو ہضم کر گئے وہ تو اس وقت ہر طرح سے انگریز کو طاقت پہونچانے میں لگے ہوئے تھے۔ تلک جی نے جولائی سنہ ۱۹۱۸ء میں گاندھی جی کو پچاس ہزار روپیہ کا ایک چک روانہ کرتے ہوئے لکھا۔۔۔۔

"اگر برطانیہ ہندستانیوں کو فوج میں اعلیٰ منصب عطا کرنے کا مہاتماجی سے صرف وعدہ کر لے تو میں پچاس ہزار سپاہی صرف مہاراشٹر سے دینے کا وعدہ کرتا ہوں اور اگر وعدہ پورا نہ کر سکوں تو پچاس ہزار کا یہ چک ضبط کر لیا جائے۔"

انھیں دنوں پنجاب میں ہونے والے مظالم کے خلاف گاندھی جی نہ صرف خاموش رہے بلکہ کانگریس سے بے تعلق تک ہو جانے کی دھمکی دی۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں پانچ برس کی نظربندی کے بعد مولانا محمد علی رہا ہوئے تو سیدھے امرتسر میں کانگریس و مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لیے پہونچے۔ وہاں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔۔۔۔

"میں کہتا ہوں اس آزادی کے لیے مسٹر تلک کو پھر جیل چلا جانا چاہئے۔ مجھے دوبارہ عمر بھر کے لیے نظربند ہونا چاہئے۔ مسز بیسنٹ کو پھانسی پر چڑھ جانا چاہئے۔ مگر اس قسم کے مظالم کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہونا چاہئے، جیسے کہ پنجاب میں ہوئے ہیں۔"

کلکتہ میں کانگریس کے مخصوص اجلاس منعقدہ ۹ / ستمبر سنہ ۱۹۲۰ء "ترک موالات" کی تجویز پاس ہوئی، لیکن دسمبر تک اسپر عمل نہ ہو سکا۔ ناگپور کے اجلاس میں اسپر آخری فیصلہ ہونا باقی تھا۔ جب دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگپور کا اجلاس شروع ہوا تو مسلمانوں کے جوش و عمل کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۴۵۸۲ ڈیلی گیٹوں میں ۱۰۵۰

مسلمان تھے۔ اگر چہ گاندھی جی کو مولانا محمد علی نے اسپر راضی کرلیا مگر سی- آر- داس اس کے شدید مخالف تھے۔ لیکن مولانا محمد علی کی تقریر کے بعد خود سی- آر- داس نے مولانا سے کہا...... "اب میں وکالت چھوڑ کر ترک موالات کے لیے کام کروں گا۔

" اضطراب ہند " میں شرل لکھتا ہے ...... " مسلمانان ہند کو انگریزوں کے خلاف بھڑکانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری علی برادران پر ہے۔ جنھوں نے کانگریس میں داخل ہو کر امن پسند ہندؤں میں جرأت کے عناصر پیدا کئے اور دوسری طرف مسلمان فوج کو بغاوت پر اکسایا۔"

مسلمانوں نے ہندووں سے دوستی اور ان کے ساتھ امن سے رہنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے اور انگریزی سامراج سے نجات حاصل کرنے کیلئے ہر قسم کی قربانی دی۔ خلافت تحریک کے زمانہ میں انکی ہر ممکن دلجوئی کی اور ایک متحدہ قومیت پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن اتحاد کی یہ ساری کوششیں پانی کے بلبلہ کی طرح ٹوٹ گئیں جامع مسجد دہلی کے منبر سے شردھانند سے تقریر کروائی گئی، ایک ڈولی میں قرآن اور گیتا رکھ کر جلوس نکالا گیا۔ مسلمانوں نے قشقے لگائے۔ حضرت موسٰی علیہ السلام اور کرشن جی میں مماثلت پیدا کی گئی گاندھی جی کو "امام الہند" کہا گیا۔ خان عبدالغفار نے کراچی کے ایک مندر میں کانگریس کا جھنڈا لہرانے کی رسم ادا کی۔ گائے کی قربانی سے مسلمانوں کو روکنے کے فتوے اونٹوں پر بیٹھ کر تقسیم کئے گئے۔ لیکن اس کے بعد بھی کفرو اسلام باہم شیرو شکر نہ ہوسکے۔

خلافت تحریک سے انگریز پریشان تھے۔ تو دوسری طرف کانگریس کے ہندو لیڈروں نے اپنی غلطی کا احساس کرلیا تھا، انھیں دنوں لندن میں ایک کارٹون چھپا۔ جس میں دنیا کا نقشہ بنا کر قسطنطنیہ سے ایک تیر پھینکا گیا جو سیدھا دہلی پر آکر لگا اور یہ بتایا گیا کہ ترکی فوجیں یلغار کرتی ہوئی کسی وقت بھی دہلی پہونچ سکتی ہیں اور ہندستانی مسلمان انکی مدد کریں گے۔ دوسری طرف ہندستان میں شاہ افغانستان کی بے بنیاد تقریر کسی اخبار میں چھپی کہ افغانستان میں وہاں کی آبادی اور گھوڑوں کے لیے چارے کی کمی ہے اسلئے ہمیں

دوسری طرف نظر ڈالنا پڑے گی۔

درۂ خیبر کا پرانا نقشہ پنڈت مالویہ اور گاندھی جی کی نگاہوں کے سامنے آ گیا خوف زدہ دلوں میں دہشت کی لکیریں رینگنے لگیں۔ گاندھی جی خود مسلمانوں کی تیز رفتاری سے گھبرا رہے تھے۔ سنہ ۱۹۲۳ء کے بمبئی اجلاس میں جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے مسلمان لیڈر جیل میں تھے گاندھی جی کی ایماء سے آل پارٹیز کانفرنس میں اس تحریک کو دبا دینے کی سازش کر لی گئی۔

مولانا حسرت موہانی نے جب احمد آباد میں مکمل آزادی کا رزولیوشن پیش کیا تو گاندھی جی نے کہا...... "حسرت صاحب ہمکو اتنے گہرے پانی مین لیے جا رہے ہیں جس کی گہرائی کا ہمیں اندازہ نہیں۔"

اس رزولیوشن کے بعد پنڈت مالویہ اور گاندھی جی نے مسلمانوں کے معاملہ میں بڑی احتیاط سے کام لینا شروع کر دیا۔ بمبئی کے اجلاس میں سازش تیار ہو چکی تھی کہ ۵/ فروری سنہ ۱۹۲۲ء کو گورکھپور کے قریب "چورا چوری" کے مقام پر پولیس کے ظلم کے خلاف ایک جلوس نے تھانہ میں گھس کر آگ لگا دی جس میں اکیس سپاہی اور ایک سب انسپکٹر ہلاک ہو گئے۔ بس اس واقعہ کو بہانہ بنا کر گاندھی جی نے "بردولی" کے مقام پر ۱۲/ فروری سنہ ۱۹۲۲ء کو تحریک خلافت کو ٹھپ کرنے کا اعلان کر دیا۔ جلسہ، جلوس اور جیل جانے کے سارے پروگرام روک دیئے گئے۔

حسرت موہانی اس تحریک کے سلسلہ میں گاندھی جی کے بارنے میں پہلے ہی کہہ چکے تھے..... "یہ شخص درمیاں میں لے جا کر کشتی ڈبو دے گا۔"

جب جیل میں یہ خبریں پہونچیں تو جیل سے مسلمان لیڈروں نے خطوط لکھے۔ جو ۲۴/ فروری سنہ ۱۹۲۲ء کو باضابطہ اجلاس میں ڈاکٹر انصاری کے مکان پر پڑھے گئے۔ اس کے جواب میں گاندھی جی نے کہا..... "جو لوگ جیل جا چکے ہیں وہ سول حیثیت سے مردہ ہیں۔ اور باہر والوں کو مشورہ دینے کا انھیں کوئی حق نہیں ہے۔"

شدھی تحریک یعنی مسلمانوں کو پھر سے ہندو بنا دینا

اسی زمانہ میں شدھی تحریک تیزی سے شروع کر دی گئی۔ شردھا نند نے راجپوتانہ میں زور و شور سے اس تحریک کو شروع کر دیا۔ جس پر پنڈت موتی لال نہرو اور گاندھی جی خاموش رہے۔

مسلمانوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے جو کام کیا تھا اسے ان لیڈروں نے برباد کرنا شروع کر دیا اور ترک موالات و عدم اعتماد کی جگہ شدھی اور ہندو سنگٹھن کی تحریکیں شروع کر دی گئیں۔ مسلمانوں کو پھر ملکش قرار دیدیا گیا۔ جس میں سوامی شردھا نند، لالہ لاجپت رائے اور مالویہ جی آگے آگے تھے۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں کو ختم کر کے مکہ میں خانہ کعبہ پر "اوم" کا جھنڈا گاڑ دیا جائے۔ اسلئے کہ ہندوں کا عقیدہ ہے کہ اصلی "شیولنگ" خانہ کعبہ میں ہے جسے مسلمان حجر اسود کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "جس دن کوئی ایسا ہندو جس نے انڈا، مچھلی اور گوشت نہ کھایا ہو حجر اسود پر گنگا کا پانی ڈالنے میں کامیاب ہو جائے گا اسی دن حجاز تک ہندووں کی حکومت ہو جائے گی، بعض ہندو اپنی رانوں کو چیر کر گوشت کے اندر شیشیوں میں گنگا جل لیکر گئے مگر مسلمان چونکہ اس کی خدمت گزاری میں ہر وقت لگے رہتے ہیں اسلئے وہ انھیں بتا دیتے ہیں کہ اسطرح کا ایک آدمی آرہا ہے مجھے اس سے بچاؤ اور دھوکہ سے کوئی مسلمان اسے انڈا یا مچھلی کھلا دیتا ہے اور اسکا اثر جاتا رہتا ہے۔" اسطرح پوری ہندو قوم کا یہ عقیدہ ہے کہ اصل شیولنگ، حجر اسود ہی ہے اسلئے وہاں تک ہندووں کا قبضہ ہونا چاہئے۔ کروڑوں سینوں میں یہ جذبہ پرورش پا رہا ہے۔ اور یہ جذبہ اسرائیلی جذبہ سے مختلف نہیں ہے۔ دونوں کی نگاہیں خانہ کعبہ پر ہیں۔ جیسے وہ مکیشور دیوتا کہتے ہیں مکہ کے بجائے۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں اس تحریک کے لیڈروں نے ایک خواب دیکھا جس کے تحت اس تحریک کے ایک لیڈر چاند کرن نے ہندووں کو مخاطب کر کے کہا ..... "ان سے (مہتروں سے) چھوت چھات نہ کی جائے کیونکہ کل یا پرسوں تمھارے جگدیش جی کی سواری نکلے گی۔ یہ لوگ تمھارے جلوس کے ساتھ رہیں گے۔ تو تم لوگوں کا ایک ہزار لوگوں کو

ہندستان میں صفائی کرنے والے جنھیں اب بالمکی کہتے ہیں یہ ہریجنوں کا ایک گروپ ہے۔

مارنا کارگر نہ ہوگا لیکن ان کا بیس آدمیوں کو مار لینا کارگر ہوگا اور تمام ہندستان میں نام ہو جائے گا کہ مسلمانوں کو بھنگیوں نے مارا۔ اور بھائیو! مسلمان تو ساڑھے سات کروڑ ہیں تم بائیس کروڑ ہو جیسے پسو کو مسل دیتے ہیں، ویسے انھیں مسل سکتے ہو۔" یہ تقریر انھوں نے شیو باغ اجمیر میں کی جہاں خواجہ معین الدین چشتی نے پیار و محبت باہمی بھائی چارہ کادرس دیا تھا۔ اس شدھی تحریک نے ہر جگہ فسادات کی شکل اختیار کرلی۔ کوہاٹ بھی اس کی لپیٹ میں آگیا۔ مولانا شوکت علی اور گاندھی جی نے کوہاٹ کا دورہ کیا۔ گاندھی جی نے ۲۹ / مئی سنہ ۱۹۲۴ء کو مسلمانوں کو ملزم ٹھہراتے ہوئے کہا ــــ "مسلمان دنگئی (فسادی) ہیں اور ہندو بزدل۔"

اس زمانہ میں شدھی سنگھٹن کے لیڈر شردھانند، مالویہ جی اور ڈاکٹر مونجے سے گاندھی جی کی عقیدت بڑھ چکی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں نے امرتسر پراونشیل کانگریس کے موقع پر مالویہ جی کی مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز پالیسی کی شکایت کی تو گاندھی جی نے کہا ــــ "تم نے آج میرے سینہ پر گھونسا مار دیا۔"

شردھانند کے قتل پر گاندھی جی نے ان کی یادگار قائم کرنے کے لیے دس لاکھ روپیہ کی اپیل کی۔ پنڈت نہرو نے انھیں "شہید قوم" اور ان کے قاتل کو مذہبی دیوانہ کہا۔

سنہ ۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ــــ "مہاتما جی نے کوہاٹ کے تنازع کی خبر سنتے ہی ہم سے خاص طور پر خطاب کرتے ہوئے ظاہر کردیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو ظالم اور ہندؤں کو مظلوم سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد تو انھوں نے ہندو مسلم تنازعات اور مناقشات کو چکانے کا کام ہی بند کردیا اور جب کبھی ان سے ہم دونوں بھائیوں، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر محمود یا کسی نے اس بارہ میں عرض کیا تو انھوں نے اس میں حصہ لینے سے انکار کردیا اور اس کام کو کلیتہً خدا ہی پر چھوڑ دیا۔

اسمبلی میں جب سرحد کی اصلاح کا مسئلہ پیش ہوا تو موتی لال نہرو اور انکی پارٹی نے مخالفت میں ووٹ دیا۔ اسپر مولانا محمد علی نے کہا ــــ "میرا ان (موتی لال) کا سارا اختلاف اس باعث سے ہے کہ اوّل تو انھوں نے مہاتما گاندھی کی مخالفت کی، قید کے زمانہ میں ان کے خلاف

بغاوت کی اور کانگریس کے دو ٹکڑے کر ڈالے دوسرے انھوں نے ایک باغی لاجپت رائے کی امداد حاصل کرنے کی امید پر صوبہ سرحد اور سوراج پارٹی دونوں کے مسلمانوں کی حق تلفی کو گوارہ کیا اور حق پر ثابت قدم نہ رہے۔"

چنانچہ اپنے اخبار ہمدرد میں انھوں نے لکھا ــــ "پنڈت موتی لال نہرو جو اپنے سوا ایک دیوتا یا دیوی کی پرستش کرتے ہیں اور اسکا نام "اکثریت" ہے۔ اور جو لالہ لاجپت رائے کو سوراج پارٹی کے رشتہ میں مربوط کرنے کی غرض سے صوبہ سرحد کو اصلاحات دیئے جانے کی مخالفت کر چکے تھے کہ وہ پنجاب میں مدغم ہو کر اپنی ۹۳ فی صد مسلم اکثریت کو تقریبا ضائع کر دے۔ انتخاب کے زمانہ میں ان سے (مولانا) ہرگز توقع نہ رکھنی چاہیئے کہ ہندو مہاسبھا اور اسکی نازیبا حرکات کی وہ مخالفت نہ کریں گے۔"

سنہ ۱۹۲۷ء میں ایک واقعہ اور پیش آیا۔ ایک شخص راجپال نے "رنگیلا رسول" نامی کتاب لکھی، مگر جسٹس دلیپ سنگھ نے اسے بری کر دیا۔ کانگریس کے ہندو لیڈروں نے راج پال کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ گاندھی جی خاموش تھے پنڈت موتی لال سے پریس والوں نے راجپال سے متعلق فیصلہ کے بارہ میں پوچھا بھی مگر انھوں نے کچھ کہنے سے انکار کر دیا۔ کانگریس کی لیڈر شپ نے مسلمانوں کے دلوں کو نوچنے اور مجروح کرنے والے راجپال کی یاد کو تازہ رکھنے کیلئے ہر صوبہ میں آزادی کے بعد راجپال مقرر کر دئے، بجائے گورنر کے۔

مالویہ جی اور ڈاکٹر مونجے کی مسلمانوں کے خلاف دلخراش پالیسی پر جنوری سنہ ۱۹۲۹ء کے "ہمدرد" میں "روداد چمن" کے عنوان سے لکھا ــــ "مجھے معلوم نہ تھا کہ مہاتماجی، تارکین تعاون، سوراجی، جوابی تعاون والے اور وہ لبرل جنھوں نے حکومت کے ساتھ تعاون کرکے تارکین تعاون کو معہ مہاتماجی جیل بھجوایا تھا، سب، ڈومینین اسٹیٹس اور ہندو مہاسبھائیت پر راضی ہو جائیں گے اور وطن دوست و حامیان اتحاد کہلائیں گے اور سارے ہندستان میں اگر کوئی تفرقہ پرور، اتحاد دشمن اور وطن کے خلاف غدار ہوگا تو اسکا نام شوکت علی ہوگا یا محمد علی۔"

مولانا محمد علی ہندو مسلم اتحاد میں اتنا آگے نکل چکے تھے کہ انھوں نے یونٹی کانفرنس منعقدہ دہلی میں کہا ـــــ "اگر کوئی ہندو میری بیوی کی بے عزتی کرے، تب بھی میں اس پر ہاتھ نہ اٹھاؤں گا، میری ماں کو قتل کرے تب بھی عدالت میں مقدمہ نہ لے جاؤں گا۔"

مولانا بہرحال انسان تھے فرشتہ نہیں بالآخر اپنے ساتھیوں کے طرز عمل سے بوکھلا کر وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ـــــ "یقیناً ہندو جاتی (قوم) سارے عالم میں اپنی تنگ نظری میں نمایاں ہے۔ دنیا بھر میں کسی ملت نے خود اس تنگ نظری کا ثبوت نہیں دیا ہے کہ خود اپنے ہی فرقوں کو اچھوت سمجھا کر صدیوں سے سب ہندو ایک دوسرے کو بیٹی دے سکتے ہیں نہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر روٹی کھا سکتے ہیں۔ اور یہ ہی نہیں بلکہ سب ہنود ایک مندر (عبادت گاہ) تک میں یکجا نہیں ہو سکتے نہ سب جگہ سب کے لیے عام سڑکیں کھلی ہوئی ہیں، جو جاتی اس درجہ خود غرضی کا شکار ہو اس پر دوسری ملتیں کس طرح اعتماد کر سکتی ہیں۔ جداگانہ حلقہ انتخاب اسقدر فرقہ بندی کا سبب نہیں بنے جس قدر ہنود کی فرقہ بندی اسکا سبب بنی ہے۔"

جس طرح مولانا محمد علی گاندھی جی کو سچا رفیق سمجھتے تھے اسی طرح جناب محمد علی جناح پنڈت نہرو کو ایک قابل اعتماد دوست گردانتے تھے۔ ۱۳ / اگست سنہ ۱۹۳۶ کو لکھنو میں طلباء کی فیڈریشن کو خطاب کرتے ہوئے، جسکا افتتاح پنڈت نہرو اور صدارت قائداعظم کر رہے تھے۔ انھوں نے پنڈت نہرو کے بارے میں کہا ـــــ "انکی صداقت، ایمانداری اور ملکی ہمدردی لاجواب ہے اور نہرو سے زیادہ سچا اور وفادار دوست کوئی نہیں۔"

لیکن جلد ہی حالات کا رخ بدلنے لگا۔ مدراس میں الکشن میں کامیابی کے بعد پنڈت نہرو نے کہا ـــــ "ملک میں صرف دو جماعتیں ہیں کانگریس اور گورنمنٹ۔"

قائداعظم نے اس کے جواب میں کہا ـــــ "تیسری جماعت مسلم لیگ بھی ہے۔"

کلکتہ میں اس کے جواب میں پنڈت نہرو بولے ـــــ "تیسری جماعت کو کسی ایک جماعت میں ضم ہو جانا چاہئے۔"

اس گفتگو کے پس منظر میں ایک بار پھر دس سال پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ سنہ ۱۹۱۵ء میں تھوڑی مدت کے لیے ہندو مسلمان شیروشکر ہو گئے۔ مسلم لیگ کے اجلاس میں کانگریس کے لیڈروں کے صدر نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے بھی اس قسم کے اتحاد کو ضروری قرار دیا۔ اپریل سنہ ۱۹۱۶ء میں پنڈت موتی لال نہرو کے یہاں اس مسئلہ پر مزید بات ہوئی اور اسی سال کانگریس اور مسلم لیگ کا مشترکہ اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ اس اجلاس میں ہونے والا معاہدہ "میثاق لکھنؤ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدہ کے ذریعہ مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی حیثیت کو تسلیم کرکے متناسب نمایندگی کا مسئلہ حل کر دیا گیا۔ دراصل یہ معاہدہ قومی جذبہ کی ابھرتی ہوئی قوت کا مظاہرہ تھا جس سے انگریزی حکومت بڑی مشکل میں پھنس گئی تھی۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں دہلی میں اس معاہدہ کی توثیق دہلی تجاویز کے نام سے کردی گئی اور مستقل حل کے لیے آل پارٹیز کانفرنس بلائی گئی جسکی صدارت پنڈت موتی لال نہرو کر رہے تھے۔ موتی لال نہرو نے اپنی رپوٹ کے ذریعہ جو "نہرو رپورٹ" کے نام سے بدنام ہوئی سنہ ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ معاہدہ کے ذریعہ دی جانے والی ساری مراعات کو ختم کئے جانے کی سفارش کردی۔ اور دلیل یہ دی کہ اس سے دوسرے فرقوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی مسلمانوں کیلئے محفوظ نشستوں کا مطالبہ بھی رد کر دیا۔ اس رپورٹ میں انتظام حکومت میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں رکھا گیا۔ انکی زبان، تہذیب، تمدن اور مذہبی حقوق سب کو پیروں تلے روند دیا گیا۔ اس رپورٹ نے ہندستان کے اندر مسلمانوں کے سیاسی وجود کو خطرہ میں ڈالدیا۔

اسطرح معاہدہ لکھنؤ کو یک طرفہ طور پر توڑ دیا گیا۔ حکیم اجمل خاں صاحب نے جنھیں کوئی فرقہ پرست نہیں کہہ سکتا، اس رپورٹ کی مخالفت کی جو اسوقت گاندھی جی سے بھی بڑے لیڈر تھے،..... انھوں نے کہا..... "اگر اس رپورٹ پر عمل ہوا تو مسلمان اپنی موجودہ حالت سے بھی گر جائیں گے رپورٹ میں اردو کے لیے نہ تو کوئی ضمانت ہے اور مسلمانوں کے تمدن سے اس رپورٹ میں پوری طرح انکار کر دیا گیا ہے۔"

انگریزی حکومت کی یہ ایک ضرورت تھی کہ ہندو اور مسلمانوں کا سیاسی اتحاد قائم نہ ہونے پائے اگر ایسا ہوا تو برٹش حکومت بہت جلد ختم ہو جائے گی، ہندستان میں انگریزی حکومت کی بنیادیں اسی وقت قائم رہ سکتی تھیں، جب اتحاد کی اس عمارت کو گرا دیا جائے جو مسلمان صوفیوں اور شیرشاہ سوری شہنشاہ ہندستان کی خدمات کا نتیجہ تھی۔

اس کے لیے انگریزی حکومت نے ہندستان کے مختلف فرقوں کے درمیان موجود معاشی، تعلیمی اور تمدنی توازن کو بگاڑنا شروع کیا۔ بنگال کے ہزاروں مکاتب کو بند کر دیا گیا۔ اسلامی نظام اوقاف کی سنہ ۱۸۳۸ء میں کمپنی کے عہد میں ضبطی عمل میں آ گئی۔ اسطرح توازن کو بگاڑ کر مسلمانوں کو بے دست و پا کر دیا گیا جس کی وجہ سے مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کا مطالبہ کرنے لگا۔ اقلیت کا مسئلہ ہندستان میں پیدا ہی نہ ہوتا اگر یہاں مختلف طبقوں کی آبادی کی رفتار ترقی برابر جاری رہتی۔ نہ کوئی آگے بڑھایا جاتا نہ کسی کو پیچھے ڈھکیلا جاتا مگر انگریزی پالیسی نے ایک طبقہ کو آگے بڑھا کر دوسرے کے خلاف کھڑا کر کے یہ مسئلہ پیدا کر دیا۔

رزق کے دروازے مسلمانوں پر بند کر دئے گئے۔ ملت اسلامیہ اقتصادی بحران کا شکار ہونے لگی۔ جس وقت مسلمان انگریزوں کے خلاف آزادی کے لیے جنگ کر رہے تھے اور اپنے گھروں کو برباد کر رہے اسوقت ملک کے دوسرے لوگ تماشہ دیکھ رہے تھے یا دست تعاون بڑھا کر انگریزی حکومت کو مضبوط کر رہے تھے۔

مسلمان نتیجہ میں مفلسی کا شکار ہو گئے۔ مسلمانوں کا تعلیمی نظام میٹ دیا گیا ملازمتوں کے دروازے ان پر بند کر دئے گئے، ہندؤں کا ملازمتوں پر قبضہ ہو گیا اور مسلمان بہت پیچھے ڈھکیل دئے گئے، شروع میں مسلمان انگریزی تعلیم سے دور رہے اسلئے کہ برٹش نظام تعلیم انکی روایات کے خلاف تھا۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلیمی توازن بگڑ گیا تو اقتصادی توازن کا بگڑنا لازمی تھا۔ ہر انتظامی اور قانونی تبدیلی مسلمانوں پر ضرب کاری تھی۔ بغیر سیاسی وقار، بغیر تعلیم اور معاشی وسائل کے بغیر مسلمانوں کو انگریزوں نے ہندو اکثریت کے مقابلہ کے لیے چھوڑ دیا۔ اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان برباد

ہو گئے۔ اور برطانوی سامراج نے مسلمانوں کو اپنے بعد اکثریت کا غلام بنانے کی سازش مکمل کرلی۔ لیکن سنہ ۱۹۴۷ء تک جو حالات بنے ان میں آدھے مسلمانوں کو تو نجات مل گئی لیکن آزاد ہندستان کا پچیس کروڑ مسلمان، جمہوریت، سیکولرازم اور بقائے باہم کے نام نہاد دعوے کے باوجود عملاً غلاموں سے بھی بد تر زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ عام مسلمانوں کی زندگی سینما پر چلتی ہوئی متحرک تصویروں سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے!

فوج کی ملازمتیں مسلمانوں کے لیے بند ہو گئیں۔ سیول اور عدلیہ سے انھیں بید خل کر دیا گیا۔ اکثریتی فرقہ ملازمتوں اور سرکاری ملازمتوں پر انگریز کے زمانہ سے حاوی ہونا شروع ہوا تھا آزادی کے بعد اسکا پورا غلبہ ہو گیا۔ انگریز کے درمیانی زمانہ میں مسلمان چپراسی اور قلی ہوسکتا تھا آزادی کے بعد اس کے دروازے بھی اس کے لیے بند کر دئے گئے۔

انگریز کے زمانہ میں مسلمانوں سے ملازمتیں چھین لینے کا جو رجحان پیدا ہوا تھا آزادی کے بعد اسکی تکمیل ہو گئی۔ ملازمتوں سے بید خلی کے بعد تجارت میں بھی رفتہ رفتہ بے حیثیت کر دئے گئے۔ اس طرح مسلمان مفلسی اور ذلّت کے مقام پر پہونچا دئے گئے۔ اگر آپ پورے ملک میں گھومیں تو مسلمانوں اور دوسروں کی زندگی کا فرق سامنے آجائے گا۔ بد نصیبی مسلمانوں کا مقدر بنا دی گئی، کچہریوں میں حکومت کی کرسیوں پر ہر جگہ اکثریتی فرقہ کا ڈنکا بجنے لگا۔ ہر عزت کی جگہ پر وہ لوگ اور عزت کی جگہ سے دور اور ترقی کے ذرائع سے محروم مسلمان قرار دے دئے گئے۔ غرض یہ کہ برطانوی حکومت کے زمانہ میں مسلمان بری طرح برباد کئے گئے تھے تو آج تک انھیں سر اٹھانے کا موقع نہیں دیا گیا بلکہ جہاں کہیں اٹھنے کی کوشش کی بری طرح ان کو کچل دیا گیا...... فرقہ وارانہ فسادات کا بہانا بنا کر۔

سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ 1918ء تک کا زمانہ برٹش حکومت کے لیے خطرناک زمانہ تھا۔ جنگ چھڑ چکی تھی۔ غلام ہندستان جنگ میں انگریزوں کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ ایسی حالت میں ہندستانی سیاست میں فرقہ واریت کا بیج بو کر منٹو اور مارلے نے قومی تحریک کو

ہندو مسلم کا رُخ دیکر لڑائی جیت لی۔ اس میں کانگریس کے ہندو لیڈر آلہ کار بنے رہے۔ اب انگریزوں نے مسلمانوں سے ہمدردی جتانا شروع کی اور مسلمانوں کو حکومت میں ذمہ دار جگہیں دینے کی حمایت کی۔ پچاس برسوں تک مسلمانوں کو کچلے جانے کے بعد آگے بڑھانے پر بجائے اس کے کہ ہندو لیڈر یہ کہتے کہ ہمارے جن ہم وطنوں سے ابتک ناانصافی کی گئی تھی انھیں انصاف مل رہا ہے جو لائق مسرت و شادمانی ہے۔ لیکن اسکا ردعمل یہ ہوا کہ تلک جیسے سنجیدہ لیڈر مرہٹوں کو منظم کرنے لگے اور یہ نعرے بھی سنائی دینے لگے کہ جس طرح اسپین سے مسلمانوں کو نکالا گیا ہے ہندستان سے بھی نکال دیا جائیگا ہے۔ یہ نعرہ لگانے والوں نے یہ نہیں سوچا کہ اسپین سے مسلمانوں کے نکلنے کے بعد اسپین کا کیا حشر ہوا؟ اور آج تقریبًا تین سو ستر سال بیت جانے کے بعد بھی اسپین دنیا کے نقشہ پر اپنا علمی، سیاسی اور تمدنی تشخص بحال نہیں کر پایا اور جو کچھ مسلمانوں نے یورپ میں علم کی روشنی اسپین کی راہ سے پھیلائی تھی اسے اپنے ہاتھوں برباد کر بیٹھا۔ ساری دنیا کی قوموں کو یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ اہل اسلام ایک روشنی ہیں جن سے ہر روشنی میں روشنی پیدا ہوتی ہے اگر کبھی ہندستان کے مسلمانوں کو اسپین کے مسلمانوں کی طرح وطن سے بیدخل کر دیا گیا تو خود ہندستان کا حشر اسپین سے بھی بدتر ہوگا اور یہ ایسی تاریکی میں چلا جائے گا جہاں سے اسکا نکلنا بہت مشکل ہوگا۔

سنہ ۱۹۲۸ تک جو مسئلہ اقلیت کی بنیاد پر چلتا رہا۔ نہرو رپورٹ کے بعد اس میں تھوڑی سی تبدیلی آئی اور سنہ ۱۹۳۰ میں مسلم لیگ نے اپنے الٰہ آباد کے اجلاس میں جس کی صدارت علامہ اقبال فرما رہے تھے ہندستان کے اندر اسلامی ریاست کی مانگ رکھدی۔

اقلیتی مسائل:- ہندستان میں اقلیتی مسائل کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے انگریزی حکومت کے قیام سے انیسویں صدی کے آخر تک۔ اس عہد میں مختلف فرقوں کے درمیان پایا جانے والا اقتصادی توازن بگڑا گیا۔ دوسرے فرقوں کو اسکا احساس کم ہوا

لیکن مسلمانوں نے متصل حکمرانی کی گود میں رہنے کی وجہ سے پوری شدت سے محسوس کیا۔

دوسرا دور سنہ ۱۹۰۵ء سے سنہ ۱۹۳۰ء تک تقسیم بنگال اور اسکی تنسیخ۔ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمایندہ جماعت کی حیثیت سے تسلیم کیا جانا اور جداگانہ انتخابات کی منظوری اسی دور میں اصلاحات شروع کی گئیں۔ مسلمانوں کو جداگانہ انتخابات کیلئے دستور میں جگہ دی گئی۔ اس کے بعد دیگر اقلیتوں، پست اقوام، دلت ورگ، پارسی اور اینگلو انڈین نے اپنے حقوق کی آواز اٹھائی۔ اور اسی دور میں انگریزی حکومت کے اشارے پر ہندؤں کی قومی تحریکوں نے اقلیتوں کے شکوک کو یقین میں بدلنے کا کام کیا۔ کانگریس جو سب کی نمایندگی کی دعوے دار تھی ان تحریکوں کی نہ صرف خاموش تماشائی رہی بلکہ ان تحریکوں کے لیڈروں سے گاندھی جی کے روابط گہرے ہوتے چلے گئے۔ اس طرح مسلمانوں کے شکوک کی ساری ذمہ داری کانگریس ہی پر آتی ہے اسلئے کہ یہ مسلمانوں کو اپنے اعتماد میں لینے سے ہمیشہ قاصر رہی۔

تیسرا دور سنہ ۱۹۳۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مسلم لیگ نے تنگ آکر اقلیت کے دائرہ سے چھلانگ لگاکر مسلمانوں کو الگ قوم قرار دئے جانے کا نعرہ دے دیا۔ اس طرح ہندستان کی سیاست میں دو قومی نظریہ کی بنیاد پڑی۔ پست اقوام اور مرہٹوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ سنہ ۱۹۴۲ء کی تحریک میں مسلم لیگ اور پست اقوام نے حصہ نہیں لیا۔ اسلئے کہ وہ آزادی سے پہلے اپنے حقوق کا تحفظ چاہتی تھیں۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے اجلاس میں ہندستان کے اندر اسلامی ریاست کی مانگ کے باوجود ۲۷/ مارچ سنہ ۱۹۳۷ء میں یو۔ پی مسلم لیگ نے ایک تجویز کے ذریعہ کانگریس سے قربت کی کوشش کی۔ اس تجویز کے ذریعہ یہ طے ہوا۔

مسلم لیگ اسمبلی میں کانگریس کے ہر مفید پروگرام کی تائید کرے گی۔

کانگریس نے لیگ کے سامنے چھ شرائط رکھیں۔

(۱) مسلم لیگ ایک علاحدہ اور مستقل جماعت کی حیثیت سے ختم ہو جائے۔

(۲) مسلم لیگ کے ممبر کانگریس میں شامل ہوجائیں اور مسلم لیگ کانگریس میں ضم ہوجائے گی۔

(۳) کانگریس ورکنگ کمیٹی کی پالیسی اور احکام و ہدایات کی تمام ممبر پیروی کریں گے۔

(۴) مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ توڑ دیا جائے گا اور آئندہ انتخابات میں لیگ اپنا کوئی نمایندہ کھڑا نہیں کرے گی۔ بلکہ تمام ممبر جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے ہیں۔ آئندہ کانگریس کے امیدواروں کی تائید کیا کریں گے۔

(۵) کانگریس کے ضوابط کی بھی پابندی کریں گے۔

(٦) اگر کانگریس پارٹی اسمبلی سے استعفا دینے کا فیصلہ کرے تو تمام مسلمان ممبر بھی اس حکم پر استعفا دیدیں گے۔

مسلم لیگ نے کانگریس کی ان شرائط کو دونوں قوموں کے درمیان اتحاد کی خاطر تسلیم کرلیا۔ لیکن ایک "شرط" کے ساتھ۔ کہ جہاں تک کمیونل اوارڈ، زبان، اور مذہب کا تعلق ہے۔ مسلم لیگ کے ممبر آزادی کے ساتھ بحث میں حصہ لیں گے۔ اور بحیثیت جماعت رائے دے سکیں گے۔

یو۔ پی مسلم لیگ کے لیڈروں نے سب کچھ چھوڑ کر بنیادی بات رکھ دی تھی اور کانگریس کی ہندو لیڈر شپ اتنی وسیع القلب اور وسیع النظر نہ تھی جو اس بات کو مان لیتی اسلئے کہ انکا سارا جھگڑا ہی اسلامی اقدار سے تھا۔ پھر پنڈت جواہر لال نہرو دو سال پہلے سنہ ۱۹۳۵ء میں اپنے عہد صدارت میں پنجاب میں ایک تقریر کے دوران کہہ چکے تھے ــــ "میں مسلمانوں کا سو سال تک انتظار کرسکتا ہوں بمقابلہ اس کے کہ ان کو رشوت دی جائے۔"

پنڈت نہرو نے اپنے مزاج کے عین مطابق یو۔ پی مسلم لیگ کی اس شرط کو رد کردیا اور اپنے سینئر لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے کو بھی وزن نہیں دیا جس کا ذکر انھوں نے بڑے دکھ کے ساتھ اپنی کتاب "ہندستان نے آزادی جیت لی" میں کیا ہے۔

کانگریس نے مسلم لیگ کی الگ حیثیت تسلیم کر کے اور اسے مسلمانوں کی نمایندہ جماعت مان کر بھی اپنی کتر بیونت کی پالیسی جاری رکھی۔ جسکا اظہار کانگریس مجلس عاملہ کے ایک رکن ڈاکٹر پٹابھے سیتارامیہ کے اس بیان سے ہوتا ہے..... "یہ ایک مشتبہ بات ہے کہ مسٹر جناح اسی طرح مسلمانوں کی طرف سے بولنے کا حق رکھتے ہیں، جس طرح مہاتما گاندھی پوری ہندستانی قوم کی طرف سے بول سکتے ہیں۔ کل اپنے جزو پر آپ سے آپ حاوی ہے۔ مہاتما گاندھی کل کے نمایندہ ہیں اسلئے وہ اس جز کے مفاد کا بھی تحفظ کرنے کا حق رکھتے ہیں جس کی نمایندگی مسٹر جناح کر رہے ہیں۔"

درخت ہمیشہ اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں وزارت بنتے ہی کانگریس نے کچھوے کی طرح اپنے اندرونی پر نکالنا شروع کر دئے۔ اسلئے کہ یہ سرکار مسلم کشی میں انگریزی سرکار سے پیچھے نہیں رہنا چاہتی تھی۔ ہندستان کی تحریک آزادی کے چوٹی کے لیڈر مولانا حسرت موہانی کی نقل و حرکت کی نگرانی شروع کر دی گئی۔ مسلم اخبارات پر کلہاڑی چلنے لگی۔ کچھ اخباروں کے ایڈیٹر گرفتار کر لیے گئے۔ کچھ سے ضمانتیں طلب کر لی گئیں۔

یو۔ پی کی کانگریسی سرکار نے ایک سرکلر کے ذریعہ حکم نامہ جاری کیا..... "مقامی حکام ضلع کانگریس کمیٹیوں سے مقامی معاملات پر مشورہ کریں اور ان پر اعتماد کریں۔"

اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ ذاتی عداوتوں کی بنیاد پر مسلمانوں کی جائیداد اور املاک کو ضلع انتظامیہ کی مدد سے برباد کیا جانے لگا۔ فسادات کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ گورکھپور، بلیا، دیوریا، سیتاپور، میرٹھ اور فیض آباد وغیرہ میں فسادات میں عورتوں اور بچوں کا قتل ہوا، کہیں مسلمانوں کے جانوروں پر قبضہ کر لیا گیا، کہیں قربانی کرنے سے روکا گیا، کہیں قصاب پر حملے ہوئے اور ان کے کاروبار میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں، کہیں مسلمانوں کی کھیتیاں اجاڑ دی گئیں، کہیں توہین آمیز کتابیں پیغمبر اسلام کی شان میں چھاپی جانے لگیں اور مسلمانوں کو مساجد سے گرفتار کر کے داڑھیاں نوچی گئیں اور ان کے منہ میں سور کا گوشت ٹھونسا گیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ شرم و حیا کے سارے پردے اٹھا دئے گئے۔

حکمرانی کے چراغوں کو جلا کر دل بجھائے جانے لگے، حنا بندی کی آڑ میں خون کے دریا بہائے جانے لگے، رام اور کرشن کا نام لینے والے کنس اور راون کا روپ لیکر مسلمانوں کی عزت و آبرو سے کھیلنے لگے۔

یہ جو کچھ ہوا اسکو اسوقت کے اخبارات میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ سب اچانک نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے پیچھے ایک ذہن تھا، ایک فکر تھی۔ اسلئے کہ پنڈت جواہرلال نہرو اپنی کتاب "میری کہانی میں" کہتے ہیں..... "دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت اقلیت کو ڈرا اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے۔"

پنڈت نہرو کا واسطہ یورپ کی لسانی اقلیتوں سے پڑا تھا۔ مسلمان اقلیت اور اس کے ذہنی و تاریخی پس منظر سے وہ واقف نہیں تھے۔ جہاں کتنی ہی چھوٹی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں۔

ہندو لیڈروں کے انھی نشتروں، گالیوں، نفرت، خوف، تنگدلی اور غیر روادارانہ نظریات و بیانات اور برتاؤ نے ہندستان کی وحدت کے لیے مسلمانوں کی طرف سے کئے جانے والے سارے اقدامات کو ناکام بنا کر رکھدیا۔ اور ملک کو تقسیم کے کنارے لاکر کھڑا کردیا، جس کے نتیجہ میں مغرب میں پنجاب اور مشرق میں بنگال کو تقسیم کر کے، کانگریس نے تقسیم ملک کا نعرہ بلند کردیا تاکہ دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کی آواز کو دبا دیا جائے۔

آزادی سے پہلے کی حکمت!

مسلمانوں کے تہذیبی تانے بانے مٹانے کی ترکیب یہ نکالی کہ اٹلی کے مال کا بھی بائیکاٹ کر کے ترکی ٹوپیوں کو نذر آتش کروا کر گاندھی ٹوپیاں مسلمانوں کو پہنا دی گئیں۔ مسلمان سپاہیوں کو باہر لڑنے کے لیے بھیجا گیا جنھوں نے ترکوں پر گولیاں چلائیں عرب علاقوں پر یورش کی اس طرح ہندستانی فوج سے مسلمانوں کی تعداد بھی گھٹی اور مسلمان نے مسلمان کا خون بہایا۔

ہجرت کی تحریک چلا کر بے شمار مسلمانوں کو ملک بدر کر دیا گیا اور ان کی املاک پر غیروں کا قبضہ ہو گیا۔ ترک موالات کے ذریعہ مسلمانوں کو سرکاری نوکریوں سے نکلوا دیا گیا۔

کھدر پہننے کی تحریک نے مسلمان صنعت کاروں کو کاروبار سے محروم کر دیا گیا اسلئے کہ وہ اعلیٰ درجہ کا کپڑا تیار کرتے تھے اس طرح پارچہ بافی کی صنعت پر ضرب لگائی گئی۔ اس طرح ہر تحریک جو بظاہر انگریز دشمنی پر مبنی تھی وہ مسلمانوں کی معاشیات اور تہذیبی ڈھانچہ کو برباد کرنے والی تھی۔

اس ملکی اور قومی جنگ میں مسلمانوں نے اپنی قوت برداشت کا سکہ انگریز قوم پر بٹھا دیا مسلمانوں نے چرخہ چلانے سے لیکر صوبہ سرحد میں محاذ آرائی تک کا بازار اگر گرم نہ کر دیا ہوتا تو تنہا ہندو سیاست کا وہ نتیجہ برآمد نہ ہوتا جو ہوا۔ مگر ملکی و قومی جدوجہد اور جوشِ جہاد کے بعد جب مسلمان کی آنکھ کھلی تو نہ صرف یہ کہ اسے مال غنیمت میں کچھ نہیں ملا بلکہ جو اس کے پاس تھا وہ بھی چھین لیا گیا۔

سنہ ۱۹۳۱ء کی سودیشی تحریک نے غیر ملکی مال کے بائیکاٹ کے جوش میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے مشہور زمانہ کمپنیوں کو نکال دیا۔ باٹا کے جوتوں پر داؤد اینڈ

کمپنی کا قبضہ تھا۔ مغل لائن جہازرانی کمپنی مسلمانوں کی تھی اس کے علاوہ دیگر جہاز راں کمپنیاں بھی۔ اک بوٹ والا اور بکوٹا والد صاحب کی تھیں۔ ان کمپنیوں کے مالک بمبئی کے جس محلہ میں رہتے تھے وہ محلہ "ناخدا" کہلاتا تھا۔ ایکسائیڈ بیٹری، مانچسٹر کا کپڑا، برمنگھم کا کاغذ، آدم جی اور عبدالرحمٰن سیٹھ درآمد کرتے تھے۔ اسی طرح بروک بانڈ، لپٹن، سن لائٹ صابن، لائف بوائے، پرائم اسٹوو، پیٹرومیکس کی گیس بتیاں، اور بے شمار غیر ملکی ایجنسیوں پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔۔۔ لیکن گاندھی جی کی سودیشی تحریک کے نعرہ پر بدیشی سامان کے بائیکاٹ کے جوش میں مسلمانوں نے ساری ایجنسیاں انگریزوں کو واپس کر دیں۔ اس حکم کی سزا یہ ملی کہ گجراتیوں، پارسیوں اور مارواڑیوں نے فوراً انگریز سے یہ ایجنسیاں حاصل کرلیں جیسے یہ تحریک چلائی ہی اسلئے گئی ہو کہ مسلمانوں کو دنیائے تجارت سے بیدخل کردیا جائے اور اس کا نتیجہ یہی نکلا۔

دادا بھائی کانگریس مین شامل بھی رہے اور انگریزوں سے گول میز کانفرنس اور غیر ملکی دورے پر کوئی نہ کوئی لائسنس لیکر لوٹے۔ آج ملک کے ساحلوں پر انھیں لوگوں کی کپڑے کی ملیں اور لوہے کے کارخانے ہیں۔ اور مسلمان غدارِ وطن اور مالی پریشانیوں کا شکار ہیں۔

الفت کا انکی دودھ جو پی کے پلے بڑھے
شیطان اسکو دیکھ کے لاحول خود پڑھے

مولانا آزاد اور انکی کتاب

بیزار نگاہوں کی گذرگاہ ہے اب
وہ چہرہ جو نظروں کا حرم تھا اک روز

اب میں ایک ایسے انسان کا ذکر کرنے جا رہا ہوں جو نہ صرف ہندستان کی سیاست پر بلکہ پوری نصف صدی تک ایشیا کی سیاسی زندگی پر اثر انداز ہوتا رہا ہے، خاص طور پر مسلم ممالک کی سیاست پر بھی انگریزی عہد میں اس نے گہرا اثر چھوڑا تھا۔ مگر یہ شخصیت آزادی سے پہلے اپنی زندگی میں بھی شدید ترین اختلافات کا شکار تھی ہندستان کی مسلم سیاست کے لیڈروں نے اسے "شو بوائے" کہہ کر رد کر دیا تھا اور آزادی کے بعد ملک کی ہندو لیڈرشپ اسے گاندھی، نہرو اور پٹیل کی جگہ دینے کو تیار نہیں ہے۔ اور یہ ذات ہے مولانا ابوالکلام آزاد کی۔

مولانا آزاد کانگریس کے چوٹی کے لیڈر تھے۔ لہٰذا تقسیم ہند کے بارے میں وہ جو کچھ کہہ دیں وہ بات مسلمانوں کے لیے چاہے سند نہ ہو مگر کانگریس اور ہندستان کیلئے ضرور سند ہوگی۔ اسلئے کہ سنہ ۱۹۳۹ء سے سنہ ۱۹۴۶ء تک وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر تھے۔ فیصلہ ابوالکلام آزاد پر چھوڑ دیں اور جو کچھ وہ کہیں اسے ایک ہندستانی ہونے کے ناطے قبول کر کے سر تسلیم خم کر دیں اور شرم سے اپنی گردنیں جھکالیں کہ ہم کتنے ذلیل، تنگ دل اور تنگ ذہن ہیں اور کس طرح جھوٹے وقار اور بڑائی سے چپکے ہوئے ہیں اور ہمیں بے معنی برتری کے لیے کتنے نقصانات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

تقسیم ہند کے بارے میں مولانا آزاد اپنی کتاب "ہندستان نے آزادی جیت لی" میں کہتے ہیں..... " کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان کا مطالبہ اگر خود مسلمانوں کے مفادات کے اس

قدر خلاف تھا تو مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اسکی دلفریبی کا شکار کیوں ہو گیا؟ اس سوال کا جواب ہندوؤں کے بعض انتہا پسند و فرقہ پرستوں کے رویہ میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ جب مسلم لیگ نے پاکستان کا نعرہ لگانا شروع کیا تو ان فرقہ پرستوں نے اس میں نامسعود پان اسلام ازم کی سازش محسوس کرلی، اور انھوں نے اس خوف میں اسکی مخالفت شروع کردی کہ اس تجویز میں پورے ملک میں پھیلی ہوئی مسلم ریاستوں کے ساتھ ہندستانی مسلمانوں کے اتحاد کی جھلک نظر آتی ہے۔"

اس کے بعد بھی یہ بات صاف نہ تھی کہ اس سے مراد ایک علاحدہ آزاد ریاست کا وجود چاہئے یا ملک کے اندر ہی مرکز کے ماتحت ایک اسلامی ریاست۔

مولانا آزاد کہتے ہیں..... "مسلم لیگ لاہور رزولیوشن کے زمانہ سے تقسیم ملک کی طرف کچھ اور بڑھ چکی تھی۔ بہرحال مسلم لیگ نے ابتک یہ واضح نہیں کیا تھا کہ اسکا مطالبہ کہاں تک ہے۔ الفاظ مبہم تھے۔ اور ان کی ایک سے زیادہ تعبیرات ہوسکتی تھیں۔ البتہ اسکا عموی مفہوم صاف تھا۔ مسلم لیگ نے مطالبہ کیا تھا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کو کامل حق خود اختیاری حاصل ہو۔ سکندر حیات خاں نے اپنے اس رزولیوشن کی حمایت کرتے ہوئے اس کی یہی تعبیر پیش کی تھی لیکن اب لیگ کے لیڈروں نے وسیع تعبیر پیش کردی تھی اور اب وہ ڈھیلے ڈھالے طریقہ پر ملک کی تقسیم اور مسلم اکثریت کے علاقوں کے لیے ایک آزاد ریاست کی بات کر رہے تھے۔"

۱۲ / اپریل سنہ ۱۹۴۶ء کو مولانا آزاد نے ایک فارمولا پیش کیا۔ اس کے بارے میں وہ کہتے ہیں..... "میں نے اس معاملہ پر جتنا زیادہ غور کیا اتنا ہی مجھ پر واضح ہوتا چلا گیا کہ ہندستان کے الجھے ہوئے مسائل (میرے اس فارمولہ) کے سوا دوسرے خطوط پر حل نہیں ہوسکتے۔ اس اصول کی بنیاد پر کوئی دستور بنایا گیا تو وہ یقین دلائے گا کہ مسلم

ہندو لیڈروں نے سنہ ۱۹۰۵ء سے ہی مسلمانوں پر روزی روٹی کے دروازے بند کرنے کی پالیسی شروع کردی تھی۔ جس میں کانگریس رہنمائی کے فرائض انجام دے رہی تھی اسی کا ردعمل مسلم لیگ۔ جو تقسیم بنگال کی مخالفت کا ردعمل تھی اور نہرو رپورٹ کا ردعمل پاکستان کا نعرہ تھا۔ مصنف۔

ہندستان نے آزادی جیت لی صفحہ ۱۴۴۔ ہند................ لی صفحہ ۱۴۵۔

اکثریت کے صوبوں میں ان تین امور کے سوا باقی تمام امور صوبائی سطح پر انجام دئے جاسکیں گے۔ یہ چیز مسلمانوں کے دماغ سے ہندوؤں کے تسلط کے تمام اندیشوں کو نکال دے گی۔ ایک بار جب اس طرح کے اندیشے کم ہوجائیں گے تو فرقہ وارانہ پہلو سے قطع نظر ہندستان جیسے ملک کے لیے یہ بہترین سیاسی حل ہوگا۔"

یہ بات نہ بھولنا چاہئے کہ کرپس مشن کے وقت سنہ ۱۹۴۲ء ہی سے کانگریس کے اہم رہنما راجگوپال آچاریہ جو بعد کو ہندستان کے گورنر جنرل بنے یہ مہم چلا رہے تھے کہ کانگریس کو تقسیم ملک کا مطالبہ منظور کرلینا چاہئے۔

۲۳ / مارچ سنہ ۱۹۴۶ء کو کیبنٹ مشن آیا۔ اس نے مولانا سے بھی بات کی اور مولانا نے مشن سے مذاکرات کی رپورٹ پیش کی جسے ورکنگ کمیٹی اور گاندھی جی دونوں نے مکمل اتفاق رائے سے منظور کرلیا۔

مسلم لیگ نے ان مسائل پر غور کیا۔ مولانا لکھتے ہیں۔۔۔ "مسلم لیگ کونسل کا اجلاس تین روز تک جاری رہا۔ آخری دن مسٹر جناح کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ کیبنٹ مشن پلان میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے اقلیتوں کے مسائل کا اس سے بہتر حل ممکن نہیں ہے . . . . . انھوں نے مسلم لیگ کو مشورہ دیا کہ وہ اس اسکیم کو منظور کرے اور کونسل نے متفقہ طور پر اس کے حق میں ووٹ دیدیا۔"

لیکن ابھی (اے۔ آئی۔ سی۔ سی) آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی منظوری باقی تھی اس کے لیے مولانا نے بتایا کہ یہ ایک رسمی معاملہ تھا اس کے لیے اس نے ہمیشہ ورکنگ کمیٹی کے فیصلوں کی توثیق ہی کی ہے۔ غرض یہ کہ جب یہ معاملہ اس کے سامنے ۷ / مئی کو بمبئی میں پیش ہوا تو بائیں بازو والوں اور سوشلسٹ گروپ نے اس کی مخالفت کی لیکن بالآخر کثرت رائے سے اس پلان کو منظور کرلیا گیا۔ اسی وقت مولانا نے کانگریس کی صدارت کا چارج پنڈت نہرو کو دیدیا۔ حالانکہ سنہ ۱۹۳۷ء میں اترپردیش کے معاملہ میں وہ پنڈت نہرو کے ہاتھوں زخم کھاچکے تھے پھر بھی ایسے اہم موقع پر انھوں نے صدارت کی

انڈیا ونس فریڈم۔

کرسی خالی کر کے پنڈت نہرو کے سپرد کردی ایسا کیوں ہوا اس پر ابھی پردے پڑے ہوئے ہیں۔ بہرحال اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کے بارہ میں مولانا آزاد کہتے ہیں۔۔۔ "اب منحوس واقعات میں سے ایسا واقعہ پیش آیا جس نے تاریخ کا دھارا بدل دیا۔ ۱۰/ جولائی (سنہ ۱۹۴۶ء) کو جواہرلال نے ایک پریس کانفرنس بمبئی میں منعقد کی اس کانفرنس میں انھوں نے بیان دیا جس کا عام حالات میں شاید کوئی نوٹس نہ لیا جاتا لیکن شک، شبہ اور نفرت سے بھری فضا میں اس سے واقعات کا انتہائی منحوس سلسلہ شروع ہوتا چلا گیا۔ پریس کے نمایندوں نے ان سے سوال کیا کہ کیا اے۔ آئی۔ سی۔ سی کے رزولیوشن پاس کرنے کے سلسلہ میں کانگریس نے پلان کو جوں کا توں قبول کرلیا ہے؟ جس کے اندر عبوری حکومت کی تشکیل بھی شامل ہے۔ جواہرلال نے جواب میں کہا کانگریس دستور ساز اسمبلی میں اس طرح داخل ہوگی کہ وہ معاہدوں سے بالکلیہ آزاد ہوگی اور اسے اس بات کی آزادی ہوگی کہ جس طرح کے حالات رونما ہوں ان سے حسب موقع نمٹ سکے۔ پریس کے نمایدوں نے مزید پوچھا کیا اسکا مطلب یہ ہے کہ کیبنٹ مشن پلان میں ترمیم کی جا سکتی ہے؟ جواہرلال نے زور دیکر جواب دیا کہ کانگریس صرف دستور ساز اسمبلی میں شرکت کیلئے راضی ہوئی ہے وہ اپنے آپ کو اس بات کیلئے آزاد خیال کرتی ہے کہ اگر بہتر خیال کرے تو وہ کیبنٹ مشن پلان کو بدل دے یا اس میں ترمیم کردے۔ میں یہ بات ریکارڈ میں لانا چاہتا ہوں کہ جواہرلال کا یہ بیان غلط تھا۔ یہ بات صحیح نہیں تھی کہ کانگریس جس طرح اس کی مرضی ہو کیبنٹ مشن پلان میں ترمیم کے لیے آزاد تھی۔ کانگریس اس بات پر متفق ہوگئی تھی کہ مرکزی حکومت وفاقی ہوگی۔ مرکزی شعبوں کی لازمی فہرست تین تک محدود ہوگی اور باقی تمام شعبے صوبوں سے متعلق ہوں گے۔ ہم نے اس بات سے بھی اتفاق کیا تھا کہ (صوبوں کے) اے۔ بی۔ سی تین خطے ہوں گے۔ جو مختلف صوبوں کے الگ الگ گروپ ہوں گے۔ یہ امور کانگریس کے یکطرفہ فیصلہ سے بدلے نہیں جا سکتے تھے۔ جب تک معاہدے کے دوسرے فریق انھیں بدلنے پر راضی نہ ہوں۔

صفحہ ۱۵۴، ۱۵۵ تا صفحہ ۱۸۵-۱۸۶۔

آگے مولانا آزاد کہتے ہیں..... "جواہرلال کا یہ بیان مسٹر جناح کے لیے بم کی طرح ثابت ہوا اور کونسل کا اجلاس طلب کر کے یہ بیان جاری کیا کہ مسلم لیگ کونسل نے دہلی میں کیبنٹ مشن پلان کو اس لیے قبول کیا تھا کہ اسے اطمینان دلایا گیا تھا کہ کانگریس نے بھی اس اسکیم کو منظور کرلیا ہے اور یہ کہ یہ پلان ہندستان کے آئندہ مستقبل کی بنیاد بنے گا لیکن اب کانگریس کے صدر نے اعلان کردیا ہے کہ کانگریس دستورساز اسمبلی میں اپنی اکثریت کے بل پر اس اسکیم کو بدل سکتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اقلیتوں کو اکثریت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔"

اس سلسلہ میں مولانا آزاد نے بہت بھاگ دوڑ کی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوسکا آخر مولانا کو کہنا پڑا کہ "ورکنگ کمیٹی نے کانگریس کے صدر کے وقار کو بچانے کے لیے ملک کو قربان کردیا۔ میں صاف طور سے دیکھ رہا تھا کہ ہم ایک کے بعد دوسرا غلط فیصلہ کئے چلے جارہے ہیں اور غلط راہ سے پلٹ آنے کے بجائے دلدل میں اور گہرے دھنستے چلے جارہے ہیں۔ مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن پلان قبول کرلیا تھا اور ہندستان کے مسائل کا اطمینان بخش حل نظروں کے سامنے تھا۔ میں نے جواہرلال کو متنبہ کیا کہ اگر ہم تقسیم پر راضی ہوگئے تو تاریخ ہمیں ہرگز معاف نہ کرے گی۔ تاریخ کا فیصلہ اس صورت میں یہ ہوگا کہ ہندستان کی تقسیم میں جتنا مسلم لیگ کا ہاتھ ہے اتنا ہی کانگریس کا بھی تھا۔"

گاندھی جی مولانا کی امید گاہ

پٹنہ سے ۳۱/مارچ سنہ ۱۹۴۷ء کو گاندھی دہلی آگئے۔ اسی دن مولانا نے ان سے ملاقات کی اور یوں بات شروع ہوئی۔

گاندھی جی:-- تقسیم ملک کے لیے خطرہ بن چکی ہے۔ ولبھ بھائی پٹیل ہی نہیں جواہرلال بھی اس کے آگے ہتھیار ڈال چکے ہیں۔ اب آپ کیا کریں گے۔ میرا ساتھ دیں گے یا آپ بھی بدل چکے ہیں۔"

مولانا:--"میں تقسیم کا ہمیشہ مخالف رہا ہوں آج بھی ہوں۔ مجھے اس بات سے سخت

تکلیف ہے کہ جواہرلال اور سردار پٹیل نے بھی شکست قبول کرلی ہے یا آپ کے الفاظ میں ہتھیار ڈال دئے ہیں۔ مجھے اب صرف آپ سے امید ہے اگر آپ تقسیم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں تو صورت حال کو بگڑنے سے ہم اب بھی بچا سکتے ہیں اور اگر آپ بھی ملک کی تقسیم سے اتفاق کر لیتے ہیں تو مجھے اندیشہ ہے کہ ہم ہندستان کو کھو دیں گے۔"

گاندھی جی:۔۔"کانگریس اگر تقسیم قبول کرنا چاہتی ہے تو ایسا صرف میری لاش پر ہوسکے گا۔ جب تک میں زندہ ہوں ہندستان کی تقسیم پر راضی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر میں مدد کرسکا تو کانگریس کو تقسیم قبول نہ کرنے دوں گا۔"

گاندھی جی اس کے بعد اسی دن لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملے۔ اگلے روز پھر ان سے ملے۔ ۲ / اپریل کو پھر ان سے ملاقات کی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کر کے جب گاندھی جی پہلی بار لوٹے تو سردار پٹیل نے ان سے ملاقات کی اور دو گھنٹہ سے زیادہ بند کمرے میں دونوں کے درمیان گفتگو جاری رہی۔ اس نشست کے دوران کیا ہوا؟ مولانا کہتے ہیں مجھے معلوم نہیں۔

امید گاہ شدید ترین صدمہ کا شکار

البتہ جب میں (مولانا) دوبارہ گاندھی جی سے ملا تو مجھے اپنی زندگی کے شدید ترین صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔ میں نے پایا کہ وہ (گاندھی جی) بھی بدل گئے ہیں۔ اس سے زیادہ حیرت اور صدمہ کی بات یہ تھی کہ انھوں نے وہی دلائل دینا شروع کر دئے جو سردار پٹیل اس سے پہلے دے چکے تھے۔ میں دو گھنٹہ سے زیادہ ان سے بحث کرتا رہا مگر ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بالآخر میں نے انتہائی مایوسی کے عالم میں کہا اگر آپ بھی ان خیالات کو اپنا چکے ہیں تو مجھے اب امید کی کرن کہیں دکھائی نہیں دیتی کہ ہندستان کو تباہی سے بچایا جا سکے گا گاندھی جی نے میری ان باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔"

گاندھی سنہ ۱۹۳۷ء کے یو۔ پی کے بحران پر بھی جواہرلال نہرو کے ہمنوا تھے اور مولانا کی کوئی مدد نہ کر پائے تھے یہاں انھوں نے اپنے پرانے فلسفہ جس کی غمازی ان

کے تین بندر کرتے ہیں کہ بری بات نہ دیکھو، نہ کہو نہ سنو پر عمل کرتے ہوئے مولانا کی باتوں پر خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

تقسیم:- ان تمام باتوں اور استدلال کو سامنے رکھ کر اقوام عالم یہ فیصلہ کریں کہ ملک کی تقسیم میں مسلمانوں کا کیا قصور ہے؟ ہر موقع پر مسلمانوں نے وہ کانگریس کے لیڈر مسلمان ہوں یا مسلم لیگ کے ملک کی وحدت و سالمیت کو بچانے کیلئے کام کیا۔ سنہ ۱۹۰۵ سے سنہ ۱۹۴۷ تک خود مسلم لیگ کے لیڈروں نے ہر مثبت تجویز کا جس کے ذریعہ ہندستان کے اندر مسلم اقلیت کو باعزت زندگی گزارنے کا موقع دیا جائے خیرمقدم کیا۔ لیکن کانگریس کے ہندو لیڈروں کی معاہدوں کے بعد معاہدہ شکنی تقدیر بنتی چلی گئی۔ جو قومیں معاہدوں کی پابندی نہیں کرتیں ان کا بھرم اٹھ جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۵ سے سنہ ۱۹۴۷ تک اکثریت کے لیڈر سڑک پر پڑے سوکھے پتوں کی طرح اپنا رُخ بدلتے رہے مگر عملاً مسلمانوں کو کچھ دینے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اسلئے کہ وہ مسلمانوں کی طرف سے دائمی نفرت اور خوف کا شکار تھے۔ درہ خیبر پر ان کو محمود غزنوی، محمد غوری اور احمد شاہ ابدالی کے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں اور وہ سمجھ رہے تھے کہ انگریز کے جاتے ہی افغان مجاہد داخل ہو جائیں گے اور یہاں کے مسلمان ان کے ہمنوا و مددگار ہوں گے۔ مسلمانوں کے اپنے خطرات اور ان کے لیے تحفظات کی ضمانتیں تو بجا تھیں اور ہیں لیکن شدید ترین اکثریت والی قوم ہی اگر خوف کا شکار ہو جائے تو کیا کیا جاسکتا ہے؟ وہ بھی اقلیت کی طرف سے۔

مولانا آزاد کے بیان ہی کے مطابق تقسیم کی ذمہ داری سردار پٹیل، جواہرلال نہرو اور گاندھی جی کے ساتھ ہی ساتھ پوری کانگریس پر آتی ہے۔ لیکن آزادی کے بعد اسکا نشانہ صرف مسلمانوں کو بنایا جارہا ہے؟

جرم اور اسکی سزا:-- دنیا میں ہر جرم کی ایک سزا ہے۔ اگر یہ مان لیا

جائے کہ تقسیم کی ذمہ داری صرف مسلمانوں پر ہے۔ تو اس جرم کی سزا کی بھی کوئی حد ہوگی ؟ کوئی مدت ہوگی؟ چھیالیس برس میں ایک نسل ختم ہو گئی ایک بوڑھی ہو گئی اور ایک خاتمہ کے دہانے پر ہے۔ تیسری نسل میدان میں ہے۔ چوتھی جوان ہوچکی ہے پانچویں پالنوں، اسکولوں اور گھروں کے دروازوں پر ہے لیکن کیا یہ سب تقسیم کے قصوروار ہیں؟ دنیا کے سامنے ہندستان نے اپنے لیے ایک دستور پیش کر دیا جس میں بلند بانگ دعوے اور دل خوش کن الفاظ کے سوا عمل کے نام پر مسلمانوں کی قتل و غارت گری اور تباہی و بربادی کے سوا کچھ بھی تو نہیں ہے۔

چھکیں حریف رہیں تشنہ کام ہم کیا خوب؟
ہمارے حق میں ہے میخانہ کربلا ساقی!

تقسیم کے بعد

ہندستان کی آزادی کا سورج ہندستانی مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے دردناک مناظر اپنے پہلو میں لیکر طلوع ہوا۔ تباہی و بربادی کے بادلوں نے مسلمانوں کو آگ و خون کے سیلاب میں غرق کر دیا۔ پورا ملک دہشت و بربریت کی آغوش میں آگیا خیال یہ تھا کہ تقسیم کی کالی دیوی تھوڑی ہی مدت میں مسلمان زندگیوں کی بھینٹ لیکر خاموش ہو جائے گی لیکن ایسا ہوا نہیں۔ آج سنہ ۱۹۹۳ء (2005) میں بھی ہندستان کا افق مسلمانوں کے خون سے لالہ زار ہے۔

شفق را لالہ گوں دیدم نماز شام در گردون
مگر خورشید را کشتہ کہ دارد دامن پر خون

آج ہندستانی مسلمانوں کی عزت و آبرو، جان و مال، موت و زندگی، بے رحم شریر اور شرپسند اکثریت کے افراد کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی ہے۔ آج وہ مسلمان جس نے اپنے خون سے اس ملک کی آبیاری کی تھی، اس ملک کو امن و امان دیا تھا، مساوات عدل و انصاف اور بھائی چارہ قائم کیا تھا۔ ملکی سرحدوں کی حفاظت کی تھی۔ آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے سامنے تیسرے فاقہ پر سنہ ۱۸۵۷ء میں جب انگریز جرنلوں نے ان کے بیٹوں کے سر بھیجے اور انھوں نے کپڑا پلٹا تو بیٹوں کے سر دیکھ کر اس شیر دل بادشاہ نے کہا:

مبارک ہو میرے بچو! تم باپ کے سامنے سرخرو آئے ہو،
ملکی آزادی کی لڑائی میں یہ سر کوئی قیمت نہیں رکھتے

اس طرح مسلمانوں نے ہر ممکن کوشش انگریزی غلامی سے ملک کو بچانے کیلئے کی، مگر اندرون ملک ہی کچھ طاقتیں غیر ملکیوں کی آلہ کار بن کر کام کر رہی تھیں۔

آج ہندستان پر دو طرفہ حملہ ہوا ہے، یہ حملہ فکری اور سیاسی ہے۔ اسوقت ملک میں دو

لابیاں کام کر رہی ہیں، امریکن لابی اور روسی لابی۔ اور دونوں ہی بہ ظاہر اور بہ باطن اپنے سینوں میں نفرتوں کا طوفان رکھتی ہیں، اور مسلمانوں سے چلکر پاکستان پر دم لیتی ہیں۔ یہ دونوں گروپ اپنے آقاؤں کے اشاروں پر ناچنے اور تالیاں بجانے کا کام کر کے مسلمانوں کی فکرِ نظر پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ ہمیں غور کرنا چاہئے کہ یہ جھگڑے نہ صرف اقوام کے درمیان توسیع پسند اور سامراجی طاقتوں نے کھڑے کئے ہیں بلکہ اندرون ملک مختلف فرقوں کے درمیان نفرت کا طوفان برپا کرنے کا کام بھی انھیں ایجنٹوں کے ذریعہ انجام پا رہا ہے۔

یہ بات ہندستان کے سمجھدار لیڈروں کے سوچنے کی تھی کہ کیا پچیس کروڑ مسلمانوں کو برباد کر کے ملک ترقی کر سکتا ہے؟ کیا ہندستان کی معاشیات ترقی کر سکتی ہے؟ کیا ہندستان کی سرحد کی حفاظت ہو سکتی ہے اور کیا مسلمانوں کی اس قتل و غارت گری کے نتیجہ میں ملک کی دوسری اقلیتیں بے اطمینانی کا شکار ہو کر تشدد کی راہ اختیار کرنے پر مجبور نہ ہوں گی۔ تجربات اور تاریخی واقعات قوموں کے لیے مشعل راہ ہوا کرتے ہیں۔ اگر تعصب اور تنگ نظری نے قوموں کو تباہ کیا ہے اور ملکی انتشار، شکوک و بداعتمادی نے قوموں کو غلام بنایا ہے تو موجودہ سائنسی ترقی اس سنت کو بدل نہیں سکتی۔ آج بھی وہی ہوگا جو کل ہو چکا ہے۔ چھیالیس سال کے تجربات سے یہ بات کھل کر سامنے آچکی ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے وجود کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں انھیں ایک سسکتی ہوئی قوم بنا کر ہندستانی معاشیات پر بوجھ بنانے کا کام کیا جا رہا ہے۔ اور اس ملک کے حکمران جن کو اچانک حکمرانی مل گئی ہے، وہ اپنے اندر شان حکمرانی پیدا نہ کر سکے۔ اسلئے کہ وہ اس کے لیے تیار ہی نہ تھے، اس طرح حکومت ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ گئی ہے۔ اسلئے کہ ان کے ذہن رموز حکمرانی سے بالکل عاری ہیں۔ جس ملک میں سیاسی عدم استحکام سماجی نابرابری اور معاشی لوٹ کھسوٹ جاری ہو وہ بالکل آگے نہیں بڑھ سکے گا۔

چین سے جنگ کے وقت مسلمانوں نے ہر طرح کی قربانیاں دیں، اپنی حیثیت بھر مالی امداد بھی فراہم کی، لیکن چینی پیش قدمی رکتے ہی کلکتہ، جمشید پور اور راوڑکیلا میں مسلمانوں

کو پورس کے ہاتھیوں نے روند دیا، ان کے گھروں کو لوٹا اور جلایا گیا۔ مسلمان ملک کے دفاع کے لیے بھی خون دے اور فرقہ پرستوں کی نفرت کی آگ بجھانے کے لیے بھی ایک نام کا مسلم تعلیمی ادارہ ہے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جسے ہندستان کا سیکولر مزاج برداشت نہیں کر پا رہا ہے، اسے چھوڑئے یہ تو آزادی سے پہلے مسلم سیاست کی آماجگاہ رہا ہے لیکن "دیوبند" کے ساتھ کیا کیا؟ کیا پنڈت نہرو اور پنڈت گووند ولبھ پنت کے ہی عہد حکمرانی میں اسکی تلاشی نہیں لی گئی پاکستانی اسلحہ تلاش کرنے کی خاطر؟ سنہ ۱۹۴۹ء میں جو پنڈت جواہرلال نہرو کے عہد شباب کا زمانہ تھا۔ پنڈت گووند پنت اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ تھے۔ اجودھیا (فیض آباد) میں سرجو ندی کے کنارے مضبوط بنیادوں پر ایک تاریخی مسجد (بنام بابری مسجد) کھڑی ہوئی ہے بابو ترلوکی سنگھ (راجیہ سبھا) میں کانگریس کے ایم - پی تھے۔ ۶/ اپریل سنہ ۱۹۷۸ء کو جب میں اپنی سرکاری گاڑی (ممبر اسمبلی اور چیرمین ہینڈلوم کارپوریشن کی حیثیت) سے اس مسجد کو دیکھنے گیا۔ واپسی پر آنجہانی بابو ترلوکی سنگھ سے میں نے پوچھا کہ آپ اس مسجد کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں تو انھوں نے کہا کہ سنہ ۱۹۴۹ء میں آچاریہ نریندر دیو اجودھیا سے سوشلسٹ پارٹی کے امیدوار تھے اور جیت رہے تھے کانگریسیوں نے اپنے امیدوار کو جتانے کے لیے وہاں کے ڈی - ایم - سے کہا کہ بابری مسجد میں اگر مورتی رکھوانے میں آپ مدد کریں تو کانگریس الکشن جیت سکتی ہے۔ ڈی - ایم - مسٹر نایر نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد کانگریسی مسٹر پنت کے پاس لکھنؤ آئے اور ساری بات بتائی پنت جی نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو حکم دیا کہ الکشن ہر قیمت پر جیتنا ہے اور جیسا یہ لوگ کہتے ہیں ویسا ہی کرو، بس اسی رات کو مسجد میں مورتی رکھدی گئی اور آج سنہ ۱۹۴۹ء میں اس پر قبضہ کر لیا گیا۔ یو - پی وقف بورڈ نے کسی نام نہاد عدالت میں مقدمہ دائر کیا ہے سنہ ۱۹۴۹ء سے آج ۱۹۹۲ء تک پریشانیاں بڑھ رہی ہیں۔ مسجدوں کی بے حرمتی ان پر قبضہ اور آثار قدیمہ کے نام پر ان کو قومی ملکیت میں لینا ہندستانی سرکار کا مزاج بنتا چلا گیا۔

یہ کس طرح کا الکشن تھا پتہ نہیں چلا مگر ترلوکی سنگھ کا بیان بتا رہا ہے کی وزیر اعلیٰ کی ایما پر ہوا۔ ۶/ دسمبر ۱۹۹۲ء کو مسجد شہید کرادی۔

[بابو ترلوکی سنگھ کا بیان غلط یا صحیح مورتیاں (بت) تور کھے گئے]

ہر لیڈر مسلمانوں سے وفاداری کے ثبوت مانگتا ہے۔ وفاداری محتاج ہے خلوص و محبت کی۔ اگر سرکار منصف ہے، مساوات پر قائم ہے۔ تمام فرقوں کو امن و سکون دیتی ہے، ان کے جان و مال، عزت و آبرو اور زندگی کی محافظ ہے تو اس ملک کے تمام فرقہ اس کے لیے خون بہاتے ہیں، جنگ کرتے ہیں اور دشمن کو پیچھے ڈھکیل دیتے ہیں، لیکن ہندستان کے موجودہ ماحول میں جہاں امن و سکون نہ ہو، جان و مال اور بچوں کا مستقبل محفوظ نہ ہو کوئی اس ملک کے لیے جان نہیں دے سکتا اور اگر ہمت بھی کرے تو میدان جنگ میں اسکا حوصلہ پست ہو جائے گا جب پتہ چلے گا کہ اسکی بستی کو جلا دیا گیا، گھروں کو لوٹ لیا گیا عورتوں کی آبرو ریزی کی گئی اور بچوں کو زندہ آگ میں ڈال دیا گیا اور بد قسمتی سے ہندستان میں مسلمانوں کے خلاف یہ ماحول موجود ہے، کشمیر سے کنیا کماری تک آسام سے راجستھان تک کہیں بھی تو مسلمانوں کے لیے امن و امان کا ماحول پایا نہیں جاتا۔

دستور ہند کے ذریعہ ۲۶ / جنوری سنہ ۱۹۵۰ کو ہندستان کی سرکار اور مسلمانوں، ہریجنوں اور دوسری اقلیتوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا، خود سرکار نے اس کا اعلان کیا تھا لیکن حکومت نے خود ہی اپنے مضبوط ہاتھوں سے اسے توڑ دیا۔ اگر آج سرکار اور اکثریتی گروپ کے لیڈر یہ کہتے ہیں کہ مسلمان وفادار نہیں ہیں، تو انھیں اپنے گریبان میں منھ ڈالکر دیکھنا چاہئے کہ کیا دستور ہند کے ذریعہ کئے گئے اپنے عہد پر وہ خود قائم ہیں؟

ہم تو غدار سہی، پابند وفا تم بھی نہیں
اپنی کثرت پہ نہ اتراؤ خدا تم بھی نہیں

مسلمانوں سے وفاداری کا عہد لینے والوں کو خود اپنے کو ٹٹولنا چاہئے کہ وہ مسلمانوں کو کیا دے سکتے ہیں؟ کہاں تک رواداری برت سکتے ہیں؟ آج ہندستان میں مسلمان محفوظ نہیں ہے، اسکی روایات، اسکی زبان، اسکا تمدن، اسکی تہذیب، اسکی تعلیم گاہیں سب کچھ تو سرکاری فرقہ پرستوں، اور سیاسی دیوانوں کے نشانہ پر ہیں۔۔۔ اگر یہ حقیقت ہے؟ اور ہے!

توپھر مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیوں؟ کیا مسلمان سینما پر چلتی ہوئی بے روح تصویریں ہیں کہ جن کی زندگیاں دوسروں کے اشاروں کی محتاج ہیں؟

اگر ملک کا سیاسی ماحول مسلمانوں کے "مسلمان" کی حیثیت سے وجود ہی کا مخالف ہے تو چند ملت فروش تو سرکار کے ساتھ جا سکتے ہیں لیکن عام مسلمان اپنے کو اس چوکھٹ پر گرا نہیں سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنی بے کسی، بے بسی اور طاقت و قوت سے محرومی کی بنا پر وہ کچھ کہہ نہ سکیں، لیکن ان کے دل اس کے ساتھ نہیں ہو سکتے، ان کے ہاتھ اس کی بقا کے لیے دعا کو نہیں اٹھ سکتے جس کی موجودگی میں ان کی ملی غیرت کو پامال، مذہبی روایات کو تباہ اور تہذیبی سرمایہ کو برباد کیا گیا ہو۔ دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ملک کو تقسیم کرنے والی کانگریس ہندستان کے مسلمانوں کو فرقہ پرست کس اصول کے تحت کہہ سکتی ہے۔

حقایق روز بروز بدلا نہیں کرتے اگر سنہ ۱۹۴۷ء میں سیاسی طور پر مسلمانوں کو الگ قوم تسلیم کیا تھا تو سنہ ۱۹۹۲ء (۲۰۰۰) میں ہندو اور مسلمان ایک قوم نہیں ہو سکتے اور مستقل اور پائیدار امن اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب اس بنیادی حقیقت کو آج بھی تسلیم کر لیا جائے۔۔۔ آخر ساری دنیا کے ساتھ "بقائے باہم" کی بنیاد پر زندہ رہنے کی بات کرنے والی وزیر اعظم ہندستان، ہندستان کی دیگر قوموں کو اپنے قبضہ اقتدار میں کیوں رکھنا چاہتی ہیں، ہندستان کیثر القوی ملک تھا، ہے اور رہے گا، جب تک مختلف قومیتوں کو تبادلہ آبادی کی بنیاد پر محفوظ علاقے فراہم نہیں کر دئے جاتے۔ ہندستان کے مسلمان بقائے باہم کے اصول کے تحت سبھی فرقوں کے ساتھ رہ سکتے ہیں ملک کے سیاست دان اصول مرتب کریں!

وہ دیکھو! بزدل و بے عمل مسلم لیڈر کی آواز آئی، دین کو اسلام کو، سیاست سے الگ رکھو اور برہمنی سیاست کے غلام بن کر ہندستان کے قومی دھارے میں اپنے کو گم کر دو۔ غالباً سنہ ۱۹۶۹ء میں جن سنگھ کے لیڈر بلراج مدھوک نے لکھنؤ میں گفتگو کے دوران مجھ سے کہا کہ ایران کے مسلمان "رستم و سہراب" آج بھی نام رکھتے ہیں جبکہ وہ مسلمان نہ تھے ہندستان کے مسلمانوں کو بھی، ارجن، بھیم اور سیتا نام رکھنا چاہئے؟

میں نے ان سے کہا، ہمیں سیتا نام اچھا لگتا ہے، لیکن ایک دقت ہے اور وہ یہ کہ آپ مدھوک جی ایران جیسی کیفیت یہاں پیدا کر دیں تو ہم نہ صرف سیتا بلکہ رام اور لچھمن ارجن اور بھیم سبھی نام اختیار کر لیں گے۔

وہ بولے۔۔۔ "کیا؟"

میں نے کہا۔۔۔ "جس طرح سارا ایران مشرف بہ اسلام ہو چکا ہے اور اب وہاں رستم وسہراب بھی مسلمان ہے، آپ اپنی پوری قوم کے ساتھ اسلام قبول کر لیں تو یہ نام رکھنے میں ہمیں اعتراض نہ ہوگا۔"

مدھوک جی تڑپ کر بولے۔۔۔ "لیکن قومی دھارے میں تو مسلمانوں کو چلنا ہی ہوگا۔"

میں نے جواب دیا۔۔۔ "مدھوک جی دھارے میں لاشیں بہتی یا سوکھے لکڑی کے لٹھے، مسلمان تو پیرنا جانتا۔"

لیکن بے عمل مسلم لیڈر شپ بھی پروفیسر مدھوک کے دماغ سے سوچتی ہے۔ یہ لیڈر مسلمانوں کو عملی زندگی سے دور رکھ کر اپنی دوکان سجائے بیٹھا ہے۔ اس سے پروگرام مانگو اور پوچھو کہ اس موت کے سیلاب سے نجات کا کوئی پروگرام ہے یا نہیں؟ کاغذی نہیں، عملی طریقہ کار اسلئے کہ یہ فقط کاغذ کا گھوڑا ہے۔ کاغذی گھوڑے خوب دوڑاتا ہے مگر میدان عمل میں نہ مولانا فضل حق خیرآبادی نہ مولانا محمد علی جوہر اور اگر یہ ان ہی جیسا ہوتا تو ملت اسلامیہ ہند کی داستان غم اس بندہ حقیر کو کیوں بیان کرنا پڑتی۔

بقائے باہم کا راستہ

بقائے باہم اور اتحاد قومی کو نقصان پہونچانے والی سب سے بڑی چیز ہندستان کا نظام تعلیم اور لیڈروں کی بے سرو پا تقریریں ہیں۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں جو بچے تھے وہی آج جوان ہو کر فرقہ وارانہ نفرت کا شکار ہو گئے۔ اسکولوں میں پڑھائی جانے والی تاریخ مسلمانوں کے خلاف نفرت سے بھر دی گئی۔ اورنگ زیب عالمگیر سے متعلق جھوٹی کہانیاں تاریخ بنا دی گئیں علاءالدین خلجی اور پدمنی کے تصوراتی اور صوفیانہ عشق کو تاریخی واقعہ بنا کر بچوں کو دیدیا گیا۔ ہندو نوجوانوں کے سامنے قائداعظم محمد علی جناح کی بھیانک تصویر پیش کردی گئی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمودالحسن، مولانا حسرت موہانی، بہادر شاہ ظفر اور مولانا ابوالکلام آزاد کو ہندستان کی آزادی کی تاریخی کتابوں سے نکالدیا گیا۔ مسلم لیگ کے بارے میں آج کا ہندو نوجوان بہت کچھ جانتا ہے لیکن آزادی سے پہلے کی جمعیت العلماء ہند کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ مجلس احرار اور خاکسار تحریک کے کارناموں سے ہندستان کی تاریخ کا طالبعلم واقف نہیں۔

اس تاریخی کورس کے ذریعہ ہندو نوجوانوں کے سینوں کو مسلمانوں کے خلاف نفرت و تعصب سے بھر دیا گیا۔ انھیں پتہ نہیں کہ خود مسلم لیگ نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے کتنا کام کیا اسلئے تاریخ کی کتابوں سے جھوٹی کہانیوں کو پاک کیا جائے۔ کسی ملک کے لیے یہ بات کتنی شرم ناک ہے کہ اس ملک کے نوجوان اپنے ملک کی سچی تاریخ سے بھی واقف نہ ہوں اور غلط تاریخ کے ذریعہ بقائے باہم اور قومی اتحاد کے بجائے نفرت کا شکار ہو جائیں۔

سنہ ۱۹۰۵ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک کی ساری روداد، مجبوریوں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ہونے والی بات چیت کو عوام کے سامنے رکھ کر ان مجبوریوں کو

بتایا جائے اور یہ احساس عوام میں پیدا کرایا جائے کہ تقسیم کے ذمہ دار صرف مسلمان نہیں ہندو لیڈر بھی اس عمل میں برابر کے شریک ہیں۔

لیکن یہ کام کرے گا کون؟ سرکار نہیں کر سکی تو ملک کی دوسری سیاسی پارٹیاں ملکر کر سکتی تھیں مگر وہ خود اسی نفرت و شک کا شکار ہو چکی ہیں۔ اور اتحاد قومی کے لیے کوئی تیار نہیں ہے تو بقائے باہم کیسے ہوگا؟ اسلئے کہ سبھی مذہبی نفرت کو ہوا دیکر اقتدار پر آنا چاہتے ہیں ان نفرت اور تفریق کی تحریکوں کو بے رحمی سے کچل دینے والا رولر ابھی بنا نہیں ہے۔ ایسے ملک و قوم دشمن اشخاص کے لیے اُس رولر کی ضرورت ہے جو امن کے راستہ کا پتھر بننے والی ہر تحریک کو دبا کر کچل کر برابر کردے۔ ہندستان کے فرقہ پرستوں کے جبڑوں میں مسلمانوں کا خون لگ چکا ہے اور وہ طاقت کی زبان سمجھتے ہیں جب تک اس زبان میں گفتگو کرنے والی طاقت پیدا نہیں ہو جاتی ہندستان کی زمین مسلمانوں کا قبرستان بنتی رہے گی۔

قومی یکجہتی کیسے ہوگی

۱۳ / اگست سنہ ۱۹۸۰ کو مراد آباد کی عیدگاہ میں مسلمانوں پر گولیاں چلائی گئیں۔ سیکڑوں مسلمانوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ ایسے ماحول میں تین ماہ کے بعد ایک ہندی ماہنامہ "ارن" مراد آباد نے نومبر میں "دنگا نمبر" نکالا اور اس کے سرورق پر کچھ پولیس والوں کی لاشیں دکھائی گئیں اور یہ ماہنامہ بکتا رہا اسلئے کہ اس طرح مسلمانوں کے خلاف ہندو عوام کے جذبات برانگیختہ کئے جاسکتے تھے لیکن ہفت روزہ "ہجوم" دہلی اور "دعوت" جو جماعت اسلامی کا جریدہ ہے ضبط کرلیا گیا۔ اسی ماہنامہ میں "جڑیں گہری ہیں" کے عنوان سے سبھاش پردیپ گپتا نے لکھا..... "کرفیو کے باوجود فائرنگ اور آتش زنی کی وارداتیں ہوتی رہیں۔ سب سے گمبھیر (اہم) بات یہ ہے کہ تشدد میں استعمال ہونے والے ہتھیار موجودہ تکنیک کے ہیں اور ودیشی ہیں۔ تشدد کرنے والوں کا طریقہ کار ایسا منظم تھا کہ

ہتھیاروں پر سے ان کا مارکہ اور ملک کا نام مٹا دیا گیا ہے۔"

۲۰ / اگست سنہ ۱۹۸۰ء کے قومی آواز میں اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کا بیان تھا۔۔۔ "نہ غیر ملکی اسلحہ بر آمد ہوئے نہ اسٹین گن۔"

لیکن ۱۹ / اگست کو وزیر داخلہ گیانی ذیل سنگھ نے کہا تھا۔۔۔ "اسلحہ نہایت پیچیدہ ہیں۔"

ان متضاد بیانوں کی موجودگی میں کون کس کو پکڑے۔

اسی ماہنامہ کے صفحہ ۴ اور صفحہ ۵ پر ایک لاش کے نیچے لکھا ہے۔۔۔ "دنگائیوں کا پہلا نشانہ پولیس تھی۔" دوسری طرف لکھا ہے۔ "دو پولیس جوانوں کی لاشیں۔۔۔ مرنے کے بعد مٹی خراب۔"

اس طرح ہر صفحہ پر سرخ خون کے دھبے دکھائے گئے ہیں۔

صفحہ ۷ پر کلیان سنگھ تیاگی ایڈوکیٹ کا مضمون ہے۔ انھوں نے پولیس جوانوں کی بہادری اس طرح بیان کی ہے۔۔۔ "گل شہید کی پولیس چوکی کو پھونک دیا چوکی کے سپاہیوں کو مار ڈالا۔ کچھ نے بھاگتے ہوئے وردی اتار کر پھینک دی اور دور گھروں میں چھپ کر اپنی جان بچائی۔ چوکی کے ہتھیار لٹ گئے۔"

تیاگی جی یہ کہانی سنا کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان جو نہتے ہیں، اس پر تو ان کی یہ حالت ہے اگر انھیں ہتھیار مل گئے تو کیا ہوگا؟ اور اکثریت کا یہی خوف فساد کا روپ لیتا ہے۔ اکثریت کے لیڈر، دانش ور، قلم کار وغیرہ مسلمانوں کا خوف دلا کر اکثریت کو ورغلانے کا کام کریں تو ان کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں۔

قومی یکجہتی یک طرفہ نہیں ہو سکتی۔ مسلمان ایک جاندار قوم ہے جس کے یہاں موت مسئلہ نہیں ہے۔

تیاگی جی نے اپنے مضمون میں مہتروں پر (جو آج بالمیکی کہے جاتے ہیں) مسلمانوں کے حملہ کا ذکر کیا ہے مراد آباد کے اونچی ذات کے ہندوں نے ایک ہندو کاروباری کے ذریعہ ایک نوجوان مہتر لڑکی کو بھگا لے جانے کے واقعہ کو خوبصورتی سے مہتروں کے

غضب کو مسلمانوں کی طرف موڑ دیا اور ان ہندوؤں نے جنھوں نے مہتروں کو اپنی آبادیوں کے اندر کبھی رہنے کی اجازت نہ دی مراد آباد میں اہل اسلام کے خلاف ان سے دوستی اور تعاون شروع کر دیا جس کی بنیاد مسلمانوں کے خلاف نفرت پر قائم ہے۔ مراد آباد میں ان مہتروں کی چودہ بستیاں ہیں جو سب کی سب مسلمان آبادیوں کے ساتھ ہیں، اسلئے کہ ہندستان کی سماجی عدم مساوات کی فضا میں آج بھی مسلمان کا یہ مزاج نہیں ہے کہ کوئی انسان پیدائش سے نیچ ہے، دوسری طرف آج مسلمانوں کے خلاف مہتروں کو استعمال کرنے والے ہندوؤں کی آبادیوں کے ساتھ ایک بھی مہتر آبادی نہ ملے گی اسلئے کہ ہندو مہتروں کو استعمال تو کر سکتا ہے لیکن اپنے سینہ سے لگا کر ایک دسترخوان پر بٹھا نہیں سکتا۔

ہریجنوں کو خود جن میں علم کی روشنی پھیل رہی ہے ہندستان میں اسلام کے آنے کے بعد اور اسلام سے پہلے جو ان کی حالت رہی ہے اسکا مطالعہ کرنا چاہئے۔ آج جو کچھ ان کو ملا ہے وہ اسلام ہی کے صدقہ میں ہے اور مسلمانوں کے خلاف ہندو سماج کو متحد کرنے کے جذبہ نے ہی ہندو سماج میں ہریجنوں کی قدر و منزلت میں اضافہ کیا ہے جسکا پہلو خالص تخریبی، عارضی اور خود غرضی پر قائم ہے۔ اگر ہندستانی سماج میں مسلمانوں کی طاقت ٹوٹ گئی تو اگلا نشانہ خود یہی ہریجن ہوں گے اور ایک بار پھر انھیں دو ہزار سال پہلے کے ہندستان میں ڈھکیل دیا جائے گا۔

تیاگی جی نے اسی نمبر میں صفحہ ۸ پر ۱۴/ اگست سنہ ۱۹۸۰ کو سو، اموات کا ذکر کیا ہے اور ۱۵/ اگست کو یہ تعداد دو سو ہو گئی لیکن فاضل مقالہ نگار جو وکیل بھی ہیں نے یہ نہیں بتایا کہ مرنے والے کون تھے؟ ان کا مذہب کیا تھا؟ تعصب انسان کو اندھا کر کے عقل و خرد چھین لیتا ہے۔

صفحہ ۹ پر لکھتے ہیں۔۔ "پولیس کے سپاہی برابر مارے جا رہے تھے اسلئے وہ بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔"

اگر پولیس کے لوگ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے تو پھر ۱۵/ اگست تک دو سو افراد کی جانیں لینے والے کون لوگ تھے، کیا یہ پی-اے-سی کے بھیڑیئے نہیں تھے وکیل

صاحب؟ اخبار کی دنیا عوامی عدالت ہوتی ہے وکیل صاحب۔ جعل اور نکڑم سے بھری کچہری نہیں۔

سبھاش پردیپ گپتا نے اپنے مضمون میں "بیلچہ پارٹی" (خاکسار) کا ذکر کیا ہے گپتا جی بیلچہ پارٹی اور اس کے لیڈر عنایت اللہ خاں المشرقی سے واقف نہیں ہیں یہ وہ پارٹی ہے جو ملکی آزادی کے لیے سر کٹا رہی تھی، لاہور کی زمین اس کے خون سے لالہ زار ہو رہی تھی۔ کبھی یہ بنگال سے یو۔ پی تک پیدل مارچ کرتے تو کبھی اسکا قائد دنیا کے سائنسدانوں کو آسمان کی سیر کی دعوت دیکر نئی سائنسی ایجادات کی طرف متوجہ کرتا۔ آج موجودہ ہندستانی نظام تحفظ کے سایہ میں یہ لوگ ان تحریکوں کو بر بنائے جہل گالیاں دے رہے ہیں ملکی آزادی کی تحریک میں یہ پارٹی کسی سے پیچھے نہیں تھی۔

قومی یکجہتی مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلا کر، اس طرح کے مضامین لکھ کر رسالوں میں دو تین سپاہیوں کی لاشیں دکھا کر ہندو عوام کے سینوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کر کے قائم نہیں کی جاسکتی۔

ان سیکڑوں بیواؤں، ہزاروں یتیموں اور بے سہارا بوڑھے باپوں کی بھی کوئی تصویر چھاپنا تھی، تسلی دینا تھی، پی۔اے۔سی کی گولیوں کے ذریعہ جن کا سہاگ چھین لیا گیا، جن کے سروں سے شفقت کا سایہ اٹھ گیا، جن کے بڑھاپے کا سہارا ٹوٹ گیا۔ اگر آپ ایسا کرتے تو پتہ چلتا کہ آپ کا ذہن صاف ہے آپ کے اندر جذبہ انصاف ہے۔۔۔ اس کے بعد بھی کوئی سرکار اس اشتعال انگیزی پر پکڑنے والی نہیں۔ ہندی ماہنامہ "ارن" پر پابندی لگانے والی نہیں۔

قومی یکجہتی ہوگی مسائل کو سمجھنے سے، مسلمانوں کے درد کے ادراک سے، ان کی شکایات کی اصلیت جاننے سے اور ان کی عزت، آبرو، جان و مال کے تحفظ کے قوانین پر عمل در آمد سے۔

لیکن ۵۲ کروڑ ہندو آبادی کا ملک مکمل تاریکی کی طرف جارہا ہے۔ کاش اس کے عوام کو اپنے ہی مذہب کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا۔ نہ تو یہ گیتا کے بارے میں کچھ جانتا ہے

نہ کرشن مہاراج کی زندگی اور تعلیمات کے بارے میں۔ ہر سال یہ قوم راون کے پتلے
پھونک کر تخریبی ذہن کی عکاسی تو کرتی ہے مگر رام چندر کی تعلیمات، لچھمن کی سعادت،

- بھرت کے جذبۂ قربانی اور پرھلاد کے عقیدۂ توحید کے بارے میں اسے کچھ پتہ نہیں، گوتم بدھ جین اور گرو نانک جی کی عدم تشدد اور بھائی چارے کی تعلیمات سے بہت دور نکل چکی ہے یہ قوم۔

یہ ملک جہاں بڑے بڑے ڈاکٹر ہیں، (جن کی محبت کا مظاہرہ آسام میں ہوچکا ہے) پروفیسر ہیں، وکیل ہیں، سماج سدھارک ہیں، سیاسی لیڈر ہیں ونوبا بھاوے جیسے سنت و مہاتما، جانوروں کا خون دیکھ کر جو کانپ جاتے ہیں۔ ذرہ ذرہ میں خدا کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ ہر جاندار میں انھیں خدا دکھائی دیتا ہے ــــ لیکن مراد آباد میں مسلمانوں کے اندر، ان کا سیکڑوں کی تعداد میں بھگوان پولیس اور پی-اے-سی کے ہاتھوں قتل کردیا گیا، لیکن کسی ایک شخص نے اسکی مذمت نہیں کی بلکہ ہر جگہ، ہر لیڈر نے الٹے مسلمانوں کو مجرم ٹھہرایا ــــ ایسی حالت میں میرے پیارے وطن کا کیا ہوگا ــــ؟ کیا ہوگا ان شقی اور ظالم پڑوسیوں کے ہاتھوں ملت اسلامیہ ہند کا ــــ؟ خدایا مدد فرما اور میرے ہم وطنوں کے دلوں میں حق و انصاف کی شمعیں روشن کرکے ملک و قوم اور ملت اسلامیہ ہند کو تباہی سے بچالے اور انھیں قوموں کے درمیان یکجہتی اور رواداری کا حوصلہ دے۔

فسادات اور کانگریس

کانگریس بنیادی طور پر انگریزی سرکار اور اسکی پالیسیوں کی اصل وارث ہے انگریز نے مسلمانوں کو برباد کر کے اپنے قابو میں رکھنے کی جو پالیسی بنائی تھی سنہ ۱۹۳۷ء ہی سے کانگریس نے طاقت میں آتے ہی اس پر عمل شروع کر دیا تھا۔ بنگال اور پنجاب کی تقسیم اور آزادی کے بعد مسلمانوں کے خلاف سازشیں تیز کر دی گئیں۔ انگریز کے زمانہ میں لکھنؤ میں مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان نفرت کی بنیاد ڈالی گئی، تبرا ایجی ٹیشن میں سید علی ظہیر نے جو آزادی کے بعد یو۔ پی کی کانگریسی حکومت میں وزیر رہے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مدح صحابہ کے لیڈر مولوی عبدالشکور صاحب تھے جن کو سنیوں نے امام اہل سنت کا لقب دیدیا۔

لکھنؤ میں شیعہ سنّی فساد

لکھنؤ ایک تہذیبی مرکز ہے، مسلمانانِ ہند کا۔ لکھنؤ کی زبان، لکھنؤ کی رواداری اور لکھنو کی شائستگی پورے ملک میں مشہور ہے۔ یہاں لمبی مدت تک شیعہ نوابین کی عملداری رہی۔ اور اس بیچ کہیں شیعہ سنّی نفرت کا پتہ نہیں چلتا۔ شجاع الدّولہ کو افغانوں سے نفرت تھی لیکن اسکی بنیاد سیاسی تھی مذہبی نہیں۔ آپس میں شادی بیاہ کے رشتے، مشترکہ مساجد و نمازیں بلا کسی تفریق و نفرت کے ہوا کرتی تھیں۔

لکھنؤ شہر کے مغربی حلقہ میں شیعہ حضرات کی اچھی بھلی تعداد ہے آزادیٔ ہند کے بعد اور مولوی عبدالشکور صاحب کی وفات کے بعد حالات تقریباً بہتر ہو رہے تھے اور دونوں

فرقے تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے جس کے نتیجہ میں فیصلہ کن مسلم سیاسی طاقت بن رہی تھی۔ پورے شہر میں بز ۴۰ فی صد مسلمانوں کی آبادی ہے۔ سنہ ۱۹۶۷ء میں شہر لکھنؤ کی اسمبلی کی چاروں سیٹوں پر جن سنگھ اور پارلیمنٹ پر ایک آزاد ممبر کامیاب ہو گیا اس طرح شہر کی سیاسی زندگی سے کانگریس کا صفایا ہو گیا۔

اس کے بعد سنہ ۱۹۶۹ء میں درمیانی مدت کے چناؤ میں اسمبلی کی چاروں نشستوں پر بی۔کے۔ڈی (چودھری چرن سنگھ کی پارٹی) کا قبضہ ہو گیا۔ اب کانگریس کے لیڈروں کی برہمی کی انتہا نہ رہی۔

یو - پی میں کانگریس کے لیڈر چندر بھان گپتا نے اپنی سازشیں تیز کر دیں اور مسلمانوں کے دونوں فرقوں کے غلامانِ زر کو دو فرقوں کے درمیان نفرت و کشیدگی کی فضا پیدا کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ آخر کار فراستِ مومن مات کھا گئی۔ اپنوں نے ہی غیروں کا آلہ کار بن کر فساد کی آگ کو روشن کر دیا۔ سی۔ بی۔ گپتا کی فتح ہوئی اور اس طرح مسلمانوں کو اپنے ہی بھائیوں کے خلاف مالی منفعت کے بدلے خرید لیا گیا۔ مسلمانوں نے آزادانہ اپنے ہی بھائیوں کے مکانات جلائے۔ ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لیے شیعہ و سنّی مساجد کو بطور پہچان استعمال کیا۔ یوں تو شیعہ سنّی میں تفریق کی نہیں جا سکتی تھی۔ بس جو شیعہ مسجد سے نکلا اسے سنّی نے قتل کر دیا اور جو سنّی مسجد سے نکلا اسے شیعوں نے اپنا نشانہ بنایا۔

اس کے فوراً ہی بعد مئو (جو مسلمانوں کا ایک صنعتی قصبہ ہے) اور الہ آباد میں ہندو مسلم بلوے شروع کروا دئے گئے اور ان فسادات کے لیے لکھنؤ کے شیعہ سنّی جھگڑے کو ڈھال بنا کر پیش کیا گیا کہ جب مسلمان خود آپس میں جارحیت کر سکتے ہیں تو ہندوؤں کو کیسے برداشت کریں گے۔

ایک سوال کیا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ میں ہندو مسلم فساد کیوں نہیں ہوتا؟ اسکا سبب یہ ہے کہ لکھنؤ کی ہندو کاروباری برادری، "رستوگی" اور بنیا ہے اور اس نے پرامن طور پر مسلمانوں کی جائیدادیں اور محلات خرید لیے ہیں اور مسلمان معاشی بدحالی کا شکار ہو گئے

ہیں۔ نہ ملازمتوں میں ہیں نہ روزگار میں اس پر آپس میں دست و گریباں، مسلمانوں کے بیش قیمت مکانات اور جواہرات ان کے ہاتھوں سے نکل کر رستوگیوں کی تجوریوں میں پہونچ چکے ہیں اور جہاں مسلمان خود ہی ایک دوسرے کی گردن کاٹ رہے ہوں وہاں ان کا خون ہندو فرقہ پرستوں اور پولیس کی گردن پر کیوں ڈالا جائے۔

۲۶ / مئی سنہ ۱۹۶۹ء کے اس شیعہ سنّی فساد کے بعد آیتہ اللہ سید محمد کاظم شریعتمداری دارالتبلیغ اسلامی المکتب المرکزی قم نے سید علی نقی صاحب کو لکھنؤ خط لکھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس واقعہ سے ان کو کس درجہ صدمہ ہوا، موصوف نے لکھا اِنّما المومنونَ اخوۃٌ کو بھول کر اسلامی تعلیمات کے یکسر خلاف انتہائی نامعقول حرکت کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اور آگے چلکر لکھا۔۔۔ " آپس میں نہ جھگڑو پس نامراد ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی پس صبر کرو۔" ساتھ ہی کہا ایسی تدابیر اختیار کریں کہ ان باتوں کا سدّ باب ہو جائے جو ہم سب کے لیے باعث شرم ہے۔

اس کے علاوہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فریقین (شیعہ و سنّی) کا ایک اجتماع شہر قم ایران میں بھی منعقد ہو اور یہ حقیر نہایت مسرت اور خوشدلی کے ساتھ فریقین کے علماء کے استقبال کو آمادہ ہے۔ اور خدائے تعالیٰ سے امید ہے کہ شیعہ سنّی تعلقات کی ایک نئی طرح اور زیادہ مستحکم اور وسیع ہو جائے اور اپنے پیروؤں میں سے بعض ناہنجار لوگوں کی ناروا حرکات سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر اقدس ملول نہ ہو۔ اور سمجھدار اور عاقبت اندیش مسلمانوں کے لیے رنج اور شرمندگی کا باعث نہ ہو۔"

آزادی میں کس طرح انسانی ضمیر بیدار ہوتا ہے۔ یہاں سے ہزاروں میل دور بیٹھا ہوا ایک شیعہ عالم اس شرمناک حرکت پر بے چین ہو کر لکھنؤ خط لکھتا ہے اور صدق دل سے دونوں گروہوں کے عالموں کو مدعو کرتا ہے۔ اسکا کیا ردعمل ہندستان کے نلام علماء پر ہوا آجتک پتہ نہ چلا؟ لیکن آج بیس برس اس خط کو بیت چکے ہیں ہندستان کے علماء اپنے پیٹ کے لیے جس طرح جوڑ توڑ میں لگے ہیں اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر انھوں نے اس پر توجہ دی، اور اگر یہ بت ٹوٹ گئے تو ان کے کاروبار و تجارت کا کیا ہوگا؟

حاکمانِ وقت کی چاپلوسی، مسلم عوام سے غداری، جعل اور دھوکہ دیکر دوسروں کی کمائی کھالینا، ملکی قوانین خبیثہ سے خوف و دہشت اور دستورِ ہند سے غیر مشروط وفاداری یہ ہے مسلک ہندستان کے بیشتر علماء کا۔

صد شور فغاں اور ایک ہلکی سی کراہ
صد نالۂ غم، اور ایک حسرت کی نگاہ
نبضِ آفاق ڈوب جاتی ہے ندیم
بھیگی ہوئی آنکھوں سے نکلتی ہے جب آہ

فسادات کا سرکاری گوشوارہ

سنہ	فسادات کی تعداد
۱۹۶۶ء	۱۳۲
۱۹۶۷ء	۲۲۰
۱۹۶۸ء	۳۴۶
۱۹۶۹ء	۵۱۸
۱۹۷۰ء	۵۲۱
۱۹۷۱ء	۳۲۱
۱۹۷۲ء	۲۴۰
۱۹۷۳ء	۲۴۲
۱۹۷۴ء	۲۴۸
۱۹۷۵ء	۲۰۵
۱۹۷۶ء	۱۶۹
۱۹۷۷ء	۱۸۸
۱۹۷۸ء	۲۳۰
۱۹۷۹ء	۳۰۴
۱۹۸۰ء	۴۲۷
۱۹۸۱ء	۳۱۹
۱۹۸۲ء	۴۷۶

۵۱۰۶

۱۹۸۳ء کے ابتدائی چھ ماہ میں ۲۲۸

۱۹۸۶ء   ۲۲۴ء

۵۳۳۴

یہ فسادات کی وہ تعداد ہے جو سرکاری اعداد وشمار کے مطابق پارلیمنٹ وغیرہ میں وزارت داخلہ کی طرف سے جاری ہوئی ہے۔ سنہ ۱۹۶۶ء سے پہلے کے اعداد وشمار ہمارے پاس نہیں ہیں۔ لیکن سنہ ۱۹۶۶ء سے سنہ ۱۹۸۲ء تک کے اعداد وشمار کے مطابق فسادات کی تعداد پانچ ہزار ایک سو چھ ہوتی ہے۔

فساد ایک بیماری ہے جو بیمار ذہن کی علامت ہے اور ہندستان کا حکمراں اور سیاسی طبقہ اس بیماری کا بری طرح شکار ہوچکا ہے۔ دنیا کو دکھانے کے لیے تحقیقاتی کمیشن بھی بٹھائے جاتے ہیں مگر ان پر عمل نہیں کیا جاتا سنہ ۱۹۶۷ء میں رانچی (بہار) کے فساد کی تحقیقات کیلئے دیال کمیشن اور احمد آباد کے فساد کے لیے ریڈی کمیشن کی رپورٹ میں کہا گیا تھا... "انتظامیہ کو نئے سرے سے جانچا جائے تاکہ فساد زدہ علاقوں میں مسلم عوام میں سرکار کا بھروسہ بحال ہوسکے۔"

اسی طرح مدن کمیشن کی رپورٹ جو بھیونڈی اور جلگاؤں کے فسادات کے بارے میں تھی، اسکی رپورٹ میں بھی انتظامیہ کی طرف سے مسلم عوام کی بے چینی کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ان رپورٹوں کو نہ تو پڑھا گیا نہ ان پر عمل ہوا۔

۲۳ / اپریل سنہ ۱۹۸۲ء کو بڑودہ (گجرات) کے فساد کے بارے میں وزیر داخلہ مسٹر سیٹھی، وزیر دفاع وینکٹ رمن، اور وزیر سیاحت خورشید عالم خاں اور ہوم سکریٹری (مرکزی سرکار) نے کہا... "پولیس کی نااہلی کی بنا پر یہ فسادات ہوئے۔ اگر پولیس نے اپنے فرض کو نظر میں رکھتی تو اٹھارہ ماہ سے چلنے والے تناؤ کو فسادات میں تبدیل ہونے سے روکا جاسکتا تھا۔"

مئی سنہ ۱۹۷۰ء کا بھیونڈی کا فساد نہیں۔

ان پر فریب الفاظ کی سرکاری گونج دنیا کے کانوں تک پہونچ گئی لیکن سوال یہ ہے کہ مرکزی سرکار نے گجرات کی صوبائی سرکار کے خلاف کیا کیا؟

خلقت کا عجب حال تھا اس کوئے ستم میں
سایہ کی طرح دامن قاتل سے لگی تھی

۱۳/ مئی سنہ ۱۹۸۱ء کو بہار شریف کا دورہ کر کے کرناٹک کے سابق وزیر اعلیٰ اور کانگریس (یو) کے صدر آنجہانی مسٹر ارس نے کہا تھا...... "انتظامیہ کے پورے طور پر ناکارہ ہونے کے سبب فرقہ وارانہ فساد میں مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ لوٹ میں کانگریس(ا) کے ایم-ایل-اے شامل تھے اور ریلیف کمیٹی میں بھی وہ موجود تھے جس کے نتیجہ میں غریبوں کو کچھ مل نہ سکا۔"

۴/ جولائی سنہ ۱۹۸۱ء کو مدورائی میں وزیر مملکت ہوم مرکزی سرکار مسٹر مکوانا نے کہا کہ رام ناتھ پورم اور رینا کچھی پورم کے دنگوں میں مجھے لوگوں نے بتایا کہ پولیس نے ہریجنوں کے خلاف اونچی ذات والوں کا ساتھ دیا۔

۱۵/ اگست سنہ ۱۹۸۰ء کو باغپت کے جلسۂ عام میں مراد آباد کے فساد کے سلسلہ میں سابق وزیر اعظم چودھری چرن سنگھ نے کہا..... "پولیس اور پی-اے-سی اس کی ذمہ دار اور انسانی خون کا پیاسا گروہ ہے۔"

اس طرح وزیروں سرکاری عہدے داروں، غیر جانبدار کمیشنوں اور حزب اختلاف کے لیڈروں کے بیانات کی روشنی میں سرکاری مشینری، ضلع انتظامیہ پولیس اور نیم فوجی ملیشیا ہر جگہ قتل و غارت گری کی ذمہ دار قرار دی جاچکی ہے۔ اس کے مقابلہ پر بے دست و پا مسلمان کس طرح نکلیں گے اور عالمی برادری کب تک اس ظلم و بربریت کی خاموش تماشائی بنی رہے گی۔ آزادی کے بعد سے ابتک دسمبر سنہ ۱۹۸۲ء کے اردو بلٹز کے بیان کے مطابق بیس ہزار فسادات ہوچکے ہیں اور ان میں تقریباً دو لاکھ مسلمان قتل و برباد کئے جاچکے ہیں۔

دوسری طرف مشیت کا کارساز ہاتھ بھی کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے جس وقت بڑودہ میں

مسلمانوں کو برباد کیا جارہا تھا ۲۲ / نومبر سنہ ۱۹۸۲ء کو گجرات پر سمندر ابل پڑا جس میں ۱۱۵۰۰ انسان مر گئے، ایک لاکھ نوے ہزار جانوروں نے دم توڑ دیا ۱۴۷، اضلاع میں تین لاکھ ۵۷ ہزار مکانات صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ مگر جہاں سرکاری سطح پر مملکت کے کاموں سے خدا بید خل ہو، یہ کون دیکھے گا۔

کانگریس سرکار کے عہد زرّیں میں فسادات کا سالانہ اوسط ۳۲ رہا ہے۔ سنہ ۱۹۷۱ء میں جب محترمہ اندرا گاندھی غریبی ہٹاؤ کے نعرہ کے ساتھ اکثریت میں آئیں تو علی گڑھ میں آگ لگ گئی، مسز گاندھی کی حکومت اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف فسادات کا سنہرا زمانہ کہی جاسکتی ہے۔

دشت جمہوریت و عرصہ آزادی بھی
قفس شاخ گلستاں ہے کوئی کیا جانے

ستمبر سنہ ۱۹۶۹ء کا آخری ہفتہ شروع ہو چکا ہے، اکتوبر سے گاندھی جی صدسالہ تقریبات شروع ہونے والی ہیں، اور اس صدسالہ تقریبات کا افتتاح گجرات کے شہر احمد آباد نے مسلمانوں کی قتل و غارت گری سے کردیا۔ بلوائیوں کو عام چھوٹ دے دی گئی پولیس کی پشت پناہی کے ساتھ مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ عورتوں کی آبرو لوٹی گئی اور ان کو زندہ نذر آتش کردیا گیا۔ ہزاروں خاندان برباد کردئے گئے۔ ایک ہزار سے زیادہ مسلمانوں کی زندگیاں اس بربریت کا شکار ہو گئیں، اسپتال زخمیوں سے بھر گئے۔ یہ ہندستان کی آزادی کا بائیسواں سال تھا۔

ہندستان میں بکری کا گوشت چالیس روپیہ کلو ہے۔ مرغ پچاس روپیہ میں ملتا ہے، انڈے کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے ہے، کتے کے پلے دو دو ہزار روپیہ میں بکتے ہیں، لیکن مسلمان کی جان کی سیکولر ہندستان میں کوئی قیمت نہیں ہے!!!

احمد آباد کے فساد نے جب سنگین صورت اختیار کرلی تو انتظام فوج کو دیدیا گیا مگر فوج بھی اس پر قابو نہ پاسکی۔ تو مرار جی ڈیسائی سابق وزیر اعظم نے اس قتل و غارت گری کو روکنے کے لیے بھوک ہڑتال شروع کرکے اپنی زندگی داؤں پر لگادی اسکا اثر یہ ہوا

کہ لوگوں نے فسادات سے ہاتھ کھینچ لیا۔یہاں یہ بات ثابت ہو گئی کہ اگر ملک کے لیڈر سنجیدگی سے اس مسئلہ کو قومی مسئلہ بنا کر پیش کریں تو ہندو عوام کے ذہنوں کو بدلا جاسکتا ہے مگر جب خضر خود ہی بہکانے لگیں تو رہنمائی کون کرے۔

لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

۲۱ / جون سنہ ۱۹۶۹ء میں مدھیہ پردیش کے شہر اندور میں ہونے والے فسادات کے بارے میں ایک جائزہ کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ۷ لاکھ تیرہ ہزار کی املاک برباد کردی اور اس فساد نے ایسا رخ لیا کہ وہاں کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں نے جن پر کمیونسٹ پارٹی کا کنٹرول تھا مسلمان مزدوروں کے ساتھ کام کرنے سے انکار کردیا۔

مئی سنہ ۱۹۷۰ء میں بہار کے علاقہ پائیباسہ اور مہاراشٹرا میں جلگاؤں اور بھیونڈی میں فسادات کے دوران قتل و غارت گری ہوئی۔جلگاؤں کے ایک مکان میں جہاں بارات ٹھہری ہوئی تھی۔مکان کو بند کرکے آگ لگادی گئی جس میں سترہ مسلمان جل کر جاں بحق ہوگئے۔

اور یہ اسوقت ہو رہا ہے جب دنیا کے نقشہ پر پچاس مسلم ریاستیں اور ہندستان کی پارلیمنٹ میں مختلف سیاسی پارٹیوں کے ۷۱ مسلم ممبران پارلیمنٹ موجود ہیں۔

داستان کربلائے مراد آباد

جولائی سنہ ۱۹۸۰ء کے آخری ہفتہ میں ایک ہندو کاروباری نے ایک مہتر کی لڑکی بھگانے کی کاروائی کی۔ اس کے کارخانے میں دو مسلمان کاریگروں سے پولیس نے پوچھ گچھ کی۔ لیکن برتن کے کاریگر اس تاجر کے رازداں تو ہو نہیں سکتے تھے۔ اس پر پولیس نے ان کو زدوکوب کیا۔ شہر کے دوسرے لوگوں کی مداخلت سے بھگائی گئی لڑکی دو چار روز کے بعد واپس مل گئی مگر ہندو تاجر چاہتا تھا کہ اسکی شادی نہ ہو اور اس طرح وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کرتا رہے، لیکن اس کے والدین نے فوری طور پر اسکی شادی کردی۔ یہ بارات مغرب کے وقت باجوں کے ساتھ روانہ ہوئی ہندو تاجر نے اپنے آدمی لگا رکھے تھے۔ عین مغرب کے وقت ایک مسجد کے نیچے مہتروں کی بارات نشے باز باراتیوں کے ساتھ باجے بجاتی ہوئی پہونچ گئی، ایک رکشے والے نے جو نشے میں تھا۔ باراتیوں سے جھگڑا شروع کردیا کہ مسجد کے سامنے باجا نہیں بج سکتا، شور مچ گیا، مہتروں اور مسلمانوں میں مار شروع ہوگئی اس روز کسی طرح پولیس نے قابو پالیا۔ مہتر ہندو ہریجنوں کا ایک طبقہ ہے۔ مراد آباد کے اعلیٰ حکام بھی ہریجن تھے۔ لہٰذا ان لوگوں نے پروگرام بنالیا کہ عید کے دن اسکا بدلہ لے لیا جائے گا۔

مراد آباد میں عید سے ایک روز قبل سرکاری طور پر اعلان کردیا جاتا ہے کہ عید کے دن دس بجے دن تک کوئی جانور عیدگاہ کی سڑک پر نہیں آئے گا۔ عیدگاہ کی پشت پر پنجابی رفیوجیوں کی آبادی ہے۔ اس سے ملی مسلم آبادی کے برابر مہتروں کی بستی ہے، اسی مہتروں کی بستی سے ایک شخص سور لیکر نکلتا ہے عیدگاہ کی پشت والی ہندو کالونی سے سور نکال کر سڑک پر آجاتا ہے سور نمازیوں کی صف میں گھسیٹر دیا جاتا ہے موقع پر موجود پولیس اسے روکتی نہیں ہے اور مسلمانوں کے شکایت کرنے پر ڈیوٹی پر موجود سپاہی

مسلمانوں سے بدکلامی کرتے ہیں بس مار شروع ہو جاتی ہے اور نمازیوں پر گولیاں برسنے لگتی ہیں۔

۸/ اپریل سنہ ۱۹۸۰ کو فیروز شاہ کوٹلہ دہلی میں جنتا پارٹی کے سابق جن سنگھ گروپ کا جلسہ ہوا۔ جس میں میں نے بھی شرکت کی اور تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا ـــــ "ہندو مسلمان کا جھگڑا سنہ ۱۸۵۷ کے بعد ختم ہو گیا۔ پنڈت اٹل بہاری باجپئی، مسٹر اڈوانی اور راج ماتا سندھیا جو اسٹیج پر موجود تھے کو مخاطب کرتے ہوئے میں نے کہا اگر آپ ہندو راشٹر بھی بنانا چاہتے ہیں تو مسلمانوں کی آبادی پندرہ سولہ فی صد سے زیادہ نہیں ہے۔ ملک کا ۸۵ ہندو آپکو ہندو راشٹر بنا کر نہیں دیتا آپ مسلمان کو کیوں مارتے ہیں۔ مسلمان آپ کے ارادوں کی تکمیل کی راہ میں کہاں کھڑا ہے؟ اگر یہ پندرہ فی صد ووٹ آپ کو مل بھی جائے تب بھی آپ کامیاب نہ ہوں گے۔ ہندستان کا مسلمان ظلم و جبر کی لڑائی میں آپ کے کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنے کو تیار ہے آپ اپنے سینہ کو پرانی نفرتوں سے پاک کر کے ہمیں اپنے کلیجہ سے لگانے کا کام تو کریں۔ ایک سیاسی پارٹی کے لیے ضروری ہے کہ وہ سبھی طبقوں کے مفادات کا خیال رکھے اس کے بغیر سیاسی کامیابی بہت مشکل ہو گی۔"

اس کے بعد ہی اٹل بہاری باجپئی سابق وزیر خارجہ (سابق وزیر اعظم) نے تقریر کی اور کہا ـــــ "ہم نے پرانی جن سنگھ کو دفن کر دیا اور جو لوگ اس پالیسی میں یقین رکھتے ہوں ان کے لیے بھارتی جنتا پارٹی میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہم ہر آنکھ کا آنسو پوچھیں گے اور سب کو ساتھ لیکر چلیں گے۔"

جون سنہ ۱۹۸۰ میں اٹل بہاری باجپئی کی قیام گاہ رائے سینا روڈ نئی دہلی میں ملاقات کے دوران میں نے پھر کہا ـــــ "آپ جس لائن پر پارٹی کو لے جانا چاہتے ہیں، آپ کی پارٹی کے لوگ چلنے نہ دیں گے۔"

انھوں نے جواب دیا ـــــ "پارٹی کو انھیں لائینوں پر چلنا ہو گا، ہم اپنا راستہ بدلیں گے نہیں۔"

لیکن ۱۳/اگست سنہ ۱۹۸۰ء کے مراد آباد کے واقعہ کے بعد اٹل جی بھی بدل گئے اور اپنی پارٹی کے تنگ دل گروپ کے دباؤ کے آگے جھک گئے اور کہنے لگے کہ اگر مسلمانوں کو پی-اے-سی (اتر پردیش کی نیم فوجی ملیشیا) میں لیا گیا تو قومی یکجہتی کو نقصان پہونچے گا۔

اسلئے کہ آل انڈیا مسلم مجلس نے پی-اے-سی کو توڑ کر فساد مخالف فورس بنائے جانے کا مطالبہ کیا تھا جس میں ۲۵ فی صد مسلمان اور ۲۵ فی صد ہریجن بھرتی کئے جانے کی مانگ (لکھنؤ سے دہلی تک پیدل مارچ کر کے) کی تھی۔

ان کے اس بیان کے بعد میں نے بھارتی جنتا پارٹی سے استعفاد یتے ہوئے انھیں لکھا کہ اگر پولیس اور پی-اے-سی میں مسلمانوں کے لیے جانے سے قومی یکجہتی کو نقصان پہونچے گا تو خان محمد عاطف کے آپ کے ساتھ رہنے سے جبکہ وہ مسلمان ہے آپ کی پارٹی کو فائدہ نہیں پہونچ سکتا؟

میرے ساتھ الٰہ آباد کے متھرا پرشاد سنہا پرانے کانگریسی ایک اچھے دوست کی طرح رہتے تھے۔ انھوں نے اس کے بعد مجھ پر ڈورے ڈالنا شروع کئے اور مراد آباد کے فساد کی انکوائری کے لیے اور وہاں امن کی بحالی کے لیے کمیٹی کی تشکیل کی منظوری اندرا گاندھی اور وشوناتھ پرتاپ سنگھ وزیراعلیٰ اتر پردیش سے حاصل کی۔ جس میں متھرا پرساد سنہا، محترمہ انوارہ تیمور (جو بعد کو آسام کی وزیراعلیٰ مقرر ہوئیں) باندہ کے وکیل مسٹر راجن جو راجیو گاندھی کے دوست ہیں، عزیز قریشی بھوپال مدھیہ پردیش اور میں شامل تھے۔

یہ کمیٹی لکھنؤ سے ۵/اکتوبر سنہ ۱۹۸۰ء کو پورے سرکاری جاہ و حشم کے ساتھ روانہ ہوئی۔ دو سرکاری گاڑیاں ہمارے ساتھ تھیں۔ لکھنؤ سے مراد آباد تک ڈاک بنگلے اور سرکٹ ہاؤس بک تھے ہر ضلع کے ڈی-ایم نے اپنے ضلع کی سرحد پر استقبال اور سرحد کے باہر الوداع کہا۔ رات بریلی میں قیام ہوا۔ سویرے مراد آباد کے لیے روانہ ہوگئے۔ مراد آباد میں دوپہر کا کھانا اور چار بجے سے مختلف تنظیموں اور افراد سے ملاقات ہونا تھی۔

سب سے پہلے مراد آباد کے ڈی-ایم نے جو جوان آدمی تھا ہم لوگوں پر نفسیاتی حملہ

کیا اور کہا کہ سور کی بات سب کرتے ہیں مگر کوئی یہ نہیں بتاتا کہ دیکھا کس نے؟ یہ کہہ کر اس نے پیر پر پیر رکھ کر سگریٹ سلگایا، اور اپنی رائے دینے لگا۔ میرے ساتھی خاموش تھے۔

میں نے ڈی۔ ایم ونود کمار گپتا کی بات کاٹ کر کہا۔۔۔ "مسٹر گپتا تمھیں کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے۔ اس سے پہلے جو لوگ آئے تھے وہ ایم۔ پی اور ممبران اسمبلی تھے۔ لیکن میں آزاد آدمی ہوں۔ تم سرکار کے ملازم ہوئے نا؟"

وہ بولا۔۔ "جی ہاں صاحب۔"

میں نے کہا۔۔ "سرکار کا ملازم یہ بھی نہیں جانتا کہ اپنے آقا کے مہمانوں سے کیسے پیش آیا جائے۔۔۔ تم نے سور کی بات چھیڑ دی ۱۸/ اگست کو راجیہ سبھا کا وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کا بیان تم نے نہیں دیکھا جس میں انھوں نے کہا ہے۔۔۔ ابھی اس شخص کا پتہ نہیں چلا جو جماعت میں سور لیکر گیا تھا۔"

مسٹر گپتا، ہم تم سے نہیں۔ یہاں کی انجمنوں اور تنظیموں سے معلومات لینے آئے ہیں تم تو سرکار کو اپنی رپورٹ دے چکے لہٰذا تم اسکا انتظام کرو۔" بس وہ قابو میں آ گیا۔۔۔ محکمہ آبپاشی کے ڈاک بنگلہ میں سب سے پہلے گرو سنگھ سبھا کے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتانا شروع کیا کہ مسلمانوں نے چالیس ہزار روپیہ بیگھا تک زمین خرید لی۔ اور شہر کے تین طرف مسلم کالونیاں اور یونیورسٹیاں بننے لگیں تو ہندوؤں کو خوف ہوا کہ تین طرف سے مسلمان انھیں گھیر رہے ہیں۔ اندر اندر خوف کی یہ لکیریں رینگنے لگیں۔ جس نے آگے چلکر فساد کا روپ لے لیا۔

مراد آباد کے ممبر اسمبلی حافظ صدیق صاحب جمعیت العلماء کے آدمی ہیں اور کانگریس کے ایم۔ ایل۔ اے۔ کانگریس کے پرانے کارکن حکمت اللہ، مسٹر الطاف، امام عیدگاہ اور دیگر مسلمانوں نے بتایا کہ تھانہ گلشہر میں "جو شیوں والی مسجد" اور "منجھولے پاور ہاوس" کے قریب والی مسجد شہید کر دی گئیں اور ان کی جگہ مندر بنا دئے گئے۔

۱۰/ اکتوبر کو ہم لوگ دہلی یو۔ پی نواس (اتر پردیش سرکار کی عمارت) پہونچے

وہاں کمرے بک تھے۔ اسی دن دوپہر میں گیانی ذیل سنگھ وزیر داخلہ سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے طے کیا تھا کہ انوارہ تیمور ان سے بات کریں گی بیچ میں ہم لوگ ضرورت ہوگی تو مداخلت کریں گے۔ محترمہ انوارہ تیمور نے مساجد کی بے حرمتی اور مندروں میں تبدیل کئے جانے کی بات وزیر داخلہ سے کہی۔ انھوں نے کہا ہم ان مساجد کو بحال کر کے سرکاری خرچہ پر بنوادیں گے۔

میں نے کہا آپ صرف واپسی اور واگذاری کا حکم دیدیں تعمیر کا کام مسلمان خود کروالیں گے۔

انھوں نے وعدہ کیا کہ مسجدیں مسلمانوں کو ملیں گی۔ لیکن ۴/ستمبر سنہ ۱۹۸۰ء کو پانچ ماہ بعد پارلیمنٹ میں مراد آباد کے مسئلہ پر بحث ہوئی تو گیانی ذیل سنگھ نے ان الزامات کو جھوٹ بتایا کہ مساجد کو مندروں میں بدلا گیا ہے۔

اب انوارہ تیمور آسام کی وزیر اعلیٰ ہوچکی تھیں میں نے انھیں خط لکھا کہ آپ کہیں کہ گیانی ذیل سنگھ کا بیان گمراہ کن ہے میں نے خود اکتوبر میں وزیر داخلہ کو بتایا تھا کہ مساجد کو مندروں میں بدلا گیا ہے ورنہ آپ عذاب الٰہی میں پکڑ جائیں گی، انھوں نے میرے خط کا جواب نہیں دیا۔ لیکن چند ہی مہینوں کے بعد وزارت اعلیٰ کی کرسی کھسک گئی۔

۱۱/یا ۱۲/اکتوبر سنہ ۱۹۸۰ء کو یو۔ پی۔ نواس میں وشوناتھ پرتاب سنگھ وزیر اعلیٰ یو۔ پی سے ملاقات ہوئی۔

انھوں نے مجھ سے کہا..... "سنہا صاحب نے آپ کی بڑی تعریف کی ہے آپ ہمارے ساتھ کام کریں۔"

میں نے جواب دیا..... "سنگھ صاحب میں نے اسی مراد آباد کے مسئلہ پر بھارتی جنتا پارٹی کو چھوڑا ہے۔ مراد آباد کے مسلمانوں نے کانگریس (ا) کے کارکنوں اور بھارتی جنتا پارٹی کے لوگوں کی شکایت کی ہے کہ فسادات میں دونوں کا تال میل تھا۔ پھر اگر آپ مراد آباد کے لوگوں کے لیے کچھ کردیں تو مجھے آپ کے ساتھ کام کرنے میں خوشی ہوگی۔"

وزیراعلیٰ نے کہا۔۔۔ "ہاں آپ بتائیں ہم نے اسی لیے بھیجا تھا آپ لوگوں کو۔"

میں نے کہا۔۔۔ "اگر آپ چار باتیں کردیں تو میری راہ کی دشواریاں دور ہو جائیں گی اور وہ یہ کہ کرفیو کی موجودگی میں ۱۳٦ دوکانیں مسلمانوں کی لوٹ لی گئیں، کرفیو کا مطلب یہ ہے کہ شہر سرکار کے قبضے میں ہے اسلئے ان دوکانوں کے مالکوں کو پورا معاوضہ جتنا وہ بتائیں سرکار ادا کردے اسلئے کہ یہ لوٹ اسکی نگرانی میں ہوئی ہے۔ دوسری بات یہ کہ عام حالات میں جن لوگوں کا مال و اسباب برباد ہوا ہے انھیں پانچ برس کے لیے بلاسودی قرضے دلانے کی منظوری دے دیں۔ تیسرے یہ کہ جن خاندانوں کے افراد مارے گئے ہیں اس خاندان کے ایک ایک فرد کو سرکاری ملازمت میں لے لیں۔ اور چوتھی بات جو آپ کے وزیر داخلہ مرکزی سرکار سے محترمہ انوارہ تیمور کہہ چکی ہیں دونوں مسجدوں کی مسلمانوں کو واپسی ہے۔"

اس گفتگو کے وقت ہم لوگوں کے علاوہ علی گڑھ ضلع کے ایم-ایل-اے کانگریس (ا) مسٹر انوار بھی موجود تھے۔ انھوں نے بھی تائید کی۔ لیکن وزیراعلیٰ وی-پی-سنگھ نے روایتی سرکاری جواب دیا "دیکھیں گے۔"

میں نے فوراً کہا۔۔۔ "گاندھی جی اپنے بندروں کے ذریعہ ایسا کرنے کو منع کر گئے ہیں۔" سب لوگ ہنس دئے بات آئی گئی ہو گئی۔ اور کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

کربلائے مراد آباد اور سیاسی لیڈروں کے بیانات تیرو نشتر کے ساتھ

۱۸/اگست سنہ ۱۹۸۰ کو وزیر اعظم اندرا گاندھی کا راجیہ سبھا میں بیان۔

(۱) اقلیتی جانوں کے تحفظ کی حکومت ضامن۔ ساری حفاظتی فورس کو ذمہ دار قرار دینا غلط۔

(۲) اقلیتی فرقہ کو کسی دوسرے فرقہ کی طرح ملک کی ترقی میں حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔

(۳) کس نے جان بوجھ کر (سور جماعت میں پہونچائے) یہ بات معلوم نہیں ہو سکی۔

(۴) لیکن اقلیتوں پر بھی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ انھیں اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کا جن میں جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا حق بھی شامل ہے، لیکن مشتعل ہونے یا اشتعال دلانے یا مبالغہ آرائی کا طریقہ اختیار کرنے سے ان کا مقدمہ کمزور ہوگا اور کمزوری سے فائدہ اٹھانے والے ان کی جائز باتوں اور شکایتوں کو بھی ناجائز قرار دیں گے۔ ان کی مصیبت اور مظلومیت میں انھیں کو قصوروار ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔

(۱) چھتیس برسوں میں اس تحفظ کی عملی ضمانت نہ مل سکی، حفاظتی فورس کا کون سا حصہ مسلمانوں کے قتل کا ذمہ دار ہے۔ نشاندھی کی جائے۔

(۲) اقلیتی فرقہ کو ملک کی ترقی میں حصہ لینے کا حق تو دینے کو تیار ہیں لیکن اقلیتیں خود ترقی کریں اسکا حق انھیں نہیں پہونچتا۔

(۳) پانچ دن کے بعد بھی سور جماعت میں لانے والے کا پتہ نہیں چلا لیکن اس واقعہ سے تھوڑے دنوں پہلے دہلی میں ایک پاگل نے محترمہ پر چاقو پھینکا تھا تو دوسرے دن

بڑودہ اور گجرات تک گرفتاریاں عمل میں آ گئیں تھیں۔

(۴) مسلمان اپنے اوپر ہونے والے حملوں کا دفاع نہ کرے، چوٹ لگے مگر چلائے نہ ورنہ لوگ مظلوم کو بھی ظالموں کی صف میں رکھ دیں گے یہ کون سا انسانی قانون ہے؟

۱۹/اگست۔۔۔ گیانی ذیل سنگھ وزیر داخلہ کا بیان:

(۱) "کچھ عناصر شرارت پر تلے ہیں اور بعض ممالک ہندستان کو ترقی کرنے دینا نہیں چاہتے۔

(۲) کوئی ملک قومی پرچم کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔

(۳) اسلحہ پر مار کے ہیں، جو جدید ساخت کے نہایت پیچیدہ ہیں۔"

(۱) آپ خود اپنی تنگ دلی سے ہندستان کی ترقی کے لیے خطرہ ہیں۔

(۲) کیا مسلمانوں کے خون سے زیادہ قومی پرچم مقدس ہے؟ جو پرچم مسلمانوں کے خون میں تر ہو مسلمان اسکی عزت نہیں کر سکتے اور پھر جس کے گھر میں لاش پڑی ہوگی کیا وہ ۱۵/اگست کو قومی پرچم کو سلامی دینے نکلے گا؟

(۳) یو۔ پی کے وزیر اعلیٰ اسکا جواب دیں گے۔

پی۔ سی۔ سیٹھی وزیر تعمیرات عامہ (اس وقت ان کے پاس یہی عہدہ تھا)

(۱) "حکومت کو ناکام بنانا اور ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا مقصد۔

(۲) یوم آزادی کے دن احتجاج مناسب نہیں تھا۔"

(۱) یہ مقصد کس کا ہے حضور؟

(۲) سیٹھی صاحب آپ کے یہاں موت ہو جائے یا گھر میں آگ لگ جائے تو کیا آپ یوم آزادی کی تقریبات منائیں گے؟

لکھنؤ کے مسلم دانشوروں کی غیر دانشمندانہ تجاویز ۱۸/اگست

(۱) "ان فسادات کے پیچھے ان طاقتوں کا ہاتھ ہے جو یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ یہ حکومت اقلیتوں کی جان و مال کا تحفظ نہیں کر سکتی۔"

(۱) کفن و کافور کی بو آتی ہے، اس بیان سے۔

محسنہ قدوائی ممبر پارلیمنٹ

(۱) "فرقہ پرور طاقتیں ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتی ہیں۔

(۲) حکومت کی تشویش کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ مسز گاندھی نے ۱۵/ اگست کی تقریر مراد آباد کے حادثہ سے شروع کی۔"

(۱)(۲) دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔

مسٹر کھنا لوکل سلف وزیر (اتر پردیش)

(۱) "اقلیتیں امن قائم رکھیں۔"

(۱) آپ گولیا چلائیں اور بدامنی پیدا کریں۔

کانگریس (ا) ایم۔ایل۔اے (یو۔پی) دویندر پانڈے (جہاز کے کانگریسی اغواکار)

(۱) "پولیس پر منظم حملہ بیلچہ پارٹی (خاکسار) نے کیا۔"

(۲) حکومت کو چاہئے بیرونی امداد سے چلنے والی مراد آباد کی یونیورسٹیوں کا پتہ چلائے۔

(۳) اقلیتی فرقہ کے لیڈر خاکسار پارٹی کو پولیس کے خلاف بغاوت پر ابھار رہے ہیں

(۱) ہائے رے مسلمان کا خوف، کہیں خاکسار منظم و متحرک ہوتے تو کیا ہوتا؟

(۲) ابھی تو ان کی بنیاد پڑی ہے رگ گل سے بلبل کے پر نہ باندھیں۔

(۳) اقلیتی فرقہ کے لیڈر اور بغاوت وہ سرکار کے دربار اور حزب اختلاف کے ادبار میں گرفتار ہیں۔

بھوپیش گپتا کمیونسٹ

(۱) "سیکولر عناصر کو یکجا کرنے کی ضرورت ہے۔"

(۱) یہی اہم ضرورت ہے مسلمانوں کے خون کی قیمت کون ادا کرے گا؟

ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کے خبرنامہ بحوالہ قومی آواز ۲۷/ اگست سنہ ۱۹۸۰ء

اس پارٹی کے خبرنامہ میں کہا گیا ہے کہ حالیہ زمانہ میں دوسرے ملکوں سے برابر بڑی رقمیں آتی رہی ہیں جو فرقہ وارانہ تشدد کے ان واقعات میں بڑی حد تک وسیلہ بنی ہیں۔

ہر ہندو لیڈر کو مسلمان ہی مجرم وظالم دکھائی دیتا ہے جس میں عرب ملکوں سے آنے والے امدادی رقوم کا بڑا ذکر ہے کمیونسٹ پارٹی کو بھی دوسروں کی طرح یہ رقوم فساد کا سبب دکھائی دینے لگیں یہ ہندو ٹائپ آف کمیونزم کی جیتی جاگتی مثال ہے۔

اتر پردیش لوک دل

(۱) "ریاست کے نظم و نسق پر کوئی سیاسی کنٹرول نہیں رہ گیا"

(۱) یہ تھا کب؟

پوسٹ مارٹم کی زبان ڈاکٹری رپورٹ

۹، افراد گولیوں سے عید گاہ میں شہید ہوئے۔ ۵۲ کی شہادت پتھراؤ اور کچل کر ہوئی۔ یہ تعداد ۱۶۱ ہوتی ہے جبکہ سرکاری طور پر مرنے والوں کی تعداد ۱۴۲ بتائی گئی جن میں ۱۲۱ مسلمان ہیں۔

زخمیوں میں مسلمان ۷۵ اور سولہ سو گرفتار کئے جانے والوں میں ۷۵ فی صد مسلمان۔

پوسٹ مارٹم اور سرکاری رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ نہ جانے کتنی لاشیں تلف کردی گئیں۔

جنتا پارٹی کے ایم - پی شہاب الدین کا بیان

(۱) "پولیس مراد آباد میں قتل غارت گری کی ذمہ دار۔

(۲) کسی مجسٹریٹ نے فائرنگ کا حکم دئے جانے کی ذمہ داری قبول نہیں کی۔"

(۱)(۲) نہایت اہم نکات۔

اندرا گاندھی اور بھارتی جنتا پارٹی کے اڈوانی میں مماثلت

مسٹر اڈوانی نے راجیہ سبھا میں کہا۔

(۱) "پی-اے-سی اس کی ذمہ دار ہے۔ میں شہاب الدین کے بیان سے اتفاق نہیں کرتا۔

(۲) یو-پی سرکار کو پہلے سے علم تھا کہ مراد آباد میں گڑبڑی کی کھچڑی پک رہی ہے۔"

(۱) کیا اس کے ذمہ دار پھر آپ ہیں۔
(۲) یو۔ پی سرکار اور آپ دونوں کو اس کی خبر تھی۔
لوک دل کے ایم۔ پی (راجیہ سبھا) شاہی
(۱) "ہندو اور مسلمان نہیں، امریکہ اور پاکستان ہندستان میں ہنگاموں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔"
(۱) یہ سازشیں آپ ہی کے ذریعہ انجام پاتی ہیں۔
وزیر اعلیٰ اترپردیش وشوناتھ پرتاپ سنگھ
(۱) "نہ غیر ملکی اسلحہ برآمد ہوئے نہ اسٹین گن۔
(۲) حکومت اقلیتوں کے تحفظ کا پورا عزم رکھتی ہے۔"
(۱) گیانی جی کو بتائیں (گیانی ذیل سنگھ کو)
(۲) عمل سے نہیں، گفتگو میں۔
اٹل بہاری باجپئی سابق وزیر خارجہ
(۱) "تشدد کی روک تھام کے لیے بار بار فوج بلانا اچھا نہیں۔
(۲) پولیس اور پی۔ اے۔ سی میں مسلمانوں کے لیے جانے سے قومی یکجہتی کو نقصان پہونچے گا۔
(۱) فوج کہاں بلائی گئی؟
(۲) قومی یکجہتی کا شاید ملک کی مختلف قوموں کا باہم یکجا ہو کر ایک سمت میں چلنے کا نام ہے (قوموں کی یکجہتی)
ہیم وتی نندن بہوگنا ممبر پارلیمنٹ
(۱) "مراد آباد کے لیے ریلیف کمیٹیاں بنائی جائیں۔"
(۱) جو مسلمانوں کے خون میں روٹیاں ڈبو کر کھائیں۔
کانگریس (ا) اقلیتی شعبہ کے چیرمین خورشید عالم خاں کو دیکھیں۔
(۱) "ہنگامہ کرنے والوں کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔

(۲) نظم و نسق کے ذمہ دار جرائم کرنے والوں کو پکڑیں اور عبرتناک سزائیں دیں۔
(۳) ایمانداری اس بات کے اعتراف کی متقاضی ہے کہ مسلم فرقہ کے بعض عناصر بھی اشتعال دلانے والے ایجنٹوں کی چالوں میں آگئے اور جذبات سے بے قابو ہو کر ایسی حرکتیں کر ڈالیں جن سے اقلیتوں کی شہرت داغدار ہوئی اور سخت مصیبت میں مبتلا ہوئے۔"

(۱) مگر بتائیں نہیں،
(۲) یہ کون مخلوق ہے؟ اور عبرت ناک سزاؤں کا قانون کہاں ہے؟
(۳) اندرا گاندھی کی راجیہ سبھا کی تقریر کا چربہ، اقلیتوں یعنی مسلمانوں کی شہرت آزادی کے بعد گردن جھکا کر پولیس اور بلوائیوں کی مار کھا لینے میں رہی ہے۔ مراد آباد میں انھوں نے اپنے دفاع کیلئے ہاتھ کیوں اٹھا لیے۔

یو۔ پی کانگریس (ا) کے صدر دھرم ویر
(۱) "ایک منصوبہ کے تحت یہ فسادات اسلئے کرائے گئے تاکہ کانگریس اپنے وعدے نہ پورے کر سکے۔"

(۱) اس منصوبہ میں کیا آپ شریک تھے، کچھ نہ کرنے کے ہزار بہانے۔

بھارتی جنتا پارٹی کے نائب صدر رام جیٹھ ملانی
(۱) "حکومت اقلیتوں کے حقوق چھین رہی ہے۔"

(۱) بے معنی گفتگو۔

یشونت راؤ چوان سابق مرکزی وزیر نے کہا
(۱) "مجھے حیرت ہے کہ حکومت ان مجرموں کا نام کیوں نہیں لیتی جو ان فسادات کی پشت پر ہیں اور وہ ایسے مبہم بیان کیوں دے رہی ہے کہ غرض پرست عناصر اور غیر ملکی ہاتھ فسادات کی پشت پر ہیں۔"

(۱) سب سے معقول بات بات وزارت سے ہاتھ دھونے کے بعد۔

۱۶ / اکتوبر سنہ ۱۹۸۰ کو مراد آباد میں محترمہ اندرا گاندھی نے پہلے والے بیان کی تردید کی کہ اس میں باہر کا ہاتھ ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ مسلمانوں کی آبادی

آزادی کے بعد دو گنی ہو گئی ہے۔ وہ اپنی شکایات بتائیں اور اپنے شکوک دور کر لیں۔

آزادی کے بعد مسلمانوں کی آبادی بڑھنے کا راز یہی ہے کہ انھیں بے دریغ قتل کیا گیا ہے، یہ اصول فطرت ہے، کتیا ایک وقت میں دس، بارہ بچے دیتی ہے اور بکری دو اور ہر روز لاکھوں بکریاں قربان ہو جاتی ہیں پھر بھی بکریوں ہی کے گلے دکھائی دیتے ہیں کتوں کے نہیں۔

اسی کے دو دن بعد دسہرے کے موقع پر آر۔ایس۔ایس کے سربراہ بالاصاحب دیورس نے ناگپور میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔۔۔ "مسلمانوں کو داماد بنا کر نہیں رکھا جاسکتا۔"

میں کہتا ہوں مسلمان ایک زہر ہے لیکن اس زہر کو اب پینا ہے۔ زہر پینے کی ہندو دیومالا میں روایت رہی ہے۔ سمندروں کے متھنے کے بعد نکلنے والے زہر کو شنکر جی نے پی لیا تھا۔ ہندو لیڈروں کو کسی طرح تو مسلمانوں کو رکھنا ہوگا۔ داماد نہ بنائیں، پڑوسی کی طرح، چھوٹا بھائی بنا کر، اچھوت بنا کر، قتل گاہوں میں کہیں تو جگہ دینا ہوگی یا آبادیوں سے الگ محفوظ علاقے بنا کر۔

۳۰/ اکتوبر سنہ ۱۹۸۰ کو پھر مراد آباد میں فسادات شروع ہوئے۔ جن میں سولہ جانیں گئیں اور ۴۲۵ افراد گرفتار کئے گئے۔

اسی بیچ فتح پور سیکری میں اندرا گاندھی کے ہم مزاج حکمراں شہنشاہ اکبر کا "جشن صلح کل" منایا جا رہا تھا۔ مراد آباد میں شہداء کو نظر انداز کر کے رنگ رلیاں منائی جا رہی تھیں۔ جس پر ایک کروڑ تیس لاکھ روپیہ پانی کی طرح بہا دیا گیا، لیکن مراد آباد کے غریب آج بھی ایڑیاں رگڑ رہے ہیں اور روٹی روزی کے لیے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں۔

اپنی بداعمالیاں

اپنی بداعمالیوں کو چھپانے کے لیے غیرملکی ہاتھوں کی کہانی گڑھی گئی۔ تقسیم کے بعد بے شمار مسلم علاقوں کو اکوائر کرلیا گیا۔ تقسیم کے بعد مراد آباد کے برتنوں پر ہندو تاجروں کا قبضہ ہو گیا اور مسلمان مزدور بن گیا۔ لیکن آہستہ آہستہ مسلمانوں کے کچھ لڑکے پڑھ لکھ کر عرب ممالک میں چلے گئے اور انھوں نے براہ راست کام شروع کردیا۔ کارپوریشن بننے کے بعد کاریگروں کو سرکاری قرضے بھی ملنے لگے۔ ایک ارب چالیس کروڑ کے منافع میں ایک ارب پندرہ کروڑ کاریگروں کے پاس چلا گیا تو مسلمانوں کی مالی حالت بہتر ہوئی اور انھوں نے شہر کے باہر زمین خرید کر پھیلنا شروع کردیا جو فساد کا سبب بن گیا اس فساد کے پیچھے دراصل رفیوجی طبقہ کی برتنوں کی صنعت پر قبضہ کی خواہش اور مسلمانوں کو معاشی طور پر غلام بنانے کا جذبہ پوشیدہ رہا ہے یہ فساد اقتصادی فرقہ پرستی سے جڑا ہوا ہے اور جہاں کہیں مسلمان معاشی بنیادوں پر کھڑے ہوتے ہیں انھیں جلاکر بھسم کردیا جاتا ہے۔

وہ کانگریسی جنھوں نے فساد میں حصہ لیا

۱۔ دیانند مراد آباد شہر کانگریس (ا) پریسیڈنٹ

۲۔ پرہلاد نرائن

۳۔ ونود گپتا

۴۔ ہریش چندر گپتا سرگرم کارکن کانگریس (ا)

۵۔ کلدیپ کھنّا سرگرم کانگریس (ا) کارکن

۶۔ آر۔کے۔ ٹنڈن، نائب صدر مراد آباد کانگریس (ا)

دہلی کے بااثر کانگریسیوں کو ان کی حمایت حاصل ہے۔ جس کی وجہ سے مقامی افسر بھی ان کی بات کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو مراد آباد سے اٹھارہ بسیں لیکر دہلی گئے اور " برننگ مراد آباد " مراد آباد جل رہا ہے نامی کتاب اندرا گاندھی کو پیش کی لیکن انھوں نے بھی سرزنش نہ کی اور بالاخر مراد آباد تو بچ گیا مسلمان جلادئے گئے۔

ہم اوپر مراد آباد کے فساد کی کہانی بتا چکے ہیں اس پر بہترین اور غیرجانبدار تبصرہ بریلی گسٹ ہاوس میں بریلی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سردار ڈی۔ ایس۔ بگا نے کیا انھوں نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا۔۔۔ "اس فساد میں ساری غلطی مقامی انتظامیہ کی ہے جس میں ذاتی عداوت کا جذبہ بھی کام کر رہا تھا۔ اور اس سلسلہ میں ایس۔ پی مراد آباد کا رول اچھا نہیں رہا۔"

لیکن سیاسی لیڈر اور سرکاری طاقت غیرملکی ہاتھ دکھا کر اصلیت کو چھپانے کی کوشش کرتی رہی ہے۔

فسادات کے پیچھے غیر ملکی ہاتھ یا مال کا واہمہ

مرکزی سرکار اور حزب اختلاف کے لیڈروں کے درمیان فسادات کی نفسیات کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ دونوں حالت نشے میں دو باتوں کا بار بار ذکر کرتے ہیں۔ حزب اختلاف کے لیڈر کہتے ہیں کانگریس (ا) فسادات کراتی ہے اور کانگریس کہتی ہے آر۔ ایس۔ ایس اور بی۔ جے۔ پی فساد کراتی ہے۔ اور بائیں بازو کا سیاسی رجحان رکھنے والے لیڈر اور پارٹیاں کہتی ہیں وزیر اعظم اندرا گاندھی اور ہندو فرقہ پرست پارٹیوں کی ملی بھگت سے فسادات ہوتے ہیں اور وزیر اعظم تیزی سے اکثریتی فرقہ کو خوش کرنے کے لیے فرقہ وارانہ جذبات ابھارنے کا کام کر رہی ہے۔۔۔ اور پھر یہ سب ملکر کہتے ہیں کہ پٹرو ڈالر کی آمد اور اس کے ذریعہ تبدیلئ مذہب فسادات کے ذمہ دار ہیں۔۔۔ ایسی حالت میں

کسی نتیجہ پر پہونچنا بہت مشکل کام ہے کہ فساد کا اصل ذمہ دار کون ہے؟

فسادات میں بیرونی ہاتھ اور بیرونی رقوم کا ذکر خالی سیاسی نعرہ نہیں کہا جاسکتا۔ بیرونی رقوم کا ہوا کھڑا کر کے فرقہ پرست ہندو تنظیمیں بھولے بھالے غریب ہندو عوام سے کروڑوں روپیہ جمع کرنے کا کام کر رہی ہیں۔ مینا کشی پورم جنوبی ہند میں ہریجنوں کے کچھ گھرانوں نے اسلام قبول کیا تو بیرونی رقوم کی کہانی گڑھی گئی اور جماعت اسلامی کو اسکا ہیرو بنا کر ہندو وشو سمیلن نے کئی کروڑ روپیہ ہندوؤں سے جمع کرنے کا نعرہ دے دیا۔

سرکار اور ملک کے ہندو لیڈروں نے اس تحریک میں پان اسلام ازم کو تلاش کر کے خلیج کے مسلم ملکوں کو بھی لپیٹ لیا۔ ہندی اخباروں نے مسلم ملکوں میں اسلامی حکومتوں کا ذکر کر کے ہندستان کے مسلمانوں کو بھی اسی میں شامل کر کے ہندو عوام کیلئے خطرہ کا نشان بنا کر ان کے سینوں میں محسوس خوف کو رائی کا پہاڑ بنانے کا کام کیا۔

ان الزامات کی پشت پر صرف ہندستانی مسلمانوں کے خلاف ہی نہیں عالم اسلام کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کرنے کا کام حکومت ہند اور حزب اختلاف کرتا رہا ہے اور اس طرح سبھی ہندو ووٹوں کو اپنی جھولی میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ ہندستان کے اندر مسجدوں اور دینی مدارس کے لیے آنے والی رقوم سرکاری علم اور اسکی منظوری سے آرہی ہیں۔ اس کے علاوہ تھوڑے سے مسلمان خلیجی ممالک میں نوکری کر کے اپنے گھر والوں کو روپئے بھیجتے ہیں۔ جن کی حیثیت انفرادی ہے اجتماعی نہیں لیکن حکومت اور حزب اختلاف کی ذہنی ساخت تو مختلف ہے نہیں؟ مسلم دشمنی کا خمار ہر سر میں سودا پیدا کرتا ہے۔ کہیں اسکا اظہار برملا ہے کہیں اشاروں میں، کہیں سینوں میں ــــ لیکن قومی سطح پر سبھی بیرونی سرمایہ سے اتفاق رکھتے ہیں۔

حقیقت کیا ہے؟ اس کو ظاہر کرنے کیلئے کوئی تیار نہیں ہے۔ اسلئے کہ اگر حقایق کا علم عوام کو ہوجائے تو ان کے خون و پسینہ کی رقم سے ان لیڈروں کے چہروں پر سرخی نہ آسکے گی۔ اگر یہ اتنا ہی سنگین مسئلہ ہے اور ملک و قوم کیلئے ضرر رساں ہے تو اسکی عدالتی،

سیاسی اور سماجی، ہر سطح پر جانچ ہونا چاہئے اور اگر مسلمان غیر ملکی ہاتھوں مین کھلونا بن کر ملک کے مفاد کو نقصان پہونچانے کاکام کر رہا ہے تو وہ ناقابل معافی ہے اور وہ ہر سزا کے لیے تیار رہے گا...... لیکن یہ جانچ عام بھی ہوگی؟ مسلمانوں کی جانچ اور ملک کی دوسری سیاسی پارٹیوں کی بھی جانچ ہو جو فخریہ اپنے کو بڑی طاقتوں کی لابیوں سے جوڑے ہوئے ہیں ..... مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات۔

مسٹر مونی ہان کی کتاب شائع شدہ اگست سنہ ۱۹۸۱ء نے انکشاف کیا کہ وزارت داخلہ میں تا حال سی۔ آئی۔ اے کا ایجنٹ موجود ہے۔

لیکن وزیر داخلہ گیانی ذیل سنگھ اسکی تردید کر دیتے ہیں۔

ہندستان میں نہ جانے کون کس کا ایجنٹ ہے؟ سی۔ آئی۔ اے کا، کے۔ جی۔ بی۔ کا لیکن یہ سب تو اپنی حرکتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے مسلمانوں کو نشانہ بنائے ہوئے ہیں اور انھیں کو غدار ثابت کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کازور لگا رہے ہیں۔ کیا نندا دیوی پر امریکی جاسوسی آلات جو چین کے متعلق معلومات فراہم کرسکیں وزیر اعظم اندرا گاندھی کی جانکاری میں نہیں بھیجے گئے؟ اور کیا سنہ ۱۹۵۱ء میں کوریا کی جنگ کے وقت گاولڈن کے بیان کے مطابق چین کی امداد کے لیے جانے والے ایک جہاز کو پنڈت نہرو کی کابینہ کے ایک وزیر کی مخبری کی وجہ سے سبوتاج کیا جاسکا؟ اور پھر مونی ہان اپنی کتاب میں انکشاف کرتا ہے کہ کیرالا اور بنگال میں کمیونسٹوں کو ہرانے کے لیے سی۔ آئی۔ اے نے کانگریس (ا) کی مالی امداد کی تھی........ ان ملک و قوم دشمن سیاسی مجرموں کیلئے ہندستان کی کسی عدالت، عوامی عدالت، سیاسی عدالت یا سماجی عدالت سے کسی نے رجوع کرنے کی ہمت کی؟

تمہارا جور ہمیں زیر کر نہیں سکتا
خبر ہو تم کو مسلمان مر نہیں سکتا

حکومت اور حزب اختلاف کو تبدیلئی مذہب میں پٹرو ڈالر کی بو آئی..... مگر تامل ناڈو

روزنامہ عزائم ۱۶/ جون سنہ ۱۹۸۳ء

کے "شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس" نے اپنی رپورٹ میں اس تبدیلیٔ مذہب کا سبب اونچی ذات کے ہندوؤں کی طرف سے ہونے والے ظلم وستم کو بتایا۔

وزارت داخلہ کی خفیہ رپورٹ میں عیسائی ہونے والے ہریجنوں کے خلاف بھی اونچی ذات کے ہندوؤں کی طرف سے قدیم تصوراتی بنیادوں پر ظلم وستم کو بتایا جس سے مجبور ہو کر انھوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔

روپیہ سے دین ومذہب تبدیل نہیں کروایا جاسکتا۔ باہر سے جو روپیہ مسلمانوں نے محنت مزدوری کر کے بھیجا ہے اسے انھوں نے تعمیری کاموں میں لگایا لیکن چونکہ سماجی تحفظ نام کی کوئی چیز مسلمانوں کے لیے موجود ہے نہیں اسلئے مسلمانوں کے کارخانوں، اور تعلیمی اداروں کو پولیس کی مدد سے فرقہ پرستوں نے جگہ جگہ نذر آتش کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو پولیس اور پی-اے-سی پر بھروسہ نہیں رہ گیا ہے۔

ملک کے خلاف غداری کے جرم میں کسی مسلمان کو پکڑا نہیں جاسکا۔ پھر بھی اسی سے وفاداری کے ثبوت مانگے جاتے ہیں۔ بیشتر مواقع پر جب حالات بگڑتے ہیں تو پولیس بھیج دی جاتی ہے۔ اب اگر کسی زمین پر جھگڑا ہے ایک فریق کہتا ہے کہ یہ زمین مسجد کی ہے، دوسرا کہتا ہے یہاں بھگوان کا استھان بنے گا امن قائم رکھنے کیلئے پولیس لگادی گئی اور رات کو وہاں زمین سے خود بخود پتھر کے بھگوان نکل کر کھڑے ہو گئے علاقہ میں شور مچا دیا گیا بھگوان کے درشن کو چلو، بس نذرانے چڑھنے لگے مسلمانوں نے احتجاج کیا تو ان پر پولیس کی گولیاں برسنے لگیں کہا گیا ہندو مسلم فساد ہو گیا۔

تبدیلیٔ مذہب کا شوشہ بھی مسلمانوں کے خلاف چھوڑا گیا ہے اور اس کے بعد عیسائیت کا نمبر آتا ہے۔ اگر واقعی یہ کوئی مسئلہ ہے تو ہر مذہب پر اسکا اطلاق ہونا چاہئے تھا۔ بابا صاحب بھیم راؤ امبید کر نے بدھ مذہب قبول کر لیا اور آج ان کے ماننے والے دلت پینتھر کے نام سے جلسے کرتے ہیں اور عوامی جلسوں میں لوگوں سے عہد لیتے ہیں کہ "عہد کرو آج سے ہم وشنو کی پوجا نہیں کریں گے۔ کسی ہندو دیوی دیوتا کو نہیں مانیں گے نہ اس کے سامنے سر جھکائیں گے اور بودھ دھرم کو اپناتے ہیں۔"

یہ کھلے عام اعلان ہوتا ہے ہزاروں آدمیوں کے بیچ لیکن اس کے خلاف کوئی نہ دنگا ہوتا ہے نہ بیرونی سرمایہ کا قصہ نہ ہندوؤں کی اکثریت گھٹنے کے نعرے لگتے ہیں نہ کسی سیاسی قبضہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن ایک آدمی بھی اسلام قبول کرلے تو پورے ملک کی سماجی بنیادیں ہلتی دکھائی دینے لگتی ہیں اس کے پیچھے وہی روایتی اور تصوراتی خوف پایا جاتا جو اکثریت کے لیڈروں کے سینوں میں مسلمانوں کی طرف سے ہے۔

دراصل ہندو سماج اس وقت شدید ترین کشمکش میں پھنس گیا ہے۔ ایک طرف تو ہندستان کے صدیوں سے رد کئے ہوئے، کچلے ہوئے اور پسے ہوئے لوگ ہیں جن کو اتفاق پیدائش کی بنیاد پر پیچھے ڈھکیل دیا گیا تھا۔ جس قوم کا مذہبی تصور یہ ہو — "اگر سو سال کا ایک بزرگ چھتری (راجپوت) ہو، اور دس برس کا برہمن کا لڑکا ہو تو یہ اس راجپوت کے باپ کے برابر قابل احترام ہوگا۔"

یہ منوسمرتی کا قانون ہے جس پر ہندو سماج کی قانونی اور مذہبی بنیادوں پر تقسیم ہوئی ہے۔

منڈل کمیشن کی رپورٹ کے مطابق ہندوؤں کی جن ذاتوں کو اس بنیاد پر پیچھے ڈھکیلا گیا تھا کہ وہ بنے ہی اسلئے ہیں کہ اونچی ذات کے پندرہ فی صد لوگ ان کا استعمال کریں انھیں آگے بڑھایا جائے اور ہر سطح پر ان کے لیے ریزرویشن ہو۔ اسلئے کہ آزادی کے بعد اونچی ذات والوں نے ایک مدت تک ہندو عوام کو جن کی اکثریت اچھوت اور پس ماندہ ہے تقسیم کے بعد کے حالات میں پھنسا کر مسلمانوں کا خوف دلا کر خاموش کردیا۔ اور آزادی کے بعد بھی ترقی اور خوشحالی کی کوئی کرن ان کے گھروں تک نہ پہونچ سکی۔ منڈل کمیشن نے تقریباً اس طرح کی ۳۵۰۰ ذاتوں کا ذکر کیا ہے جنکو پیشوں کی بنیاد پر نیچ قرار دیدیا گیا ہے ہندو سماج میں۔ اس کمیشن پر عمل درآمد کیلئے شمالی ہندستان کی اونچی ذاتوں اور نیچی ذاتوں کے درمیان تناؤ موجود ہے۔ مرکزی سرکار سے لیکر صوبائی سرکاروں تک حکومت اور وزارت میں اکثریت برہمنوں کی ہے جن کے اجداد نے منوسمرتی بنائی تھی۔ اترپردیش میں چونکہ برہمنوں کی گرفت بہت مضبوط ہے اسلئے یہاں خود سرکار اس

کمیشن کی رپورٹ کے سخت خلاف ہے۔ دوسری طرف اس پر عمل در آمد کے لیے بات سڑکوں تک آ گئی ہے اسکی سب سے بڑی حامی جماعت لوک دل ہے جو پس ماندہ ذاتوں خاص طور پر اہیروں (یادو) کُرمیوں اور جاٹوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ چودھری چرن سنگھ خود جاٹ تھے۔

یو۔ پی کے برخلاف بہار اور مہاراشٹرا نے منڈل کمیشن کی رپورٹ کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔

لیکن اس ریزرویشن میں بھی مسلمانوں کیلئے جگہ نہ بن سکے گی۔ اسلئے کہ سنہ ۱۹۷۷ء میں جنتا پارٹی کی سرکار کے زمانہ میں ۲۱ مسلم برادریوں کو پس ماندہ طبقات کو ملنے والی مراعات کے خانہ میں رکھا گیا تھا۔ لیکن عملاً انھیں کچھ مل نہ سکا اس کا سبب وہی ذہنی تنگی اور تعصب ہے۔ اسلئے کہ مسلمان کے معاملہ میں ہر طبقہ ہندو ہو کر سوچتا ہے اور ایک پس ماندہ طبقہ کا ہندو آفیسر مسلمانوں کے مقابلہ میں برہمن کو (اس کے ہاتھوں صدیوں ہونے والے استحصال کے بعد بھی) اولیت دیتا ہے، اسکا علاج کہاں ہے؟

اس طرح، مذہبی سطح پر، سیاسی سطح پر، سماجی سطح پر اور معاشی سطح پر ملک کے ہر طبقہ کا بیوروکریٹ مسلمان کو پیچھے ڈھکیل کر ہی امن و سکون محسوس کرتا ہے۔ اسلئے فسادات کے پیچھے واہمہ کے طور پر اور اقوام عالم کو گمراہ کرنے کیلئے مذہب کی تبدیلی اور پٹرو ڈالر کی فراہمی کو بہانہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

اسی تلوار کے نیچے ہماری زندگی بھی ہے
اسی تلوار کے نیچے بنائیں گے مزار اپنا

تقسیم پاکستان کا منصوبہ!

کانگریس کے لیڈروں کا خیال تھا کہ انگریز کے جانے کے بعد اور تقسیم بنگال و پنجاب کے کچھ ہی دنوں بعد پاکستان کے لیڈر ذلت و رسوائی کے ساتھ پاکستان کو ہندستان میں ضم کردیں گے اسلئے کہ زیادہ دنوں تک یہ کٹا پٹا ملک اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکے گا۔ لیکن یہ تصور بھی بہت سے دیومالائی تصورات کی طرح ہوا میں اڑ گیا۔۔۔۔۔

مسلم لیڈروں میں مولانا ابوالکلام آزاد تقسیم کے سخت خلاف تھے ہندستان کی آزادی کے ساتھ ہی وہ ممالک اسلامیہ کی آزادی کے بھی طالب تھے۔ میرے ماموں مولانا ملیح آبادی انگریزوں کی مخالفت میں روس کی کمیونسٹ حکومت کے ہمنوا ہوگئے تھے جیسے اس وقت کے بہت سے علماء لیکن آزادی کے بعد انھوں نے کمیونزم سے کسی تعلق کا اظہار نہیں کیا یہاں تک کہ کینسر کے مرض میں علاج کیلئے مولانا آزاد کے کہنے کے باوجود روس جانا پسند نہیں کیا اور کہا کہ میرے پاس اتنی رقم نہیں اور میں چند روزہ زندگی کے لیے بھارتی یا روسی سرکار کا احسان قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ مولانا عبدالرزاق خان معروف بہ ملیح آبادی، علامہ رشید رضا مصری کے شاگرد تھے مصر سے ترکی جاکر انھوں نے انور پاشا سے ملاقات کی تھی اور انور پاشا نے ان سے کہا تھا کہ ہندستان وہ جگہ ہے جہاں سے انگریز مسلم ممالک میں انتشار پیدا کر کے ان پر حکومت کر رہا ہے جس دن انگریز کو آپ ہندستان سے نکالدیں گے سارے ممالک اسلامیہ آزاد ہو جائیں گے۔ وہاں سے مصر واپس آکر وہ حج کرنے گئے وہ شریف مکہ کے سخت مخالف تھے۔ حج کے بعد انھیں گرفتار بھی کرلیا گیا انھوں نے انگریزوں کی طرف سے متعین سفیر سے رجوع کر کے بتایا کہ میں جرمن نہیں ہندستانی ہوں اور نسلاً افغانستان کے غلزئی قبیلہ کی شاخ سلیمان خیل سے ہوں جو نادرشاہ کے حملہ کے وقت علاقہ قلات کا حکمران خاندان تھا۔ اسکی تصدیق پر انھیں رہائی

ملی۔ شاہ عبدالعزیز والئی نجد و حجاز کی کوشش کی وہ سختی سے حمایت کرتے رہے۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں کلکتہ میں مولانا آزاد سے ملے اور انور پاشا سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا اور پوری بات بتائی مولانا آزاد نے کہا میں خود اسی تصور کے ماتحت انگریز کے خلاف کام کر رہا ہوں۔ یہ ملاقات جلد ہی مضبوط رفاقت کے رشتہ میں بدل گئی اور دونوں کو موت نے جدا کیا۔ مولانا عبدالرزاق خان نے اپنا قلمی نام "ملیح آبادی" اختیار کیا جو مولانا ملیح آبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔ مولانا کے ساتھ الہلال والبلاغ میں شریک رہے۔ پھر خود پیغام نکالا اور جدید اردو صحافت کی بنیاد رکھی اردو صحافت آسمان سے اتر کر زمین پر آئی اور انھوں نے آسان عوام کی زبان میں لکھنا شروع کیا۔ پھر ہند نکالا، پھر آزاد ہند اور اب اسی آزاد ہند کو ان کے صاحبزادے کلکتہ ہی سے نکال رہے ہیں۔ جامعہ کے نام سے عربی میں بھی آزادی سے پہلے ایک رسالہ نکالا۔

سرکار سے قربت رکھنے والے ایک معتبر آدمی نے مجھے ایک بار بتایا کہ پاکستان کو توڑنے کیلئے رفیع احمد قدوائی نے ہندستان سے سجاد ظہیر کو جو پرانے کمیونسٹ تھے پاکستان بھیجا تاکہ مجیب الرحمان سے ملکر مشرقی پاکستان کو الگ کروا دیا جائے جن کو راول پنڈی سازش کیس میں جرنل محمد ایوب خاں نے گرفتار کرلیا۔ مولانا آزاد اور پنڈت نہرو نے اس پروگرام کو معلوم ہوتے ہی رد کردیا۔ اسلئے کہ وہ جانتے تھے کہ بین الاقوامی دنیا اور مسلم ممالک پر اسکا شدید رد عمل ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ مولانا تقسیم کے خلاف تھے لیکن تقسیم کے بعد جب پاکستان بن گیا تو اسکی ترقی، خوشحالی اور مضبوطی کے خواہاں تھے اور ایک طاقتور پاکستان دیکھنا چاہتے تھے۔

مرحوم شیخ عبداللہ کی گرفتاری میں بھی رفیع احمد قدوائی ذاتی دلچسپی رکھتے تھے اسلئے کہ شیخ صاحب نے ان کے کسی رشتہ دار کو جو کشمیر میں بڑے عہدے پر تھے کسی بدعنوانی کے الزام میں ہٹا دیا تھا۔ شیخ صاحب کی گرفتاری کے بھی پنڈت نہرو اور مولانا آزاد مخالف تھے لیکن مسئلہ کو جس سیاق و سباق میں پیش کیا گیا تھا پنڈت نہرو بھی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے خاموش رضامندی دے دی ــــ ہندستان میں غذائی قلت کی

وجہ سے جب رفیع احمد قدوائی کو وزیر غذا بنایا گیا تو انھوں نے پاکستان سے سندھ کے راستے ہزاروں ٹن غلہ اسمگل کرانے کا کام بھی نہایت ہوشیاری سے کہا جاتا ہے انجام دیا۔

اس طرح رفیع احمد قدوائی نے ہندستان کے لیے سب کچھ کیا لیکن اس کے بعد بھی ملک کی تاریخ میں ان کا کوئی اہم مقام نہ بن سکا۔

سنہ ۱۹۷۱ء میں جو حالات پیدا ہوئے اس میں پاکستان کو توڑنے میں کانگریسی لیڈروں کو کامیابی حاصل ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ اس کے پیچھے بنگال کے مسلمانوں سے محبت کا جذبہ کارفرما نہیں تھا۔ اسلئے کہ سنہ ۱۹۶۴ء میں بنگال کے ہندستانی حصہ میں زبردست فسادات کے ذریعہ کلکتہ وغیرہ میں بری طرح بنگالی مسلمانوں کو روندا گیا تھا۔ اس کے پیچھے جذبہ یہ تھا کہ اس طرح اگر پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تو دونوں بازو ہندستان کے لیڈروں کی بالادستی قبول کر لیں گے، جو ذہن سنہ ۱۹۴۷ء میں تھا وہی ذہن سنہ ۱۹۷۱ء میں بھی تھا ــــ جب ہندستان کی فوجیں مشرقی پاکستان میں اتر گئیں اور پاکستان کو شکست ہو گئی تو ملک کا ہر لیڈر پاگل ہو گیا۔ پنڈت اٹل بہاری باجپئی نے اندرا گاندھی کو۔ درگا دیوی کا لقب عطا کیا۔ درگا نے راون کے خلاف راکشسوں کی فوج کو شکست دی تھی۔ اور یہ لڑائی ملکوں کی لڑائی نہ بن کر ہندو مسلمان کی لڑائی بنا ئی گئی اور ہر لیڈر سرشار تھا کہ ہندستان پر مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ و فتوحات کو روند کر اندرا جی نے انتقام لے لیا۔ وزیر دفاع نے کہا کہ بنگالی مسلمان بھی ڈھاکہ کی زمین پر اللہ اکبر کے نعرے لگا رہا تھا اور پنجابی مسلمان بھی گویا گولی کھانے والا اور گولی چلانے والا دونوں ہی اللہ اکبر کہہ رہے تھے اور اس نعرہ کو ہم نے اس زمین پر ہمیشہ کیے دفن کر دیا۔" یہ ذہن پورے ملک میں موجود تھا۔ میں اسوقت تہران یونیورسٹی میں تھا۔

وہاں سے واپسی پر میں نے اپریل سنہ ۱۹۷۲ء ماہنامہ بلال لکھنؤ میں ایک مضمون لکھا تھا۔ جس کا عنوان تھا ــــ "مشرقی پاکستان سے بنگلادیش تک۔"

اس مضمون میں تاریخی شہادتوں سے میں نے ثابت کیا کہ بنگلادیش زیادہ دنوں

جگ جیون رام جو ہریجن تھے

تک ہندستان کو دوست نہ رہ سکے گا۔ وہ بنگال ہی کے مسلمان تھے جنھوں نے مسلم لیگ بنائی مولانا آزاد کی امامت رد کردی۔ فضل الحق کو شیر بنگال کا لقب دیا۔

کانگریس نے سنہ ۱۹۴۷ء میں مشرقی اور مغربی پاکستان کو ایک ملک مانا لیکن محترمہ اندرا گاندھی نے چوبیس سال کے بعد پاکستان کی نہ صرف تقسیم کی حمایت کی بلکہ مسلح مداخلت تک سے گریز نہ کیا اور مشرقی پاکستان بنگلادیش بن گیا۔ مظلوموں کی حمایت اچھی بات ہی لیکن تاریخ اور حالات سے سبق لینا تھا۔ پنڈت نہرو نے کشمیر کے سلسلہ میں ایک غلطی کی تھی جس کے نتیجہ میں پاکستان انتہائی مختصر ہوتے ہوئی بھی ہر میدان میں ہندستان کا حریف بن گیا اور آج تک یہ فیصلہ نہ ہوسکا کہ ہندستان کے مقابلہ میں پاکستان کی فوجی طاقت ٹوٹ گئی ہے اور اب وہ ہندستان سے دب کر معاہدہ کرے گا۔

دو چار پانچ برس میں بنگلادیش کا مسلمان بھول جائے گا اور مسلم ملکوں کی صف میں کھڑا ہو کر مسلم سیاست کا ہمنوا بنے گا۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندستان کو ملا کیا؟ سوائے ایک گروہ کی جھوٹی تسلی کے جیسا کہ کچھ ہندستانی نیتاؤں نے کہا کہ ہم نے ہزار سال کے بعد فتح پائی ہے یا یہ کہ انھوں نے نعرۂ تکبیر کو بنگلادیش میں دفن کردیا۔

باہر کی دنیا میں ہندستان کو "سیاہ اسرائیل" کا لقب مل چکا ہے۔ ایران میں عرب اور افغانستان کے بہت سے طلباء نے جب مجھ سے کہا۔۔۔ "دو عورتیں مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہیں گاندی (مسز گاندھی کا فارسی لہجہ) اور گولڈا ایئر۔" (اسرائیلی وزیراعظم)

لیکن آپ تو مسلمان کو غدار خیال کرتے ہیں اور اس سے وفاداری کے طالب ہیں۔ حالانکہ مسلمان ہندستان کا غدار نہیں ہے بلکہ اس کی ساری غداری خود اسلام سے ہے۔ اگر وہ اسلام کی تعلیمات پر کاربند ہوتا تو صاف اور دو ٹوک الفاظ میں کہتا کہ ہم مسلمانوں کے باہمی اختلاف سے وہ ہندستان کے اندر ہوں یا باہر فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ آزادی کے بعد سے ہم جن حالات سے دوچار ہیں اس میں بیرونی حملہ کی شکل میں کسی مدد کا وعدہ نہیں کرسکتے۔ ہماری سب سے بڑی مدد یہی ہے کہ ہم خاموش ہیں۔ لیکن اگر ہمارے

اور حکومت کے درمیان ایک معاہدہ ہو جائے کہ حکومت ہندستان کے شہروں میں مسلمانوں کی جان و مال، عزت و آبرو کے تحفظ کی ضمانت لے لے اور مسلمان اس کے بدلہ سرحدوں کا تحفظ کریں گے۔ لیکن موجودہ حالات میں ہم کیا کہیں؟

ہم تو مولانا آزاد کی زبان میں یہی کہہ سکتے ہیں۔۔۔ "پس یقین کیجئے آج جن لوگوں نے اسلامی آبادیوں پر حملے کئے ہیں۔ لاکھوں مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالا ہے اور تخت اسلام کو الٹ دینے کے لیے اپنے تمام قوائے شیطانیہ کو کام میں لا رہے ہیں اور پھر جن قوموں اور حکومتوں نے ان کی کسی صورت میں بھی اعانت کی ہے یا ان کی، برخلاف اسلام، سازش میں شرکت کی ہے وہ سب بموجب ان نصوص قرآنیہ اور احکام شریعہ حقہ اسلامیہ کے ایک لمحہ اور ایک دقیقہ کے لیے بھی اس کے مستحق نہیں کہ ہم ان کے ساتھ رسم و راہ دوستی اور طریق مودت و ولایت کو کام میں لائیں یا ان کے ساتھ نرمی و محبت و شفقت و رافت کا سلوک کریں۔۔۔۔ اور اگر کریں تو پھر اللہ اس کے ملائکہ مقربین اور رسل مبشرین و منذرین کی نظروں میں، ہمارا شمار بھی انھیں دشمنان خدا کے ساتھ ہے۔"

ہندستان میں بنگلادیش کی لڑائی دو ملکوں کی لڑائی نہیں تھی بلکہ دو نظریوں کی لڑائی تھی۔ ہندستان کے ہندو لیڈروں نے اسے ہندو اور مسلمان کی لڑائی بنایا تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے ایک قوم و مذہب کے لوگ آپس میں اپنے بھائیوں کے ظلم و ستم سے عاجز ہو کر غیروں سے امداد کے طالب ہوتے ہیں۔ اس طرح انھیں اپنے بھائیوں سے نجات مل جاتی ہے لیکن دوسرے ہی لمحہ بے شمار مصائب ان کے سامنے آجاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۷۱ء میں جو کچھ پاکستان میں ہوا۔ اس میں بنگلادیش جیت کر بھی ہار گیا اسلئے کہ بعد میں ہندستانی لیڈروں نے اس لڑائی میں اپنی فتح کو اسلام پر فتح قرار دیتے ہوئے یہ سوچا کہ ایک ہزار برس کے بعد برصغیر میں مسلمانوں پر انھیں فتح عظیم حاصل ہوئی ہے اور خود بنگلادیش اور پاکستان میں جو حالات سامنے آئے ان کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ دونوں جگہوں کی فوج نے تھوڑے سے طریق کار میں تبدیلی کے ساتھ مجیب الرّحمان اور ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کردیا۔

سنہ ۱۹۷۱ء کی لڑائی میں پاکستان کے خلاف ہندستان کے جذبہ کی شدت کا پتہ اس بات سی چلتا ہے کہ چنبل کے ڈاکوں نے ایک میٹنگ کر کے فیصلہ کیا کہ ایک ماہ کے ڈاکوں میں حاصل ہونے والی رقم بنگلادیش کے لیے دے دی جائے گی۔ چنانچہ اس خبر کی بنیاد پر اعجاز وارثی سنبھلی نے اپنے شعری مجموعہ "پیش دستی" میں اس واقعہ کو شعر کے روپ میں اس طرح ادا کیا۔

اک معما ہے کاروبار و حیات
مل رہے ہیں گلے عیوب و صفات
رہزنوں کو بھی فکر بنگلادیش
اک طرف لوٹ اک طرف خیرات

ہم جیسا کہ اوپر ذکر کر چکے ہیں حالات نے اسے صحیح ثابت کر دیا اور جلد ہی بنگلادیش ہندستان کی گود سے نکل کر اسلامی بلاک میں کھڑا ہو گیا اور بغداد کی کانفرنس میں آسام کے مسئلہ کو اسی نے اٹھایا لیکن ہندستانی مندوب اسعد المدنی نے اسکی مخالفت کی اور اسے ہندستان کا اندرونی معاملہ کہہ کر ٹال دیا گیا انڈین یونین مسلم لیگ کے صدر سلیمان سیٹھ بھی وہاں موجود تھے وہ سو گئے اور ہندستانی مسلمانوں کے لیے عالم اسلام کے جذبات (ہماری ہی سرد مہری سے) سینہ ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔

اس قہر کو بھولنا نہ اے عدل زمین
شاہد رہنا، عدالت چرخ بریں
ہم وہ عمل خیر ہیں نادانوں میں
جو مورد نفریں ہے بجائے تحسیں

اندراگاندھی، مسلمان اور وعدے

سنہ ۱۹۸۰ء کے پارلیمانی الکشن میں مسز اندراگاندھی نے مسلمانوں سے بہت سے وعدے کئے تھے جو پورے نہ ہوسکے۔ ۱۲ / مئی سنہ ۱۹۸۳ء کو اپنی کابینہ کے وزراء کو لکھے گئے ایک مراسلہ میں محترمہ نے مسلمانوں کے مسائل کا ذکر کیا۔ جس میں کہا گیا کہ مسلمانوں کی مکمل حفاظت کی جائے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ کون کرے گا؟ یہ بات ایسے وقت پر کہی گئی جب ۵ / جون سنہ ۱۹۸۳ء سے جموں و کشمیر میں الکشن ہونے جا رہے تھے۔ لیکن وہاں کی ہوا دیکھ کر ایسی زبان میں گفتگو کی جس کی امید کسی کٹر فرقہ پرست ہندو لیڈر سے بھی نہیں کی جاسکتی مثلاً جموں میں ایک جگہ تقریر کے دوران سامنے درختوں پر بیٹھے ہوئے بندروں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اگر نیشنل کانفرنس جیت گئی تو انکا (بندروں کا جو ہندوؤں کے منجملہ خداؤں میں ایک خدا ہیں) کیا ہوگا؟ اس طرح وہ ساری نشستیں جو جن سنگھ، بھارتی جنتا اور جنتا کو ملتی تھیں اندرا کانگریس نے حاصل کرلیں۔ اٹل بہاری باجپئی ان دنوں یورپ نکل گئے اور درگا دیوی کو راکشسوں کے قتل کے لیے آزادانہ چھوڑ دیا گیا؟

جنوری سنہ ۱۹۸۳ء میں محترمہ نے شاہنواز خاں کو لکھا انتخابی منشور میں کئے گئے سارے وعدے پورے کردیئے گئے ہیں۔" ان وعدوں کے ابھرتے ہوئے نشان، مرادآباد، میرٹھ، بڑودہ اور مالیگاؤں میں مسلمانوں کی قتل گاہوں کی شکل میں دیکھے جاسکتے ہیں!!!

۱۵ / مئی سنہ ۱۹۸۳ء کو محترمہ نے ہردوار میں کہا جب کانگریس مضبوط تھی تو کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ محترمہ کے عہد حکمرانی کے آغاز سے ابتک تقریباً دس ہزار فسادات ہوچکے ہیں۔ فسادات مشترکہ میراث ہے ہندستانی حکومتوں کی۔ وزارت داخلہ کی رپورٹ کے مطابق سنہ ۱۹۷۸ء میں ۲۳۰ فسادات، سنہ ۱۹۷۹ء میں

۳۔۴، سنہ ۱۹۸۰ میں (اندرا گاندھی کا پھر دور جنتا کے بعد آیا) ۴۲۷ فسادات، سنہ ۱۹۸۱ میں ۳۱۰ فسادات اور سنہ ۱۹۸۲ میں ۴۷۴ فسادات جو ملک میں ہونے والے فسادات کی تاریخ میں ایک ریکارڈ ہے۔ سنہ ۱۹۸۳ کے ابتدائی چھ ماہی میں ۲۲۸ فرقہ وارانہ فسادات کی اطلاع وزارت داخلہ نے دی۔ ۱۴ / نومبر پارلیمنٹ میں۔

محترمہ کے عہد میں لگاتار پولیس اور پی-اے-سی نے ظلم و جبر کیا لیکن محترمہ نے ہمیشہ چشم پوشی کی اور کہا پی-اے-سی کے بعض افراد فرقہ پرست ہو سکتے ہیں سب نہیں۔

۲۸ / اگست سنہ ۱۹۸۰ کو ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں محترمہ نے کہا حزب اختلاف نے متحد ہو کر ایسی صورت حال پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس میں عصمت دری اور ہریجنوں اور اقلیتوں پر ظلم کا ہوا کھڑا کیا گیا ہے (جیسے پورے ملک میں امن و امان کا ماحول پایا جاتا ہے)

ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبروں نے محترمہ کی شہ پا کر کہا کہ مراد آباد میں سرکاری ذمہ داروں سے ٹکرانے کا ایک منظم طریقہ اپنایا گیا اور اس طرح مسلمانوں کو مجرم اور جارح قرار دیا گیا۔

۱۱ / نومبر سنہ ۱۹۸۲ کو سپریم کورٹ کے رٹائرڈ جج مسٹر کرشنا آئیر نے میرٹھ کا دورہ کر کے وزارت داخلہ کو لکھا کہ میری قطعی رائے یہ ہے کہ بہت چھوٹی اور معمولی جگہوں میں رہنے والے مسلمانوں کے گھروں میں گھس کر پی-اے-سی والوں نے کئی مردوں کو گولی مار دی۔ لیکن محترمہ نے ہندستان کی پارلیمنٹ میں پی-اے-سی کی مذمت کرنے پر اظہار افسوس کیا۔

ہندستان کے بعض اخباروں کی رائے میں فسادات میں اکثریتی فرقے کے افراد کے مقابلہ میں پولیس نے زیادہ مظالم کئے۔

اپنے دس سالہ عہد حکمرانی میں محترمہ نے نہ تو پی-اے-سی کی مذمت کی اور نہ ہی اس نے اپنی روش بدلی۔

لیکن جنتا سرکار کے زمانہ میں پی-اے-سی ظالم ہو گئی۔ ۱۲ / نومبر ۱۹۷۸ کو علی

گڑھ کے فسادات کے سلسلہ میں محترمہ کی کانگریس کے ایک وفد نے پی-اے-سی کے مظالم کی مذمت سے متعلق محترمہ کی منظوری سے ایک رپورٹ جاری کی۔

مئی سنہ ۱۹۶۱ء میں آل انڈیا کانگریس کی ایک کمیٹی برائے قومی یکجہتی نے اپنی رپورٹ میں جس کی چیرمین محترمہ اندرا گاندھی تھیں ـــ کہا ـــ "جہاں انتظامیہ چوکس ہے وہاں لوٹ مار، آتش زنی اور فسادات نہیں ہوتے۔"

لیکن جہاں چوکس نہیں ہے اسکی ذمہ داری کس پر ہے اور اس کے لیے کیا قانون ہے؟

اندرا کانگریس نے اپنے منشور میں کہا تھا "پارٹی فرقہ وارانہ فسادات کو فوری اور موثر طور پر کنٹرول کرے گی۔"

اگست سنہ ۱۹۷۹ء میں پارلیمنٹ کو توڑے جانے کے وقت محترمہ نے شاہی امام سید عبداللہ بخاری سے بہت سے وعدے کئے تھے لیکن برسراقتدار آنے کے بعد محترمہ نے ایک وعدہ بھی پورا نہیں کیا۔

۲۰/ اپریل سنہ ۱۹۸۰ء کو محترمہ نے شاہی امام کو ایک خط لکھا۔ شاہی امام نے جواب میں کہا محترمہ نے اس سے پہلے ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم بانی مسلم مجلس اترپردیش سے بھی بہت سے تحریری وعدے کئے تھے مگر ان میں سے ایک بھی پورا نہیں کیا۔

دنیائے عشق کی یہ روایت ہے کہ وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا کیا سیاست و ملک گیری میں بھی محترمہ دنیائے عشق کی بنیاد ڈالنے کا کام کر رہی ہیں؟

چار سال محترمہ کی سرکار کو بیت چکے ہیں لیکن ابھی ایک وعدہ بھی پورا نہیں ہوا، لیکن اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء کی دو گھنٹہ کی پریس کانفرنس میں انھوں نے کیا ہی معصومانہ بات کہی کہ لوگ کہتے ہیں ہم نے کوئی وعدہ پورا نہیں کیا۔ سنہ ۱۹۸۰ء میں کئے گئے وعدے پورے کر دیئے گئے ـــ اور ایک ایسی سرکار دی جو کام کرتی ہے" وہ کام ہے مسلمانوں کے قتل کا ـــ!

ایک وعدہ تھا اقلیتی کمیشن کو سرکاری حیثیت دی جائے گی جو پورا نہیں ہوا۔

۱۰/ مئی سنہ ۱۹۸۰ کو ایک اعلیٰ اختیاراتی پینل بنا۔ اس کے پہلے چرمین ڈاکٹر سید محمد ہوئے اور خورشید عالم خاں اس کے ممبر اور سکریٹری۔ لیکن جلد ہی سید محمد کو برطانیہ میں ہائی کمشنر بنا دیا گیا اور ڈاکٹر گوپال سنگھ اس کے چرمین بنائے گئے۔ ڈاکٹر گوپال سنگھ نے ۱۰/۱ اکتوبر سنہ ۱۹۸۰ کو اس بات کی تردید کردی تھی کہ سرکار کے مالی فائدوں سے مسلمانوں نے بھی فوائد حاصل کئے" اقلیتی کمیشن کے چرمین ایم - آر - اے -انصاری کو نہایت توہین آمیز ڈھنگ سے ہٹا کر جسٹس ایم - ایچ - بیگ کو چرمین بنایا گیا یہ وہی آدمی ہے جس نے ۱۶/ جنوری سنہ ۱۹۷۷ کو سپریم کورٹ کا جج ہوتے ہوئے محترمہ اندرا گاندھی کی شان میں قصائد پڑھے تھے اور آجکل اقلیتی کمیشن کا چرمین ہونے کے بعد مسلمانوں کے خلاف بُھل بھل موت رہے ہیں۔ اور شرعی قوانین میں تبدیلی کے اسوقت ہندستان میں سب سے بڑے حامی جناب ہی ہیں۔

۲۰/ فروری سنہ ۱۹۸۳ کو محترمہ اندرا گاندھی نے مسلمانوں کی شکایتوں پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی اور بنائی جس کے چرمین وزیر داخلہ سیٹھی ہیں۔ جو نہ تو مسلمانوں کے مسائل سمجھتے ہیں اور نہ ہی ان کے جذبات سے واقفیت رکھتے ہیں۔ مسٹر بوٹا سنگھ کے علاوہ محترمہ کی ملازمہ اور ملازم عابدہ احمد (بیوہ فخرالدین علی احمد) اور جعفر شریف اس کے ممبر ہیں۔ یہ سب سرکار کے تنخواہ دار ملازم ہیں مسلمانوں کے مسائل کیسے حل کر سکیں گے؟

اندرا کانگریس نے سنہ ۱۹۸۰ کے انتخابی منشور میں کہا تھا ..... "سرکاری ملازمتوں میں جن میں امن و انتظام برقرار رکھنے والے اور سلامتی سے متعلق ادارے بھی ہیں مساویانہ مواقع دیئے جائیں گے۔" (یہاں پھر پیچ دار گفتگو اور الجھانے والی بات کی گئی۔ پولیس، پی-اے-سی اور مسلح افواج کا ذکر نہ کرکے "سلامتی سے متعلق ادارے" کہا گیا مساویانہ مواقع کیسے ملیں گے)

اسلئے کہ ۲۱/ فروری سنہ ۱۹۸۰ کو لکھنؤ میں ان سے پوچھا گیا کہ اقلیتیں اپنی

حالت میں سدھار کی کیا توقعات کریں تو انھوں نے کہا۔۔۔ "اقلیتیں سماج کا ایک جز ہیں ۔جب تمام فرقوں کی حالت بہتر ہو گی تو اقلیتوں کی حالت خود بخود بہتر ہو جائے گی۔"

اور ۲۸ / نومبر سنہ ۱۹۷۹ء کو وہ او برائے کانٹی ننٹل دہلی (ہوٹل) میں مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھیں۔۔۔ "اس ملک میں جہاں مختلف قسم کے مذاہب ہیں، تمدن اور زبانیں ہیں وہاں اقلیت و اکثریت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں کوئی اقلیت نہیں خود ہندو جو اکثریت میں ہیں اتنے حصوں میں بٹے ہوئے ہیں کہ ان کا ہر حصہ اقلیت ہے۔"

اب ان بیانات کی روشنی میں ہے کوئی صاحبِ عقل، جو یہ فیصلہ دے سکے کہ اقلیت سے مراد کون ہے؟

۱۸ / دسمبر سنہ ۱۹۷۹ء کو لکھنؤ کے مسلم کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔۔۔ "میں مسلمانوں کے لیے سرکاری ملازمتوں میں ریزرویشن کے لیے دستوری ضمانت کی حامی ہوں۔"

لیکن جب وزارت عظمیٰ پر پہونچیں تو شاہنواز خاں کو ۲۱ / جنوری سنہ ۱۹۸۳ء کو ایک خط میں لکھا۔۔۔ "مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کیلئے سیکورٹی فورسز میں ریزرویشن میں دستور مانع ہے۔"

۲ / فروری سنہ ۱۹۸۳ء کو وزیر قانون شیوشنکر نے راجیہ سبھا میں وہ تحریک مسترد کر دی جس کے ذریعہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لیے کوٹہ مقرر کرنے کو کہا گیا تھا اور وہی بات دہرادی جو مسز گاندھی نے کہی تھی کہ ایسا کرنا دستور ہند کے خلاف ہے۔

(اس کے بعد بھی مسلمانوں سے دستور سے وفادار رہنے کو کہا جاتا ہے یعنی اپنے ہی قاتل کے وفادار بنو)

مسلمانوں پر ہونے والے مظالم اور ناانصافیوں کے لیے محترمہ جنتا پارٹی کے عبوری دور کو ذمہ دار قرار دیتی ہیں۔

حالانکہ خود ان کے عہد حکمرانی یکم جنوری سنہ ۱۹۸۱ء میں ۳۸۸۲ آئی-اے-ایس (I.A.S) افسروں میں صرف ۱۱٦ مسلمان تھے۔ ۱۵۷۳ آئی- پی- ایس (I.P.S) افسروں میں صرف ۵۰ مسلمان تھے۔

بی- ایس- ایف (B.S.F) میں افسروں کی سطح پر مسلمانوں کا اوسط دو اعشاریہ دو فی صد ہے۔ اور دوسری سطحوں پر یہ اوسط بالترتیب چار اور ساڑھے چھ فی صد ہے۔

قومیائے ہوئے بینکوں کے بورڈوں میں جہاں نامزدگیاں ہوتی ہیں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ریزرو بینک کے انیس ڈائرکٹروں میں ایک بھی مسلمان نہیں ہے۔

گاندھی آشرم کی دوکانوں پر مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ پورے ملک میں گاندھی آشرم کی کسی ایک دوکان پر بھی کوئی مسلمان ملازم نہ ملے گا۔

مسلمانوں کی لوک سبھا اور ودھان سبھاؤں میں نمائندگی برابر گھٹ رہی ہے۔ لوک سبھا میں ۵۴۴ ممبران ہیں مسلمانوں کی آبادی تقریباً پچیس کروڑ ہے ان کی آبادی کے تناسب سے ۱۹۵ ہونا چاہئے یہ تعداد ہر بار گھٹتی رہی ہے اور سنہ ۱۹۹۳ کی لوک سبھا میں یہ تعداد کل سترہ (۱۷) رہ گئی ہے۔ اسکا سبب تعصب اور انتخابی حلقوں کی تقسیم میں مسلم اکثریت کے حلقے نہ بننے دینے کا الکشن کمیشن کا طریق کار ہے کہ ملے جلے مسلم علاقوں کو کاٹ کر الگ الگ انتخابی حلقوں میں جوڑ دیا جائے۔ اسی طرح راجیہ سبھا کے ۲۵۰ ممبروں میں مسلمانوں کی تعداد گیارہ (۱۱) ہے۔ گرام پنچایتوں میں یہ تعداد اور بھی کم ہے اور گرام پنچایتوں کے نئے طریقہ کار میں صفر تک چلی جائے گی۔ یہی حالت میونسپلٹیوں اور کارپوریشنوں کا ہے۔

۵/ مئی سنہ ۱۹۷۲ء سے کام کرنے والی گجرال کمیٹی نے جو اردو کو اسکا جائز حق دلانے کے لیے قائم کی گئی تھی اپنی سفارشات ۸/ جون سنہ ۱۹۷۸ء کو پیش کیں۔ ان سفارشات میں کہا گیا تھا کہ اردو کو کسی ریاست کی ثانوی زبان نہیں بنایا جاسکتا آئین کے چھٹے ضمیمہ میں جتنی زبانیں ہیں سب کے لیے کوئی نہ کوئی علاقہ سرکاری حیثیت سے مقرر ہے۔ آخر اردو کا کیا قصور ہے؟ کہ اسے اس حق سے محروم رکھا جائے اسکو بولنے والے

ہندستان کی دوسری زبانوں سے بہت زیادہ ہیں اور اسکا ادبی ذخیرہ دوسری زبانوں کے لیے باعث رشک ہے۔"

اس زبان کے خلاف متعین تعصب کا جذبہ کارفرما ہے اور عام خیال یہ ہے کہ یہ پاکستان کی زبان ہے۔"

چنانچہ جون سنہ ۱۹۷۸ء میں ایک کمیٹی اور مقرر کی گئی کہ وہ گجرال کمیٹی کی سفارشات کو کاٹ چھانٹ کر پیش کرے۔ مئی سنہ ۱۹۸۰ء میں اس سب کمیٹی کا دائرہ کار مرکزی سرکار تک جا پہونچا۔

۱۷/اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء کو پتہ چلا کہ اس کمیٹی نے کاٹ چھانٹ کر گجرال کمیٹی کی سفارشات پر اپنی رپورٹ دے دی۔ اس کمیٹی نے جو بھی سفارشات کی ہوں لیکن محترمہ کا اپنی کابینہ کے نام بھیجا جانے والا مراسلہ اردو کے بارے میں خاموش ہے۔۔۔۔ اور یہ کمیٹی جنتا سرکار اور اندرا سرکار دونوں کے ذہنوں کی عکاسی کرتی ہے۔ نہ گجرال کمیٹی کی سفارشات شایع کی گئیں نہ دوسری کاٹ چھانٹ کرنے والی کمیٹی کی سفارشات منظرعام پر آئیں۔

اگر محترمہ حکمراں ہوں تو مسلمانوں کو ان کے خلاف آواز نہیں اٹھانا چاہئے اور اپنے حقوق کے لیے آواز بلند نہیں کرنا چاہئے نہ ہی کوئی تحریک چلانا چاہئے اور حزب اختلاف کی تو بالکل مدد نہیں لینا چاہئے۔۔۔ ورنہ وہ اس لہجہ میں مسلمانوں کو ڈرائیں گی کہ تصادم اور مایوسی کا ماحول پیدا کرنے سے اقلیتوں کا نقصان ہوگا کیونکہ اس سے دوسرے فرقوں میں رد عمل پیدا ہوگا۔"

اور اسی کے رد عمل کے لیے محترمہ نے ہندو وشو سمیلن کو کھڑا کردیا ہے تاکہ مسلمانوں کو ڈرا اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھا جاسکے۔ جیسا کہ سنہ ۱۹۱۲ء میں کانگریس نے ہندو مہاسبھا کو کھڑا کیا تھا۔

دشمن گئے تو دوست بنے دشمنِ چمن   شبنم جو پی تو کھول گئے لالہ و سمن
سنکی ہوائے سرد تو گجلا گیا چمن   خلعت کی تہہ کھلی تو برآمد ہوا کفن

نغمے چھڑے تو شور سر بام مچ گیا
چٹکی کلی تو باغ میں کہرام مچ گیا

مسلمان غریبی اور جہالت کے غار میں

گوپال سنگھ کمیٹی کی سفارشات:

۱۶ / جون سنہ ۱۹۸۳ء کو گوپال سنگھ کمیٹی کی سفارشات اخبارات میں آئیں۔ یہ ہائی پاور پینل مئی سنہ ۱۹۸۰ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اسوقت اس کے چرمین ڈاکٹر سید محمد تھے جو بعد کو برطانیہ میں ہائی کمشنر بنا دیئے گئے۔ اور ان کی جگہ ڈاکٹر گوپال سنگھ کو مقرر کیا گیا، اس کمیٹی کی رائے میں:

مسلمان غریبی اور جہالت کے غار میں گرتے جا رہے ہیں۔

اسلئے

اقلیتوں کو سہولتیں بہم پہونچانے کے لیے مستقل نگراں نظام قائم ہو۔

کمیٹی نے وزیر داخلہ سے کہا

اقلیتیں آئین میں درج سہولتوں سے فائدہ اٹھانے سے محروم ہیں۔

جیسے

- ابتدائی، ثانوی اور یونیورسٹی تعلیم۔
- تجارت کے مواقع۔
- رعایتی شرح پر بینک کے قرضے۔
- سرکاری اور پرائیویٹ سکٹر میں ملازمتوں سے محرومی۔
- زمینوں کی تقسیم، دیہی ترقیاتی اسکیموں، پرمٹ اور لائیسنسوں وغیرہ میں اقلیتوں کو بالکل نظرانداز کردیا جانا شامل ہے۔

اس بنیاد پر کمیٹی نے نتیجہ نکالا کہ اقلیتوں کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ اس غریبی اور جہالت کے غار سے انھیں نکالنے کے لیے کچھ تجاویز بھی پیش کیں۔

- اس کے لیے ایڈمنسٹریٹیوں اور ریاستی حکومتوں کے احکامات اور تعاون ہی سے کچھ ہوسکتا ہے۔
- ایک علاحدہ اور مستقل مشنری نظام کے بغیر اس پر عمل در آمد ناممکن ہے۔
- لیکن مشنری ایسی ہونا چاہئے کہ جس کی سفارشات پر پورا عمل در آمد ہوسکے۔
- وہ اس قابل ہو کہ مرکزی اور ریاستی محکموں کو ہدایات دے سکے۔

ڈاکٹر گوپال سنگھ نے سنجیدگی سے مسائل کو پرکھا اور باقاعدہ اپنی رائے دی اور مسائل کے حل کے لیے بھی کچھ تجاویز رکھیں لیکن یہ سمجھنے والے دل و دماغ کہاں ہیں کہ

یترہ گلیوں میں لرزتی ہوئی آواز گدا
طبل رسوائی سلطاں ہے کوئی کیا جانے

۱۹۸۳ء کانگریس (ا) اور فرقہ پرستوں کے گٹھ جوڑ کا سال

ایک طرف آسام میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے اور مذہب کی بنیاد پر ہندستانی کی شناخت آسام میں مرکزی سرکار کا اصول بن رہا ہے۔ دوسری طرف پنجاب میں آگ بھڑک رہی ہے، شعلے اٹھ رہے ہیں۔

مسلمانوں کے خلاف دائمی نفرت کا مرض لیڈروں میں ابھر رہا ہے۔ جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے خلاف فسادات میں اضافہ ہونے لگا ہے۔ مسلمانوں سے زبانی ہمدردی کرنے والوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے اور ان کے خون کو بھی سیاست اور ووٹوں کے پیمانوں سے ناپا جارہا ہے۔ جہاں کانگریس (ا) کی حکومتیں ہیں ان صوبوں میں ہونے والے فسادات پر حزب اختلاف واویلا کرتا ہے، جہاں کانگریس کی حکومتیں نہیں ہیں ان صوبوں

میں مسلمانوں کے خلاف ہونے والے فسادات اور ناانصافیوں کے خلاف کانگریس (ا) کے ڈر کر شوروغل کرتے رہتے ہیں نہ کوئی اصول یہاں ہے نہ وہاں، سیاسی قزاقوں کی ٹولیاں مسلمانوں کے دوٹوں پر شب خون مارنے کے لیے شب تاریک اور مناسب وقت کی منتظر ہیں۔ مسلمان لیڈر اجتماعی تصور کھو کر مختلف سیاسی پارٹیوں کے کھونٹوں پر اچھل کود کرتے ہوئے ملت اسلامیہ کی قتل گاہوں پر اپنی اپنی سیاسی پارٹیوں کی ایما و مرضی کے مطابق بیانات دیتے رہتے ہیں۔

سنہ ۱۹۸۰ میں مراد آباد میں عین عیدالفطر کے دن مسلمانوں پر پولیس کی گولیاں چل رہی تھیں لاشیں تڑپ رہی تھیں، مسلم گھرانے ماتم کدہ بنے ہوئے تھے اس وقت ہندستان کا سب سے بڑا سنت اور مہاتما، اہنسا کا پجاری مہاتما گاندھی کا اصلی چیلا ونوبا بھاوے گئو کشی پر پابندی لگانے کا نعرہ بلند کر رہا تھا۔ اور جب بھی ہندستان میں مسلمانوں کو لوٹا، جلایا اور قتل کیا گیا تب ونوبا نے مسلم کشی کو روکے جانے کی بات نہ کر کے ہمیشہ گئو کشی روکے جانے کی بات کی اور کبھی مسلمانوں کے خلاف ہونے والے ظلم و بربریت کے خلاف ایک لفظ نہ کہا۔

جمعیت العلماء ہند جو ہندستان کے عالموں کی جماعت ہے آزادی کے پہلے سے کانگریس کی زرخرید غلام رہی ہے اور آج کے جمعیت کے لیڈر اپنے اجداد کے علم سے بھی محروم ہیں اور کردار و عمل سے بھی، اور اگر انھیں کانگریس (ا) کا "لتہ حیض" کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اسلئے کہ جب اندرا جی نے انھیں چاہا استعمال کیا جب چاہا الگ کر دیا۔

دوسری طرف ملک کی ساڑھے سات سو ہندو جماعتیں (چھوٹی بڑی) "ہندو وشو سمیلن" کے نام سے یکجا ہو کر مسلمانوں کو ہندو بنا لینے کے حوصلہ کے ساتھ میدان میں اتری ہیں۔ جسے اندرا گاندھی کی خاموش سرپرستی حاصل ہے۔ اور یہ ہندو فرقہ وارانہ ذہن کا پرشباب دور ہے۔ پنجاب میں چودھری چرن سنگھ کو سکھوں کے بھیس میں پاکستانی سپاہی دکھائی دے رہے ہیں۔ تو محترمہ اندرا گاندھی مسلمانوں کو للکار کر کہہ رہی ہیں کہ کوئی اقلیت اکثریت کو ناراض کر کے زندہ نہیں رہ سکتی۔

سنہ ۱۹۷۱ء میں بنگلادیش کی راہ سے پاکستان توڑنے میں اندرا گاندھی کا یہی جذبہ کار فرما تھا کہ مسلمانوں کی طاقت کو پارہ پارہ کردیا جائے لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس میں انھیں کامیابی نہیں ہوسکی اور آج ہندستان میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف بنگلادیش نے بغداد کانفرنس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور آسام کے قتل عام کو کانفرنس کی میز پر لانے کا کام کیا جسکا ذکر ہم پچھلے صفحات میں کرچکے ہیں۔

ہندستان میں اگر کوئی ہندو لیڈر مسلمانوں سے ہمدردی کرے تو سبھی فرقہ پرست جماعتیں اور کانگریس کے لوگ ایک ہوجاتے ہیں۔

جیسے صوبہ بہار کے وزیر اعلیٰ جگن ناتھ مصرا نے اسپشل عدالتیں قائم کرکے بہار میں فرقہ وارانہ فسادات کے ذمہ داروں کو سزا دلوانے کا کام کیا تو کانگریس جس کے وہ خود لیڈر تھے اور حزب اختلاف نے ان کے خلاف محاذ بنالیا۔

ڈاکٹر جگن ناتھ مصرا نے مظفر پور (بہار) میں انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام ہونے والی اردو کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اگر ان سے پوچھا جائے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں کون سی سب سے بڑی کامیابی حاصل کی ہے تو وہ بلا تامل یہ کہیں گے کہ مسلمانان بہار میں تحفظ، وقار اور عزت و احترام کا احساس بیدار کرنے کے لیے انھوں نے متعدد اقدامات کئے ہیں۔ انھوں نے جو اقدامات کئے ہیں وہ ان کے ضمیر کی آواز تھی کسی طرح کے اثر و رسوخ اور دباؤ کے تحت انھوں نے یہ قدم نہیں اٹھایا ان کے خلوص اور راست بازی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ کانگریس (ا) نے اپنے منشور میں جو وعدے کئے تھے انھوں نے اس سے زیادہ کام اقلیتوں کے لیے کئے، مسلمانوں کی بہتری کے لیے انھوں نے وہ اقدامات کئے جن کا تصور بھی مسلمانان بہار کے ذہنوں میں نہیں تھا۔ انھوں نے کہا ـــ "اس طرح کے امور میں سیاسی ہمت و حوصلہ کی شدید ضرورت ہے اور ووٹ نہ ملنے کے خطرہ کو اپنے ذہن سے نکال کر دور پھینک دینا چاہئے۔"

وزیر اعلیٰ بہار جگن ناتھ مصرا نے کہا ـــ "وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اقلیتوں کے مفادات کی علمبردار ہیں اور چوں کہ وہ ان کے مخلص کارکن ہیں اسلئے اپنی زندگی کی آخری

سانس تک وہ اقلیتوں کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے کام کرتے رہیں گے۔"

یہ بیان وزیر اعلیٰ بہار نے ۱۹ / اپریل سنہ ۱۹۸۳ء کو دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس پر عمل در آمد اس طرح شروع کیا۔

o فرقہ وارانہ فسادات کے علاقوں میں تعزیری جرمانے وصول کرنے کا قانون،

یہ قانون ایک تاریخی کارنامہ تھا۔ اس قانون کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں کہ اس قانون کی بنیادیں ایسے منصفانہ اصول پر استوار کی گئی ہیں جن کا واضح مقصد ہے کہ اکثریتی فرقے پر اقلیتی فرقہ کے تحفظ کی ذمہ داری ہے۔ اور اگر اکثریتی فرقہ اس میں ناکام رہتا ہے تو اپنی اس سنگین کوتاہی کی تلافی جرمانہ ادا کر کے کرے۔

o فرقہ وارانہ فسادات سے نمٹنے کے لیے مخصوص عدالتوں کا قیام۔

اس طرح ان قصوروار لوگوں کو شدید ترین سزائیں دینے کی کوشش کی گئی جو بہار شریف کے قتل عام کے ذمہ دار ہیں تاکہ ایسی شرمناک وارداتیں ماضی کی داستان بن جائیں۔

۲ / اپریل سنہ ۱۹۸۳ء کو بہار شریف کی ایک عدالت نے چودہ افراد کو عمر قید اور دیگر سات فسادیوں کو دو سال قید کی سزا کا حکم سنایا۔

اکیس افراد پر جنھوں نے پانچ ہزار کے مجمع کے ساتھ بہار شریف کے ایک گاؤں کے تین مسلمانوں کو قتل اور دوسرے کئی کو زخمی کیا تھا مقدمہ چلا۔ کل ملا کر خصوصی عدالتوں میں ایک سو چھیالیس افراد مجرم قرار دیئے گئے۔ اس طرح دو افراد کو سزائے موت۔ پچانوے (۹۵) کو عمر قید آٹھ دیگر افراد کو اور سزائیں سنائی گئیں۔

o اینٹی رایٹ بٹالین کا قیام یکم مارچ سنہ ۱۹۸۳ء کو عمل میں آیا۔ جس میں اقلیتی فرقہ، ہریجنوں اور درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کو رکھا گیا۔

o انتظامیہ کی سہولت کے لیے مخصوص سیل کا قیام فرقہ واریت سے متاثرہ علاقوں میں یہ سیل قائم کئے گئے تاکہ عبادت گاہوں اور قبرستانوں کے تنازعات کو فوری طور پر سلجھایا جا سکے۔

o فسادات کیلئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔

o فسادات کے بعد وسائل ور ہائش سے محروم ہو جانے والوں کے لیے امدادی رقم میں اضافہ۔

یہ رقم پانچ سو روپیہ سے بڑھا کر دس ہزار کر دی۔

o پانچ کروڑ روپیہ سے مسلمانوں کے لیے اقلیتی مالی کارپوریشن کا قیام۔

o دوکانوں کے الاٹمنٹ میں مسلمانوں کا کوٹہ مقرر کیا۔

(سرکاری دوکانیں مسلمانوں کو ملنا بڑا مشکل مسئلہ ہے ہندستان میں)

محترمہ اندرا گاندھی جو کچھ اپنی تقاریر میں مسلمانوں کے لیے کہا کرتی تھیں اس پر بہار کے وزیر اعلیٰ نے عمل شروع کیا۔ تو حزب اختلاف اور خود محترمہ کی پارٹی کے لوگ ان کے اشارے پر جگن ناتھ جی کے خلاف ہو گئے۔ اور یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ سیاسی کینسر کا یہ مریض اب زیادہ دنوں تک وزیر اعلیٰ نہ رہ سکے گا۔ اسلئے کہ وزیر اعلیٰ بہار نے جو کام کئے تھے انھیں کانگریس (ا) کی سیکولر سوشلسٹ اور ناوابستگی و بقائے باہم کا ذکر کرنے والی محترمہ اندرا گاندھی برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔

آخری ضرب کہا جاتا ہے جگن ناتھ مصرا نے یہ دی کہ اندرا جی سے پوچھ لیا کہ آر۔ایس۔ایس کے خلاف رپورٹ آ گئی ہے کہئے تو مقدمہ اس پر بھی چلادوں۔ بس پاگل ہو گئیں اور ۱۰/ اگست سنہ ۱۹۸۳ء کو جگن ناتھ مصرا کو ہٹا کر چندر شیکھر سنگھ کو بہار کا وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا۔

کانگریس ہائی کمان نے کہا۔۔۔ "یہ تمام فیصلے سیاسی مصلحتوں پر مبنی تھے اور ان کا مقصد خود کو ناقابل تسخیر بنانا تھا"

یعنی ڈاکٹر جگن ناتھ نے اگر کانگریس کے اعلانات کو عملی شکل دے دی تو اسکا مطلب ہائی کمان نے یہ لیا کہ وہ اپنے کو سیاسی طور پر مضبوط کر رہے تھے۔

نئے وزیر اعلیٰ نے آتے ہی پٹنہ میں اعلان کر دیا کہ پچھلے پندرہ دنوں کے اندر جگن ناتھ مصرا نے جتنے اعلانات کئے ہیں ان پر نظرثانی کی جائے گی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سنہ ۱۹۸۳ء میں ہونے والے واقعات میں فرقہ وارانہ

رجحان میں اضافہ، ضلع انتظامیہ کا فرقہ پرستوں کے ہاتھوں کھلونا بن کر کام کرنا بقرعید سے محرم تک متعدد مقامات پر فسادات، کہیں تقریبات پر پابندی اور کہیں رفع شر کے لیے خود مسلمانوں کا ان تقریبات سے اجتناب یہ ایسی باتیں ہیں جو پکار پکار کر سرکار اور فرقہ پرستوں کے درمیان مفاہمت کی کہانیاں سنا رہی ہیں۔

یو۔ پی کے ضلع فیض آباد میں مسلمانوں کے ایک سو پینسٹھ (۱۶۵) مکانات جلا دیئے گئے۔ عین عشرہ کے دن۔ اس کے ایک ہفتہ کے بعد بہرائچ شہر میں جہاں سید سالار مسعود غازی کا مزار ہے۔ وہاں ایک مسجد کی زمین پر پولیس کی موجودگی میں "شیونگ" لگا دیا گیا اور اس پر مسلمانوں نے احتجاج کیا تو ان پر گولیاں برسائی گئیں اور سیکڑوں مسلمانوں کو یک طرفہ طور پر گرفتار کیا گیا۔ کانگریس کے ایک مولوی نے اتر پردیش میں مسلمانوں کی ایک جماعت کو اسکا ذمہ دار قرار دیدیا جبکہ مولانا کے پاس اسکی کوئی شہادت نہیں ہے۔ ہاں ڈاکٹر خان محمد عاطف نے ایک اخباری بیان میں کہدیا تھا کہ جب ضلع انتظامیہ نے متنازعہ زمین پر جو مسجد سے ملحق ہے پولیس لگا دی تھی تو پولیس کی موجودگی میں "شیونگ" کیسے رکھا گیا؟ ایسی نااہل انتظامیہ کو برطرف کر کے اس پر مقدمہ چلایا جائے جس کے نتیجہ میں بیسیوں مسلمان زخمی اور دو کی شہادت عمل میں آئی سیکڑوں کو جیل بھیجا گیا اور بے گناہ شہریوں کو کرفیوں کی مصیبت اٹھانا پڑی۔

اس بیان کی کاٹ کے لیے اور ضلع انتظامیہ کو بچانے کے لیے مولانا نعمانی نے حالت نشہ میں یہ سب کچھ کہدیا۔ حالانکہ اسی شخص کے خلاف مسدی لال کمیٹی نے (مئو ضلع اعظم گڈھ میں ہونے والے فساد کے سلسلہ میں) جو ۱۷/ اپریل سنہ ۱۹۶۹ء کو قائم ہوئی تھی اپنی سو صفحات کی رپورٹ میں وہاں کے ہندو مسلم فساد کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔"

ان مسلمانوں کے یہاں بستگان غم کا بین سکے ڈھالنے کے لیے ہوتا ہے، مسلمانوں کا قتل ان کا ساز عشرت ہے جسے سنا کر یہ حکمرانوں سے قربت حاصل کرتے ہیں لیکن اس کے بعد بھی تاجران خون ملت پوری ڈھٹائی سے دندناتے پھرتے ہیں اور ملت کے مسیحا بن کر اس کے مرض کو بڑھانے کا کام کرتے ہیں۔ ان کے پاس نجات کے طویل وعدوں

کے سوا کچھ بھی تو نہیں رہ گیا ہے۔

جہاں سیاست فرعون و سامری ہے محیط
وہاں شکوہ کلیم و مصطفیٰ کی بات نہ کر

اکابرینِ مِلّت اور بدنصیبِ مِلّت کی داستانِ غم

علماء کی ذمہ داری ہے کہ اللہ کی مخلوق میں عدل و مساوات قائم کریں۔ اور اس علم کے ذریعہ جو اللہ تعالیٰ نے انھیں عطا کیا ہے۔ اللہ کی مخلوق کو راہ حق پر لانے کی کوشش کریں۔ تاکہ انھیں سیدھے راستے پر لگا کر وہ خیرامم کا شرف حاصل کر سکیں۔ اس کے لیے راہ کا تعین کرنا بھی انھیں کی ذمہ داری ہے۔ دین کے مشکوک مسائل کو حل کریں تاکہ دلیل کا نور اہل شک کے سینوں میں اتر جائے۔ کیونکہ یہ خدمت دوسری تمام خدمات پر اولیت رکھتی ہے۔ لیکن وہ لوگ جو اس راہ سے دور خود جا پڑے ہیں اور اپنے کو حکومت کے درباروں کا قیدی بنا چکے ہیں..... وہ ملت کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟

شریعت کا مقصد قیام عدل و انصاف لیکن شریعت کے علمبردار جب خود ہی ظلم و ناانصافی کے ہمنوا ہوں تو ان سے ہم کیا امید کریں؟

جن کے سینوں سے عزم و یقین کی گرمی نکل چکی ہو،
وہ مردہ دلوں میں حرارت کیسے پیدا کریں گے؟
وہ غفلت شعار ملت کو کیسے زندگی کی تازگی عطا کریں گے؟
جن کے دلوں کے دروازے بند ہو چکے ہوں،
وہ مظلوموں، بیکسوں، یتیموں اور بیواؤں کی آہ و بکا کیسے سنیں گے؟

جو راہ کے پتھروں کی طرح دوسروں کی ٹھوکروں اور سوکھے پتوں کی طرح ہوا کے محتاج ہوں،

وہ لوگوں میں مقصد سفر کیسے پیدا کر سکتے ہیں؟ ان کے سینوں میں یقین کی نہ ملنے والی طاقت اور صبر کی اٹل قوت پیدا کر کے ظلم و جبر کے مقابلہ میں چٹان کیسے بنا سکتے ہیں؟

جو قانون خداوندی کی قید سے آزاد ہو چکے ہوں،

وہ دنیا کے قید خانوں میں مردان حق کی دنیا کیسے آباد کر سکتے ہیں؟

جو خود ہی باہمی جنگ سے گرتی ہوئی دیوار بن چکے ہیں.

وہ ملت کو متحد کر کے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کیسے بنا سکتے ہیں؟

سنہ ۱۹۸۰ کے شروع میں افغانستان کے مسئلہ کو لیکر کچھ اکابرین ملت میدان میں اترے تھے اور روس کے حملہ کے خلاف حریت پسندوں کے لیے آوازۂ حق بلند کیا تھا۔ لیکن دیوبند (دارالعلوم) کے جشن کے بعد جس میں روس کی توسیع پسندی کے خلاف تجویز بھی پاس کی گئی تھی دارالعلوم کے مہتمم قاری محمد طیب صاحب مرحوم کے خلاف سازشیں تیز کر دی گئیں اور اکابرین ملت نے حضرت مولانا محمد طیب صاحب کو بے دخل کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ جمعیت العلماء کے روس نواز گروہ نے تمام علماء پر شب خون مارنے کا کام کیا اور ہندستان کے با اثر علماء کے پیچھے سازشوں کا جال بچھا دیا گیا۔ یہاں تک کہ بے غرض، مخلص اور بے لوث خالص علمی کام کرنے والے ایک عالم پر جس کے اثرات ہندستانی عوام پر بھی تھے اور عالم اسلام پر بھی نادان دوستوں نے غلط مشوروں کے ذریعہ ان کی عزت و شہرت کو بھی ملیا میٹ کر دیا اور فراست مومن ریاکاروں سے مات کھا گئی۔ اسلئے کہ سیاسی داؤں پیچ والے اکابرین اپنی قدر و قیمت ملت میں کھو چکے تھے لیکن جس کی بات بن گئی تھی اسے بھی رسوا کر دیا جائے۔ چانچہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کے خلاف بھی ان سے قلم اٹھوایا گیا۔ اس طرح عوامی سطح پر اور پھر عالمی سطح پر ان کے خلاف غلط فہمیوں کے سامان فراہم کر دیئے گئے۔

یہ اکابرین آفتاب کو چھوڑ کر ذرات میں الجھ گئے۔ مسلمانوں کے بنیادی مسائل کے

حل کے بجائے ظالم و جابر حکمرانوں کی مسلم کش انتظامیہ کی پشت پناہی کرنے لگے۔ مسلمانوں کی قتل گاہوں کی سیر کرنے جاتے وہاں کے وزرائے اعلیٰ اور اعلیٰ افسران کی پر تکلف دعوتوں اور سرکاری سہولتوں میں الجھا کر ان سے غلط بیانیاں کرواتے اور یہ مسلمانوں کے درد اور دکھ کی ترجمانی کے بجائے پر پیچ بیانات دیتے۔ ایسے بیانات جو مسلمانوں کی قتل گاہوں پر دبیز پردے ڈالتے چلے جاتے۔

عوام کو دھوکا دینے کے لیے "ملک و ملت بچاؤ" تحریک چلانے کا نعرہ دیتے۔ اس طرح لاکھوں روپیہ غریب مسلمانوں کی جیبوں سے نکال لیتے۔ اور عین وقت پر تحریک واپس لے لیتے ایک معمولی سی دھمکی سے مرعوب ہو کر۔

ملک و ملت بچاؤ تحریک کے کمانڈر شاہنواز خاں کو محترمہ اندرا گاندھی ایک خط میں یوں دھمکی دیتی ہیں۔

"جس طرح کی ستیہ گرہ آپ کے ذہن میں ہے۔ خواہ اسے آپ کسی قدر پر امن تصور کریں اسے کانگریس (ا) پر براہ راست وار سمجھا جائے گا۔

آپ نے جن انتہا پسند متعصب ہندو تنظیموں کا ذکر کیا ہے۔ جو حال میں وجود میں آئی ہیں۔ کیا کانگریس (ا) یا میں اس کے لیے ذمہ دار ہیں؟ یہ تنظیمیں فرقہ پرست مسلم تنظیموں کی طرف سے حقیقی یا خیالی خطرے کے رد عمل کے طور پر وجود میں آئی ہیں۔ ہم ان کا اسی صورت میں مقابلہ کر سکتے ہیں۔ جب ہمیں اقلیتوں کی مکمل حمایت حاصل ہو۔

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ کوئی اقلیت زندہ نہیں رہ سکتی اگر اس کی پڑوسی اکثریت ناراض ہو۔ عجلت میں اگر قدم اٹھایا جائے گا تو اس سے فائدے کے بجائے نقصان ہو سکتا ہے۔"

قفس میں دیتے ہو کیا طعن سست پروازی
فضا کھلی ہوئی ملتی۔ تو امتحاں ہوتا

یہ خط جنرل شاہنواز خاں کے نام جو پرانے کانگریسی ہیں ۱۰/ فروری سنہ ۱۹۸۳ ۱

ستیہ گرہ ــ کا مطلب ہے سچائی پر زور دینا۔ لیکن یہاں ایسی تحریک جس کے ذریعہ اپنے کو گرفتاری کیلئے پیش کیا جائے۔

کو پرائم منسٹر ہاوس نئی دہلی سے جاری ہوا۔

اس خط میں چار باتیں کھل کر سامنے آئیں۔

(۱) مسلمانوں کا یہ مظاہرہ براہ راست کانگریس(ا) پر حملہ تصور ہوگا۔

(۲) فرقہ پرست ہندو تنظیمیں، فرقہ پرست مسلم تنظیموں کا رد عمل ہیں۔

(۳) ان ہندو تنظیموں کا ہم یعنی اندرا گاندھی اسی وقت مقابلہ کر سکتی ہیں جب مسلمان ہماری اطاعت کریں اور ہمیں ان کی حمایت حاصل ہو۔

(۴) کوئی اقلیت اکثریت کو ناراض کر کے زندہ نہیں رہ سکتی۔

پچھلے صفحات میں ہم نے محترمہ کے دادا موتی لال نہرو کا ذکر کیا ہے اور مولانا محمد علی کی رائے لکھی ہے، دوسری جگہ ان کے والد پنڈت نہرو کی اقلیتوں کے بارے میں ذہنیت کو بیان کیا ہے۔ سنہ ۱۹۲۸ء سے سنہ ۱۹۸۳ء تک محترمہ کی تیسری پشت ہے مگر اقلیتوں کے بارے میں کوئی ذہنی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔

○ مسلم فرقہ پرست تنظیموں کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن نشاندھی نہیں کی اسلئے کہ ہندستان میں مسلمانوں کی تین سیاسی تنظیمیں ہیں۔ کیرالہ میں مسلم لیگ جہاں کانگریس کی وزارت و سرکار میں یہ پارٹی ساجھے دار ہے۔ اور مسلم لیگ کا ممبر نائب وزیر اعلیٰ ہے۔۔۔۔ اور کانگریس اس کے ساتھ شریک اقتدار ہے۔ اس سے پہلے وہاں کی کمیونسٹ سرکار کے ساتھ بھی مسلم لیگ وزارت میں شامل تھی۔

یو۔ پی میں مسلم مجلس کے ساتھ سنہ ۱۹۷۲ء میں محترمہ نے الکشنی معاہدہ کیا تھا لیکن جیتنے کے بعد کوئی وعدہ پورا نہیں کیا۔

آندھرا پردیش میں انجمن اتحاد المسلمین ہے۔ اسکا راما راؤ کے ساتھ الکشنی سمجھوتہ تھا۔

دو غیر سیاسی تنظیمیں ہیں۔ جمیعت العلماء اور جماعت اسلامی۔ جمعیت العلماء محترمہ کی کانگریس(ا) کی نقیب ہے اور معاون کار بھی۔

() محترمہ نے بالکل صاف کہدیا ہے کہ ہم ان تنظیموں کے خلاف اسوقت تک کچھ نہیں کر سکتے جب تک مسلمانوں کو آپ ہمارے دربار میں جھکا نہ دیں مسلمانوں کو ہمارا تابع

فرمان بن کر رہنا ہوگا۔

o ورنہ خوب سمجھ لیں کہ کوئی اقلیت اکثریت کی مرضی و رضا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

اس دھمکی آمیز خط کے نتیجہ میں عین وقت پر ملک و ملت بچاؤ تحریک واپس لے لی گئی اور ملت اپنی بد نصیبی کا ماتم کرتی رہ گئی۔اس فعل سے متاثر ہو کر دیوبند میں ایک نظم تقسیم کی گئی جسکا نقل کرنا یہاں نامناسب نہ ہوگا اس نظم سے ہندستان کے جملہ اکابرین کے خدوخال نمایاں ہو کر سامنے آجائیں گے۔

نظم کا عنوان ہے "پوسٹ مارٹم" اس کے خالق ہیں صادق صابری یہ نظم مورخہ ۱۱/جون ۱۹۸۳ء کو راحت پریس دیوبند میں طبع ہوئی ہے۔چند اشعار بطور نمونہ:۔

اے امیر ملک و ملت اے حریص عز و جاہ
اے مسلمانوں کی خوشحالی کے سرکاری گواہ

صاف ستھرا سیکولر ہے آپکا تکیہ کلام
دیوبند میں اللہ اللہ اور دلّی ، رام رام

قوم پر ہیں آپ کے احسان یوں تو بے شمار
حالیہ کچھ کارنامے ہیں بہت ہی شاہکار

آپ اگر بغداد جاکر خود نہ کرتے انکشاف
جانے کیا نوٹس لیا جاتا حکومت کے خلاف

لاکھ چلّاتے پھریں آسام کے خانہ بدوش
آپ کیوں ہوتے خدا نا خواستہ ملت فروش

قوم فاقے سے مرے یا ہو کہیں بھی قتل عام
موت برحق ہے سمجھتے ہی رہیں پاگل عوام

آپ کا یہ قول سچا اور سب بیکار ہیں
خود مسلماں اپنی بربادی کے ذمہ دار ہیں

کون کہتا ہے کہ قربانی ہے چھوٹی آپ کی
بے گناہوں کے لہو میں تر ہے روٹی آپ کی

علی گڑھ ، میرٹھ ، مرادآباد میں ماتم سہی
آپکا منصب سلامت اپنے قاتل ہم سہی

وہ بڑودہ اور میرٹھ ہو کہ ہو جمشیدپور
آپنے ہر شہر میں پایا مسلماں کا قصور

کتنا بوگس تھا مرادآباد رائٹ کا جواز
اک سُور سے کون سی مخدوش ہو جاتی نماز؟!

آپ پر تنقید کرنیکا کسی کو کیا مجاز
ہے سبھی کی حد مقرر آپ کی رسی دراز

ہوچکی جب حد مسلمانوں کے استحصال کی
کٹ چکیں جب ہر طرف فصلیں بکاؤ دال کی

کس بلا کا زور تھا تحریک کے اعلان میں
زلزلہ سا آگیا سرکار کے ایوان میں

ملک و ملت آپ کی تحریک کیا طوفان تھا
وہ سبھی کچھ مل گیا جس کا ہمیں ارمان تھا

ہو نہ کچھ اس بہانے یہ تو دھندہ ہوگیا
قبل از تحریک باون لاکھ چندہ ہوگیا

آپ جیسا سورما وہ کون ہے مائی کا لال
قوم سولی پر چڑھا کر جو نمک کردے حلال

کس ہنر سے آپ نے ہتھیا لیا دارالعلوم
آپ کے اس آپریشن کی ہے دنیابھرمیں دھوم

یہ مدرسہ وقف ہے تعلیم و مقصد مذہبی
آپ اسے قومی کہیں یا کہیں سوسائٹی

آپ سے پہلے جو صوفی مولوی درویش تھے
وہ نہ دانشمند تاجر تھے نہ دوراندیش تھے

انکو کیا معلوم تھا بزنس ہے کس چڑیا کا نام
سود جیسی شرطیہ آمد کو کر بیٹھے حرام

وہ تو کہئے آپ نے کھلوا کے مسلم فنڈ ٹرسٹ
سود قانون شریعت میں کیا خود ایڈجسٹ

آپ جو کچھ ہیں حکومت کی نوازش سے بنے
اور جمعیۃ کے صدر خود اپنی کاوش سے بنے

کوئی اندرا جی سے پوچھے قدر و قیمت آپ کی
قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

اس حمام میں سب یکساں اور سب ملت فروشی کے معیار اعلیٰ پر فائز۔

اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء میں جب آندھرا سے بنگال تک مسلمانوں کا قتل ہو رہا تھا۔ محرم کے مہینہ میں اتر پردیش کے شہروں میں مسلمانوں کے گھر جلائے جا رہے تھے، فرقہ پرستوں اور پولیس کی گولیوں سے مسلمانان ٹانڈہ (ضلع فیض آباد) اور بہرائچ میں شہید کئے جا رہے تھے۔ مئو ضلع اعظم گڈھ میں مسجد پر بم مارے جا رہے تھے...... اسوقت اکابرین ملت ان مسائل کو چھوڑ کر ایک سرکاری ملازم کو بچانے کے لیے قوم کے نام سرکلر جاری کر رہے تھے۔

۱۹/۱اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء کو ٹانڈہ (ضلع فیض آباد) لکھنؤ سے دو سو کلومیٹر پر مسلمانوں کی قتل گاہ بن چکا تھا بیس مسلمان شہید ایک لکھنؤ میڈیکل کالج میں شدید طور پر زخمی اور ۱۶۵ مکانوں کو آتش کدہ بنایا جا چکا تھا...... ۲۳/۱اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء کو لکھنؤ میں اکابرین ملت جمع ہوتے ہیں اور لکھنؤ ۲۳/ اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء کی تاریخ کے

ساتھ سید حامد وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے حق میں اس عنوان کے تحت ایک بیان جاری کرتے ہیں:

"مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے سلسلہ میں اکابرین ملت کا مشترکہ بیان۔"

جسکا مقصد گھما پھرا کر یہ ہے کہ سید حامد کو ہر قیمت پر وائس چانسلر رہنا چاہئے۔ جس کے بے شمار جرائم میں سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ طالبات تک کے ہاسٹل میں پولیس اور پی-اے-سی کو داخل ہو جانے کی اجازت دی گئی۔

شعبۂ تاریخ میں پانچ سال سے کام کرنے والے ایک استاد کو جس کی سلکشن کمیٹی میں پروفیسر نورالحسن بھی تھے۔ اس استاد کو اسلئے کاٹ دیا گیا کہ وہ مسلمان تھا جبکہ اول تا آخر وہ فرسٹ کلاس تھا۔

مگر علی گڈھ جب ان اکابرین کا وفد پہونچتا ہے تو معقول قیام و طعام کا انتظام ہو جاتا ہے یونیورسٹی کی گاڑیاں دہلی اور کانپور تک پہونچا کر واپس آجاتی ہیں ...... اسلئے ایسے شخص کو اس کے حسن انتظام کے عوض بچانا ضروری امر ہے۔

ان اکابرین ملت کے متوازی ایک ایکشن کمیٹی بھی کام کر رہی جو اب کسی وجہ سے سید حامد کے خلاف ہو گئی ہے اور اس نے یکم اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء کو لکھنؤ ہی میں جلسہ کر کے وائس چانسلر پر بے اطمینانی ظاہر کر دی۔

اس کے جواب میں اکابرین ملت نے ۲۳/ اکتوبر کو یہ بیان دیا ...... "ہم لوگ وائس چانسلر اور ان کے اصلاحی اقدامات پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ یونیورسٹی کی تعمیرو ترقی کی خاطر "موجود" رہیں اور حکومت ہند ان کو یونیورسٹی میں خدمات کا پورا موقع فراہم کرے۔"

اس سفارش، بھیک، فرمان یا حق نمک کی ادائیگی کے کاغذ پر نام ہیں (دستخط کنندگان) حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمان عثمانی (جو بیچارے فالج زدہ ہیں) اب مرحوم صدر کل ہند مسلم مجلس مشاورت۔ مولانا سید ابوالحسن ندوی۔ مولانا سید منت اللہ رحمانی (امیر شریعت بہار و اڑیسہ)۔ مولانا قاضی زین العابدین (رکن شوری دارالعلوم دیوبند)۔ مولانا سعید

احمد اکبرآبادی۔ ڈاکٹر عبدالحفیظ سلفی (سابق صدر جمعیتہ اہلحدیث)۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمان (دارالمصنفین اعظم گڈھ)۔ مولانا محمد عمران خاں ندوی بھوپال۔ مولانا حکیم محمد زماں حسنی (کلکتہ)۔ مولانا ابولعرفان صاحب ندوی (سابق مہتمم ندوہ العلما لکھنؤ)۔ مولانا عبدالکریم پاریکھ ناگپور۔ مولانا ثمین الدین ایم۔ پی (نائب صدر آل انڈیا جمعیتہ المومنین) ۔ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی (ناظم اعلیٰ دینی تعلیمی کونسل یو۔ پی) سید شہاب الدین ایم۔ پی جنتا پارٹی (نائب صدر کل ہند مسلم مجلس مشاورت)۔ مولانا احمد علی قاسمی (جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت)۔ [ان میں سے بیشتر ہم میں نہیں رہے اللہ انہیں معاف کرے]

سید حامد کی سفارش اور ان کی ملازمت کی بقا ان اکابرین کی نگاہ میں ٹانڈہ کے قتل و غارت گری اور آتش زنی سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ روز اخبارات میں خبریں آرہی تھیں کہ ٹانڈہ مسلم مجلس کے صدر حکیم وکیل احمد زخمی حالت میں لکھنؤ میڈیکل کالج میں داخل ہیں لیکن یہ اکابرین نہ تو ان کی عیادت کو گئے نہ ٹانڈہ کے واقعات کے سلسلہ میں یو۔ پی سرکار سے ملے۔ نہ ٹانڈہ جاکر حالات کا جائزہ لیا اور نہ ہی شہداء کے اہل خاندان اور برباد ہونے والوں سے ہمدردی کی کوئی تجویز پاس کی۔

اگر حکومت آپ کی باتوں کو اتنی ہی اہمیت دیتی ہے تو سید حامد سے اہم مسئلہ ٹانڈہ کی قتل و غارت گری تھی۔۔۔ لیکن اگر کوئی بے مانگے مشورہ کسی کو دے تو اسے کیا کہتے ہیں؟

اندرا سرکار کے لیے سید حامد جب تک مفید ہیں وہ کہیں گی کہ مسلمانوں کے لیڈر انھیں پسند کرتے ہیں۔۔۔۔ اور جب ان کے لیے مضر ثابت ہوں گے آپ کا مشورہ گوزشتر ثابت ہوگا اور اس سے زیادہ کچھ نہیں،

فیصلہ آپ کریں جس قوم کے علماء کی یہ حالت ہو۔۔۔۔ وہ قوم کیا کرے؟ اپنی لڑائی کس کے سہارے لڑے؟

یہ مشترکہ بیان جو مسلم مجلس مشاورت کے لفافہ میں ڈاک کی نذر کیا گیا ہے جس پر 25-10-85 کی لکھنؤ کے ڈاکخانہ کی مہر لگی ہوئی ہے اور ۲۵/اکتوبر کو بہرائچ میں پولیس کی گولیوں سے دو مسلمان شہید ہوچکے تھے۔۔۔۔ لیکن مسلمانوں کی شہادت اور قتل و

غارت گری کو شیر مادر کی طرح پی جانے والے اکابرین ملت کس مرض کی دوا ہیں؟ عالم اسلام اور اسکے علماء ان سے پوچھیں، اسلئے کہ شاندار آداب و القاب اور بے روح تنظیموں کے نام پر عالم اسلام ان کی عزت کرتا ہے اسلئے اُسے یہ حق ہے کہ وہ ان اکابرین سے احتساب بھی کرے اور اگر یہ جھوٹ ثابت ہو جائے کہ یہ ملت کی ہمدردی کے نام پر ملت اسلامیہ کی ذلت و رسوائی کا سبب بنتے رہے ہیں تو میں کسی بھی اسلامی عدالت سے جھوٹ و اتہام اور بہتان طرازی کے سلسلہ میں ملنے والی ہر سزا کو خنداں پیشانی سے قبول کرنے کو تیار رہوں گا۔ (خان محمد عاطف) دستخط کر دیئے تاکہ سند رہے۔

مولانا آزاد کی فکرو نظر کی پامالی

مولانا ابوالکلام آزاد نے متحدہ قومیت کے جو دلائل دیئے کانگریس کے دوسرے لیڈر ان سے ناواقف ہی نہیں بلکہ ناما نوس بھی تھے۔ مولانا نے اس فکرو نظر کو ایک مستقل عقیدہ کی شکل میں جو تبدیل کرنے کی کوشش کی..... اس کے لیے ہندستان جیسے ملک میں ضرورت تھی کہ مختلف فکرو نظر، زبانوں اور بولیوں، نسل ورنگ اور مذہبوں کے ماننے والے لوگ ایک سمت میں آگے بڑھیں، سب ایک دوسرے کے جذبات، احساسات، اور مذہبی اقدار کا احترام کریں اور ملک کے ہر گروہ کو اس زمین کا شہری تصور کریں، رواداری اور برداشت کا ہر طرف سے مظاہرہ ہو اور ہر وحدت و "تہذیبی اکائی" کو یہ احساس ہو کہ وہ آزاد شہری ہے۔ شک وشبہ، خوف و دہشت کا ماحول کہیں موجود نہ ہو۔ نفرت کی دیواریں گرادی جائیں، پیار و محبت کا دور دورہ ہو!

مولانا آزاد نے سنہ ۱۹۲۰ء میں کہا..... "اگر آسمان کی بلندیوں سے ایک فرشتہ اتر کر دلّی کے اس قطب مینار پر کھڑا ہو جائے اور کہے ہندستان کو چوبیس گھنٹہ کے اندر سوراج (آزادی) مل سکتا ہے لیکن اسے ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہونا ہوگا تو میں سوراج لینے سے انکار کردوں گا اگر آزادی ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ صرف ہندستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد ختم ہو گیا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہوگا۔"

لیکن مولانا کے ان خیالات کو کانگریس کے لیڈروں نے ان کی زندگی میں ہی پامال کردیا۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں شاکر آفندی نے مولانا کو لکھا..... "اسلام کے عاشق، حریت کے پرستار میں تسلیم کرتا ہوں کہ تو اپنی ملت مظلوم کی خدمت کر رہا ہے جسم ہی سے نہیں بلکہ روح ودل سے کر رہا ہے گو عالم اسلام کا ہر گوشہ تجھ جیسے خادمان ملت کے لیے بے قرار

و...... منتظر ہے، مگر سب سے زیادہ میرا وطن آہ! میرا وطن عزیز و محبوب...... تیری برق انتقام کے سایہ میں اناطولیہ کے وہ نوجوان ہوں گے جن کے سینوں میں اسلام کا مقدس خون بھرا ہوا ہے۔ شہداء کا خون سوکھنے سے پہلے، معصوم بچوں کی ہڈیاں گلنے سے پہلے، بیوہ عورتوں کے ہلاک گریہ ہونے سے پہلے...... اپنی دولت سعی کو ضائع کرنے والے میری آنکھیں تیرے لیے فرش راہ ہوں گی، میرے لب قدمبوسی کا شرف حاصل کرنے کے آرزومند ہوں گے۔"

قسطنطنیہ کا مرد مجاہد ابوالکلام کو بیواؤں کی مدد، یتیموں کی غمگساری، اور شہیدوں کے سکون قلب کے لیے دعوت دے رہا ہے لیکن خود مولانا کی آنکھوں کے سامنے آزادی کے بعد ہندستان کے چپہ چپہ سے یتیموں کی چیخیں، بیواؤں کی آہ و بکا، دوشیزاؤں کی سسکیاں، اور ان کی عصمت کے تحفظ کی آوازیں بلند ہوئیں لیکن ابوالکلام کچھ نہ کر سکا۔ ابوالکلام کے ہم مذہبوں کو اسکی آنکھوں کے سامنے قتل و غارت گری کے سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ شاہجہاں کا شہر مسلمانوں کے لیے تنگ ہو گیا۔ شیرشاہ کا ہندستان اس کے وارثوں کو جگہ دینے کے لیے تیار نہ تھا۔

"ظلم کو ظلم نہ کہے بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے یہ کہا جائے کہ وہ اسلامی زندگی سے دستبردار ہو جائے ہر مسلمان کی ڈیوٹی ہے کہ جس سچائی کا اسے علم و یقین دیا گیا ہے ہمیشہ اسکا اعلان کرتا رہے۔"

کہنے والا ابوالکلام، آزادی کے بعد "ابوالسکوت" ہو کر رہ گیا۔ کانگریس کے بہت سے لیڈر فرقہ واریت کی راہ سے وزارت عظمیٰ کی کرسی تک پہونچنا چاہتے تھے۔ لہٰذا ملک کو ہندو مسلم نفرت کی آگ میں جھونک دیا گیا۔

مسلمان آج بھی اپنی صنعت و کاریگری سے، فن باغبانی سے، اور دوسری صلاحیتوں سے ملک کی معاشی ترقی کو آگے لے جانا چاہتا ہے۔ لیکن ان کے کاروباری مرکزوں اور صنعتی شہروں کو آگ و خون کی نذر کر دیا جاتا ہے اور امن و قانون کے محافظ پولیس اور پی۔اے۔سی اس کام میں شریک ہو کر شرپسندوں کی طاقت میں معاون و مددگار بن جاتی

ہیں۔ملک کا یہ رُخ ملک کو تباہی کی طرف لیے جا رہا ہے۔

آج ملک کی آزادی کے ۴۹ برسوں کے بعد بھی اکثریت کے ذمہ دار، با اثر اور پروقار اشخاص جو کروڑوں انسانوں کے سینوں پر حکمراں ہیں اور کروڑوں لوگ جن کی فکر و نظر سے ہمدردی رکھتے ہیں یہ طے نہ کر سکے کہ ہندستان میں مسلمانوں کی جگہ کیا ہوگی۔

- مسلمان ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔انھیں اپنے خادموں میں شامل کرلیں۔
- انھیں کاروبار و تجارت اور اپنی ماتحت سیاست میں ہی باعزت جگہ دے دیں۔ یہ بات اس ملک کے مفاد میں ہے۔

عوامی اور سرکاری طریقہ سے مسلمانوں کو خوف زدہ کرنے پر وہی مزاج لگا ہوا ہے جس نے ملک کی تقسیم کی راہ ہموار کی تھی اور یہ گروہ کانگریسی ذہن و مزاج کا سچا ترجمان ہے۔ حکومت کے اشاروں پر کچھ دوسرے گروہ بھی سرگرم عمل ہیں جسکا بنیادی سبب مسلمانوں کو خوف زدہ کر کے ووٹ حاصل کرنے کی پالیسی کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

ابوالکلام کی فکر و نظر کو پامال نہ کر کے اگر ہندستان ان اعلیٰ اقدار پر عمل کرے تو آج بھی کامیابی، ترقی اور باہمی اعتماد کی فضا بن کر ملک کو ترقی کی راہ پر لا سکتی ہے۔ ورنہ قومی یکجہتی اور سیکولرازم صرف زبانوں اور کاغذ پر گردش کرتا رہے گا اور ہندستان کی زمین مسلمانوں کا "قبرستان" بنتی رہے گی۔ جس پر ابوالکلام کا نام مجاوروں اور عقیدت مندوں کی طرح چادریں چڑھانے اور اگر بتیاں سلگانے کے کام آئے گا اور بس۔

اردو کی کہانی بھارتی لیڈروں کی زبانی

شمالی ہندستان میں مسلمانوں کی زبان اردو ہے۔ جو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ جس میں عربی کی معنی آفرینی، ترکی کا شکوہ الفاظ، پشتو کا جذبہ حریت اور شدت احساس، فارسی کی شیرینی اور ہندی زبان کی قواعد ہے۔ مسلمانوں کے آنے سے پہلے "ہندی" نام کی کوئی زبان ہندستان میں موجود نہ تھی اس کی ابتدائی شکل "ہندکو" کے نام سے پاکستان کے علاقہ بنّو اور کوہاٹ میں ملتی ہے۔ اسلئے کہ افغان شہسواروں کی پہلی منزل یہی تھی اور یہیں ایک ہندستانی زبان کی بنیاد پڑ رہی تھی، پھر لاہور تک پہونچتے پہونچتے یہ باقاعدہ بات چیت کی زبان بنی اور دہلی میں داخل ہوتے ہی اسے گل کتری آ گئی اور اسکا ادب وجود میں آنے لگا اور اب یہ زبان "ہندی" کہلائی۔ اس طرح مسلمانوں کا ہندستان پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے (ہندو کہہ کر وحدت مذہب کا تصور دیا اور ہندستان کہہ کر وحدت ملک کا تصور دیا) "وحدت زبان" کا تصور عطا کیا۔ چونکہ اس نئی زبان میں ہندستان کی بہت سی زبانوں، پنجابی، کھڑی بولی، برج، اودھی اور بنگالی کے الفاظ شامل ہو گئے تھے اور جنوبی ہندستان میں یہ دکنی کے نام سے عرب تاجروں کی راہ میں پروان چڑھی تھی۔ اسلئے اس وحدت کو برقرار رکھنے کے لیے "دکنی، اور ہندی" کی جگہ ایک مشترکہ نام "اردو" رکھا گیا۔ یعنی وہ زبان جو لشکر کی مانند ہے۔ جس طرح فوج میں ہر علاقہ کے لوگ ہوتے ہیں اسی طرح اس میں ایشیا اور ہندستان کی مختلف زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ اس طرح اردو شمالی ہندستان، آندھرا، کرناٹک اور بنگال کے مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔ جس کی تعریف تو سب کرتے ہیں، اس کے حسن و جمال کے سب شیدائی ہیں۔ اسکی لطافت و شیرینی کے سب قائل ہیں، اس سے آشنائی کا دم سب بھرتے ہیں مگر رشتہ مناکحت کیلئے تیار نہیں ہیں۔ اپنی اس بات کے ثبوت میں، ہم گاندھی جی سے محترمہ اندرا گاندھی تک سارے

بھارتی لیڈروں کے بیانات اردو کے بارے میں یہاں نقل کرتے ہیں ــــ

مہاتما گاندھی:ــــ "میں اردو کی ترقی چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے سب ہندو جو ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اردو سیکھیں اور مسلم ہندی۔"

پنڈت نہرو:ــــــ "اردو ایک ایسی زبان ہے جس میں زندگی کی دھڑکنیں موجود ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ مختلف اسباب کی بنا پر اردو کی زیادہ سے زیادہ ہمت افزائی کی جانا چاہئے۔ یہ ان زبانوں میں سے ایک ہے جسکا ذکر دستور (ہند) میں موجود ہے اور یہ بالکل ٹھیک ہے کیونکہ بیشک وہ ایک ہندستانی زبان ہے۔ پاکستان تو کیا ہندستان کے علاوہ کوئی ملک اس زبان کے متعلق اپنا دعویٰ نہیں کرسکتا۔"

سردار گوردیال سنگھ ڈھلن (سابق اسپیکر لوک سبھا) "ــــ "میرا ذاتی خیال ہے کہ اردو زبان کو وہ اہمیت، وہ مقام اور وہ مرتبہ نہیں دیا جارہا ہے جس کی وہ حقدار ہے۔ میں تو اردو کا دلدادہ ہوں ــــــ پچھلے دنوں اس سلسلہ میں جو رپورٹ آئی اور پارلیمنٹ میں اسپر جو بحث ہوئی اس سے کچھ امید بندھی۔"

پروفیسر شبن لال سکسینہ (سابق ایم۔پی) اردو کو یو۔پی کی دوسری زبان ابھی نہیں بنایا جاسکتا۔ ترپاٹھی جی (کملاپتی ترپاٹھی سابق وزیر اعلیٰ اتر پردیش) جن سنگھی ذہنیت کے آدمی ہیں وہ اردو کو ہرگز ترقی نہ دیں گے۔ وہ ایک عرصہ تک یو۔پی کے وزیر تعلیم رہے اور ان کے زمانہ ہی (میں) راتوں رات اردو کو اسکولوں، کالجوں، دفتروں اور عدالتوں سے نکال دیا گیا۔ اسلئے ان سے کوئی امید نہیں کی جاسکتی ــــــــ اردو ایک جاندار اور خوبصورت زبان ہے کسی زبان کو مارنا بہت بڑی بے وقوفی ہے ــــ اردو کو فروغ حاصل ہوگا اور ایک دن ایسا آئے گا جب خود اردو کے مخالفین اسکی حمایت کریں گے۔"

سردار سورن سنگھ (سابق وزیر خارجہ):ــــ "اردو بڑی پیاری اور شیریں زبان ہے۔ میری تو یہ مادری زبان ہے اردو کو زندہ اور قائم رکھنے کی ذمہ داری خود اردو والوں پر زیادہ ہے۔"

جے پرکاش نرائن:ــــ "بیشک اس میٹھی زبان کو ضرور زندہ رہنا چاہئے۔ اور میرے

خیال میں یہ زبان ضرور زندہ رہے گی۔ اسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔"

اے۔کے۔ گوپالن کمیونسٹ لیڈر:۔۔۔۔۔ کسی بھی زبان کو ختم نہیں کیا جاسکتا اور اردو جیسی عوامی زبان کو ختم کرنا مشکل ہے۔ یہ زبان اس ملک کی زبان ہے۔ یہ صرف مسلمانوں ہی کی زبان نہیں ہے یہ ایک مشترکہ زبان ہے۔ اس زبان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ کیرالا جیسے دور دراز علاقوں میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مرکزی حکومت سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اسکو اسکا جائز مقام دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

اشوک مہتا:۔۔۔۔۔ "اردو ہندستانی زبان ہے وہ دستور کی زبان ہے وہ نہ ہندو کی زبان ہے نہ مسلمان کی، وہ کیرالا جیسے دور دراز حصوں میں بھی بولی جاتی ہے۔ اردو ایک مالدار ترقی یافتہ، نہایت شیریں اور جوشیلی زبان ہے۔ میں سمجھتا ہوں اسکو اسکا صحیح مقام نہ دینا بہت بڑا ظلم ہے۔"

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا:۔۔۔۔۔ "اردو ہندی کی لڑائی ناسمجھوں کی لڑائی ہے۔ اردو والوں کو ہندی اور ہندی والوں کو اردو پڑھ کر بدیسی زبان انگریزی کو بیدخل کرنا چاہئے تاکہ ملکی زبانیں ترقی کریں اور انگریزی کی "غلامانہ ذہنیت ختم ہو۔"

کے۔کے۔شاہ سابق وزیر اطلاعات و نشریات:۔۔۔۔ ایک سچی بات کہوں، یہ پیاری زبان سیاسی مصلحتوں کا شکار ہو گئی ہے۔ اردو کے حق کو سبھی تسلیم کرتے ہیں اور اس شیریں زبان سے کسی کو دشمنی نہیں ہے لیکن حکومت ہندی والوں کا دباؤ قبول کر لیتی ہے یہ سب ووٹ لینے کی بات ہے۔"

مسز سبھدرا جوشی:۔۔۔۔۔ "اردو کو ایک اچھا مقام ملنا چاہئے بہت سے نیک اور بھلے کام جو کانگریس نہیں کر سکی ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے اردو کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ حکومت کو عملی اعتبار سے اس زبان کے تحفظ و ترقی کے لیے ضرور کچھ کرنا چاہئے۔"

پروفیسر رنگا:۔۔۔۔۔ "اردو ایک تہذیبی زبان ہے۔ اسکو برقرار رہنا چاہئے۔ یہ دستور کی چودہ زبانوں میں سے ایک ہے۔"

ڈاکٹر شنکر دیال شرما (سابق صدر آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور اب صدر جمہوریہ):۔۔۔۔۔

"ہندستان میں اردو کا مستقبل نہایت شاندار ہے۔ یہ زبان یہیں کی پیداوار ہے اور اگر آج اس کی ترقی میں کچھ موانع حائل ہیں تو وہ گزشتہ دنوں کی تاریخ کا ردعمل ہے۔ لیکن وہ تیل جو دل و دماغ میں اردو کے خلاف عناد اور بغض کے دئے جلا رہا تھا۔ اسکا ذخیرہ اب رفتہ رفتہ ختم ہو رہا ہے۔"

ہیم وتی نندن بہوگنا (سابق وزیر اعلیٰ اترپردیش):۔۔۔۔ "ہم نے اردو بھی تحفہ میں پاکستان کو دے دی۔"

اٹل بہاری باجپئی (سابق جن سنگھی لیڈر اور سابق وزیر خارجہ):۔۔۔۔۔ "جن سنگھ اردو کو ایک بھارتیہ بھاشا (ہندستانی زبان) مانتا ہے۔ اور اسے پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہے۔"

وزیر اعظم اندرا گاندھی (چندی گڑھ کے کانگریس اجلاس میں):۔۔۔ "اردو میرے ذہن میں ہے۔"

ہندستان کے لیڈروں کے بیانات اردو کے بارے میں ایسے ہی ہیں جیسے شام کے وقت کسی درخت پر بیٹھے پرندے اپنی اپنی بولیاں بول کر شام کے سناٹے میں ہلچل برپا کردیں۔ یہ آوازیں بھلی ضرور لگتی ہیں مگر سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ ایک ہی پارٹی کے مختلف لیڈروں کے الگ الگ بیانات ہیں۔

مسلمان ہندستان میں پشتو، فارسی، ترکی اور عربی زبانوں کے ساتھ اترے لیکن آہستہ آہستہ اردو کو انھوں نے اختیار کرلیا اور اپنی سابقہ زبانوں کو بھلا بیٹھے لیکن سیکڑوں برس سے ہندستان کے ایک صوبہ کا آدمی دوسرے صوبہ میں رہنے کے بعد بھی اپنی زبان کو نہیں بھولا۔ بنگال کا آدمی مدراس میں تین پشتوں کے بعد بھی بنگالی کو نہ بھلا سکا۔ لیکن آزادی کے بعد مسلمانوں نے اردو کو بھی اپنے گھروں سے چلتا کردیا اور ہندی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے جبکہ جنوبی ہندستان اور بنگال کے لوگوں نے اپنے علاقوں میں ہندی کو "ہندی سامراج" کا نام دیکر داخل ہونے سے روک دیا۔

اس زبان کے پیچھے بھی وہی جذبہ کارفرما ہے کہ یہ فارسی اور عربی حروف میں لکھی جاتی ہے اس لیے مسلمانوں کی زبان ہے۔

مسلمانوں کے عہد حکمرانی میں ہندوؤں کے ایک طبقہ نے فارسی کو جب وہ ملک کی سرکاری زبان تھی ایک چادر کی طرح اوڑھ لیا۔ بعد میں یہی اردو کے ساتھ کیا۔ لیکن آزادی کے بعد اس چادر کو ایسا اتار کر پھینکا کہ پھر ادھر مڑ کر دیکھنا تک گوارا نہ کیا گویا اس چادر میں سانپ اور بچھو لپٹے ہوں ۔۔۔۔ ہم بار بار کہتے ہیں کہ بھئی اردو سب کی زبان ہے لیکن ہمارا پڑوسی یہی کہتا ہے نہیں میاں جی یہ ہماری نہیں ہے، آزادی کے بعد اردو دشمنی کا جو رویہ اپنایا گیا۔ یوم آزادی کے لال قلعہ کے پہلے مشاعرہ میں جوش ملیح آبادی نے اسکی طرف یوں اشارہ کیا تھا:

چلنے لگی لغت پہ چھری انتقام کی　　چھانٹی گئیں تمام جو لفظیں تھیں کام کی
رحمان ہی کی بات چلی اور نہ رام کی　　گدی سے کھینچ گئی جو زبان تھی عوام کی

حیوان بوکھلا گئے ، منہ کھولنے لگے
انسان بولیاں وہ نئی بولنے لگے

گاندھی جی کی نکرو نظر کے مطابق ہندی تو مسلمانوں پر لاد دی گئی۔ جو بھارت کی قدیم زبان سنسکرت رسم الخط میں اب لکھی جاتی ہے جسے دیوناگری رسم الخط کہتے ہیں لیکن ہندوؤں نے اردو کی چادر کو اوڑھنا گوارا نہ کیا۔ اور اس طرح مسلمانوں کو ان کی تاریخ، روایات، دینی تشریحات کی زبان سے محروم کر کے بھارتی دیومالا میں الجھانے کا کام بڑی خوبصورتی سے کیا جاتا رہا ہے۔

ہندستان کے لیڈر جمہوریت کی آڑ میں اقلیتوں اور مسلمانوں کی تہذیب اور روایات کو مٹنے کا کام کرتے رہے ہیں اور اس کے لیے جمہوریت کا ہتھیار استعمال کرتے ہیں کہ ہندستان میں سبکو اپنی رائے کی آزادی ہے، ہم جمہوریت پسند ہیں کسی کو دبا نہیں سکتے اور جمہوریت کی ساری شان مسلمانوں کی زبان کاٹنے، ان کی نکرو نظر پر حملے کرنے، انھیں زندہ درگور کرنے اور ان کے تمدن، رسم و رواج اور مادری زبان کو مٹنے کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہے۔

ہندستان کے صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ نے ۱۰/ نومبر سنہ ۱۹۸۳ کو لکھنؤ

میں ایک کل ہند مشاعرہ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا۔۔۔ "بعض جگہوں پر اردو کو نظرانداز کیا جاتا رہا ہے اپنے ملک کی اس ہردلعزیز زبان کو مرنے نہیں دینا ہے یو۔ پی کے وزیراعلیٰ جو یہاں موجود ہیں میں بحیثیت صدر جمہوریہ یقین دلا سکتا ہوں کہ اگر زبان جیسے معاملہ میں آپکو دقت پیش آئے تو میں ضرور مدد کروں گا۔"

اس سے پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین بیس لاکھ بالغوں کے دستخط اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کے لیے صدر جمہوریہ کے حضور میں لے گئے۔ مگر جب خود صدر جمہوریہ ہند ہوئے تو دستخطوں کے وہ بنڈل انگیٹھی کی نذر ہوگئے۔ ہندستان کے دستور کی رو سے صدر جمہوریہ ایک آرڈی ننس کے ذریعہ اردو کو نظرانداز کئے جانے کی شکایت دور کر سکتا ہے مگر:

یہ مسیح وقت جو آئے یاں وہ مرض بڑھا گئے بے کراں
یہ طویل وعدہ نجات کا، جو نجات ہو تو بتائیے

لیکن افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ قومی پریس نے اس خبر کا بائیکاٹ کردیا۔ ۱۰/ نومبر سنہ ۱۹۸۳ء کے ہندی اور انگریزی اخبارات نے صدر جمہوریہ کے اردو سے متعلق بیان کو جگہ نہیں دی صرف اردو اخبارات نے ہی ان خبروں کو اپنے کالموں میں جگہ دی۔

اپنی افتتاحی تقریر میں صدر جمہوریہ نے یو۔ پی کے وزیراعلیٰ شری پت مصرا کو اردو دوست بھی کہا تھا۔ اس کی تردید ۳/ دسمبر سنہ ۱۹۸۳ء کو وزیراعلیٰ اترپردیش نے اردو اکاڈمی اترپردیش کی جنرل کونسل کا افتتاح کرتے ہوئے کردی اور کہا۔۔۔ "میں صاف بات کرتا ہوں۔ لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ میں ذاتی طور پر اردو کا سخت مخالف ہوں اور اس طرح کے مطالبات قومی یکجہتی کے خلاف ہیں۔ ایک صوبہ میں دو زبانیں نہیں چل سکتیں۔ اس طرح کے مطالبات سے ملک تقسیم ہوتا ہے اور تفریق کا مزاج بنتا ہے۔ اور اگر کانگریس پارٹی میں میرے سامنے اردو کی بات آئی ہوتی تو میں وہاں بھی اسکی جم کر مخالفت کرتا لیکن چونکہ پارٹی کا فیصلہ ہے اسلئے اگلے اسمبلی سشن میں اردو کا بل پیش کروں گا۔

لیکن وہاں موجود دانشوروں میں سے کسی نے جن کے چہرے ۵/ دسمبر سنہ

۱۹۸۳ء کے قومی آواز لکھنؤ کی زینت بنے نہ تو وہاں سے اٹھ کر باہر آئے نہ ہی یہ پوچھا کہ یہاں آپ وزیراعلیٰ اترپردیش کی حیثیت سے بات کر رہے ہیں اگر آپ اپنی ذاتی اور اندرونی کیفیت کا اظہار کردیں گے تو اسکا اثر بیورو کریسی پر کیا پڑے گا؟ اس ذلت آمیز رویہ کو جس میں مفتی صاحب بھی تھے، مولانا بھی، یونیورسٹیوں کے پروفیسر صاحبان بھی تھے اور شاعر و ادیب بھی، چائے کی ایک پیالی کے ساتھ نگل گئے۔ جس قوم کے شاعروں، ادیبوں اور معلموں کی یہ حالت ہو جائے ...... اور دانشوری صدقات و خیرات کی اسیر ہو جائے وہاں بیداری کون لائے گا؟

حالانکہ آنے والے بل میں بھی اہل اردو کے ساتھ اس صدی کا سب سے بڑا مذاق کیا گیا ہے۔ اس بل کی رو سے اترپردیش کے سرکاری محکموں میں اردو عرضداشتیں اس شرط کے ساتھ قبول کی جائیں گی جن کے ساتھ (ہندی دیو ناگری رسم الخط میں) اصل کی نقل دینا ہوگی۔

جس کے بارے میں ۵/دسمبر سنہ ۱۹۸۳ء کا قومی آواز جس کے ایڈیٹر خود اس میٹنگ میں موجود تھے اس طرح ایڈیٹوریل میں اظہار تشکر کرتے ہیں .... "ہم ان کا (وزیراعلیٰ) یہ وعدہ ہے کہ ریاستی اسمبلی کے اگلے اجلاس میں آرڈی ننس کو قانون کی شکل دی جائے گی جسکا مقصد اردو کو دوسری زبان کی حیثیت دینا ہے۔"

آسام میں مسلمانوں کا خون ناحق

آسام کے بارے میں راجیشور راؤ جنرل سکریٹری کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا کہنا ہے کہ آر۔ایس۔ایس جو ہندوؤں کی تہذیبی تنظیم کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے، دراصل ایک سیاسی تنظیم ہے۔ یہ ہندو قوم پرستی کی فرقہ وارانہ آئیڈیالوجی کی تبلیغ کرتی ہے اور دوسرے فرقوں بالخصوص مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلاتی ہے۔ یہ نیم فسطائی تنظیم سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسکا سرغنہ (سرسنگھ سنچالک) اپنے وارث کو نامزد کرتا ہے۔ یہ تنظیم اس اصول پر عمل کرتی ہے کہ لیڈر کا حکم ہی قانون ہے۔ اس کے جنرل سکریٹری پروفیسر راجندر سنگھ کا کہنا ہے کہ سارے ملک میں آر۔ایس۔ایس کی ۳۵ ہزار شاکھائیں ہیں جن میں سات لاکھ وفادار کارکن ہیں۔ یہ لوگ روزانہ صبح یا شام شاکھا میں حصہ لیتے ہیں۔ یہ علاقائی کیمپ منظم کرتی ہیں۔ تین سالہ آفیسروں کی تربیت کا کورس منظم کر کے ہر سال تیرہ ہزار گریجویٹ نکالتی ہیں۔

اس کے علاوہ آر۔ایس۔ایس کی بہت سی تہذیبی، سیاسی اور عوامی تنظیمیں ہیں جن کے ذریعہ وہ عوام کے مختلف زمروں میں دخیل ہیں۔ اس کے علاوہ وہ انتہائی چالاکی سے نہ صرف عوامی تشہیر کے اداروں میں بلکہ مسلح افواج سمیت دوسرے سرکاری شعبوں میں بھی داخل ہے۔

حال ہی میں اس نے ایک نئی تنظیم "وشو ہندو پریشد" قائم کی ہے جو دانشوروں، ریٹائرڈ سرکاری آفیسروں، پروفیسروں اور ججوں کا وسیع پلیٹ فارم ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اندرا کانگریس کے بہت سے ممبران پارلیمنٹ اور وزراء بھی اسکی تقریبات میں حصہ لیتے ہیں۔ آر۔ایس۔ایس ہی کے زیر سایہ مرکز میں کانگریسی سرکار کے سابق وزیر ڈاکٹر کرن سنگھ نے "وراٹ ہندو سمیلن" کے نام سے ایک تنظیم بنائی ہے۔ اس تنظیم نے اپنے

پلیٹ فارم پر تمام ہندو فرقہ پرست تنظیموں کو جمع کرلیا ہے۔ اس تنظیم کا بنیادی نشانہ دوسرے فرقے بالخصوص مسلمان ہیں جنھیں وہ ملک کی تمام برائیوں کی جڑ قرار دیتے ہیں۔
وہ یہ لغو دعوی بھی کرتے ہیں کہ ہندو جو آبادی کا ۸۵ فی صد ہیں مستقبل قریب میں اقلیت میں آجائیں گے۔ ذیل میں ہم اس فولڈر سے بعض اقتباسات دے رہے ہیں جو وشو ہندو پریشد نے مختلف زبانوں میں شایع کیا ہے۔ اور ہر ہندو گھر میں پہونچایا ہے.....
"ہندستان میں ہندو اپنے آپ کو بے یارومددگار محسوس کرنے لگا ہے۔ بار بار کسی نہ کسی بہانے ہندو معاشرہ کو حملہ کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔"
کتنی مضحکہ خیز بات ہے، ہندو اپنے آپکو بے یارومددگار محسوس نہیں کرتے بلکہ مسلمان، ہندو فرقہ پرست طاقتوں کی جارحیت کی وجہ سے اپنے آپکو بے یارومددگار سمجھنے لگے ہیں۔

فولڈر میں مزید کہا گیا ہے..... "ملک میں لگاتار ہونے والے ان جھگڑوں کے پیچھے ایک منظم سازش ہے مراکش سے لیکر ملیشیا تک، صرف ہندستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اسلئے سرکار کے خاندانی منصوبہ بندی پروگرام میں حصہ نہ لیکر ایک سے زیادہ بیویاں رکھ کر زیادہ بچے پیدا کر کے، ہندوؤں کو مشرف بہ اسلام کر کے وہ اپنی آبادی میں لگاتار اضافہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، ہندستان کے جمہوری نظام سے فائدہ اٹھا کر یہاں مسلم حکومت قائم کرنے کا خواب دیکھا جارہا ہے۔"
کیا ہم ان عقل کے دیوانوں سے پوچھ سکتے ہیں کہ کتنے مسلمان چار بیویاں رکھنے اور درجنوں بچے پیدا کرنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ یہ سراسر بہتان ہے تاکہ فرقہ وارانہ نفرت پھیلائی جائے۔

فولڈر میں کہا گیا ہے..... "غیر منقسم ہندستان میں مسلمانوں کی آبادی سات کروڑ تھی، جواب بڑھ کر اٹھارہ کروڑ ہو گئی ہے۔ اسی طرح عیسائیوں کی آبادی ستر لاکھ سے بڑھ کر دو کروڑ ہو گئی ہے سنہ ۲۰۰۰ء تک ہندستان کی کل آبادی ۹۰ کروڑ ہو جائے گی۔ جس میں ہندو صرف پچاس کروڑ ہوں گے لیکن مسلمانوں کی آبادی تیس کروڑ اور عیسائی

آبادی دس کروڑ ہوجائے گی پھر ایک دن ایسا بھی آجائے گا جب ہندو معاشرہ اپنے ہی ملک میں اقلیت میں ہوگا۔"

ہمارے ملک کو فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم کرنے کے لیے یہ تنظیمیں کتنا خطرناک کھیل کھیل رہی ہیں۔ اس کے ذریعہ وہ فرقہ وارانہ ٹکراؤ کے لیے زہریلی فضا تیار کرتی ہیں جسکا ثبوت میرٹھ، علی گڑھ اور دوسری جگہوں پر مل چکا ہے جہاں فسادات سے پہلے وشو ہندو پریشد نے کانفرنسیں کی تھیں۔

راجیشور راؤ کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ آسام کے پیچھے بھی یہی خوف کام کررہا ہے۔

آسام کے سلسلہ میں ملک کے ہندو لیڈروں کا شروع سے یہی نظریہ رہا ہے کہ وہ ایک ہندو صوبہ ہے اور اسے ہندو ہی صوبہ رہنا ہے گاندھی جی بھی اس کے ہمنوا تھے جس کا دبے الفاظ میں ذکر مولانا آزاد نے اپنی کتاب ہندستان نے آزادی جیت لی میں کیا ہے۔ کیبنٹ مشن پلان کے تحت ہونے والے سمجھوتہ میں گاندھی جی آسامی لیڈروں کے ہمنوا تھے۔ اور اس سے آسامی لیڈروں کے حوصلے بلند ہوگئے تھے۔

اسی سلسلہ کا ایک مضمون آزاد ہند کلکتہ کے ۲۲/ اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء کو "آسام کا قتل عام حقیقت کے آئینہ میں" عنوان کے تحت شایع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ آسام میں خونریزی سے پہلے بالا صاحب دیورس (آر-ایس-ایس کے سربراہ) کی تقریروں پر مشتمل ایک پمفلٹ ہزاروں کی تعداد میں چھاپ کر لوگوں میں تقسیم کیا گیا۔ اس کے بعد ہی آسام میں قتل عام شروع ہوا۔ بین الاقوامی کانفرنسوں میں بیشتر غیرملکی مندوبین نے ہمارے سیکولر کردار کی پرزور مذمت کی تھی۔

مصر، فرانس، کویت، انڈونیشیا اور بنگلہ دیش کے عوام بھی ہندی مسلمانوں کی نسل کشی کے خلاف اپنے شدید غم و غصہ کا اظہار کرتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ عالمی برادری کے اس شدید رد عمل کو دیکھتے ہوئے وزیراعظم اندرا گاندھی نے ۲۶، اسلامی ملکوں کے سربراہوں کو مطمئن کرنے کے لیے ایک خط لکھا تھا جس کے کچھ حصے

ہندستانی سفارت خانوں نے شایع کئے ہیں۔ وزیراعظم نے مسلم حکمرانوں کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ آسام کا افسوس ناک واقعہ فرقہ وارانہ یا مذہبی نوعیت کا قطعئی نہیں بلکہ وہ آسام کی سیاسی اور معاشی صورت حال کا نتیجہ تھا۔ جس سے ہر فرقہ کے لوگ متاثر ہوئے

وزیراعظم کے مذکورہ خط کو پڑھ کر حیرت ہوئی کہ آسام میں نام نہاد "غیرملکی ہٹاؤ" تحریک کی آڑ میں صرف مسلمانوں کو ہی نشانہ بنایا گیا۔ مگر محترمہ کہتی ہیں کہ آسام کا خونی واقعہ فرقہ وارانہ یا مذہبی نوعیت کا نہیں تھا۔ بہرحال محترمہ کے بیان کی تردید ہندستان کی خفیہ خبررساں ایجنسیوں کی اس رپورٹ سے ہوجاتی ہے۔ جو گزشتہ دنوں مرکزی وزیرداخلہ کے حوالہ کی گئی ہے۔ سی۔ بی۔ آئی اور دیگر تحقیقاتی ذرایع کی اطلاعات سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ آسام میں خونریزی کے دوران "آل آسام اسٹوڈنٹس یونین" اور "گن سنگرام پریشد" کے والنیٹروں کا آر۔ایس۔ایس کے ساتھ نہایت پراسرار اور خفیہ رابطہ قائم تھا۔

انٹیلی جنس شعبوں نے اپنی رپورٹ میں "آسو" اور اے۔اے۔جی۔ایس۔پی کی تحریک کو مسلم کش فساد میں تبدیل ہوجانے کے تین اہم اسباب بیان کئے ہیں۔

(۱) آر۔ایس۔ایس سے منسلک دیگر تنظیموں کا طریقہ کار۔

(۲) ہندو سیٹھ ساہوکاروں کی مالی امداد۔

(۳) مختلف اوقات میں مختلف جگہوں پر راشٹریہ سیوک سنگھ کے لیڈروں کی اشتعال انگیز تقریریں۔

مصدقہ خبر کے مطابق آسام میں آر۔ایس۔ایس کی ایک سو چھیالیس شاکھاؤں (برانچز) نے تحریک سے قبل ہی اپنے منصوبوں پر کام کرنا شروع کردیا تھا۔ شاکھاؤں کے والنیٹروں اور دیگر چھ ہزار رضاکاروں نے کچھار اور کامروپ اضلاع میں ایسی قتل و غارت گری مچائی جس کی نظیر ہندستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ظلم و بربریت کی زندہ مثال نوگاؤں ہے جہاں بائیس سو خونیں واردات رونما ہونے کی اطلاع ملی ہے، اس کے بعد کامروپ کا نمبر آتا ہے جہاں بے قصور اور نہتے مسلمانوں پر قاتلانہ حملوں کے پانچ سو واقعات پیش آئے۔

آسام کی خفیہ پولیس نے مرکزی حکومت کو آر-ایس-ایس ورکروں کے نام سے متعارف آسو اور اے-اے-جی-ایس-پی کے سرگرم کارکنوں کی ایک فہرست بھی پیش کی ہے۔ جس میں دھرم پورا، بھرت دویشور گوسوامی، تلک مجمدار اور اتول شرما کے نام ہیں۔

"آسو اور گن سنگرام پریشد کی تحریک اور مسلم کش فسادات"

۱۰/ مئی سنہ ۱۹۷۹ء کو ضلع نوگاؤں میں بندوق بنانے کی ایک فیکٹری کا سراغ ملنے کے بعد انٹیلی جنس بیورو نے وزارت داخلہ کو جو رپورٹ دی ہے اس میں آسو۔ اے-اے-جی-وائی-سی-پی کے ساتھ آر-ایس-ایس کے خطرناک ساز باز کے کافی ثبوت فراہم کئے ہیں۔ رپورٹ سے انکشاف ہوا ہے کہ سنہ ۱۹۷۹ء کے آغاز سے فساد برپا ہونے تک آسام میں سرگرمیاں کافی عروج پر تھیں۔ بالا صاحب دیورس اور دیگر سنچالکوں نے اپنے زور بیان سے ریاست میں اشتعال انگیزی کا عجیب ماحول پیدا کردیا۔ مئی سنہ ۱۹۷۹ء سے دسمبر سنہ ۱۹۷۹ء تک کامروپ ضلع کے نل باڑی سب ڈویژن میں تقریباً آٹھ ہزار انتہا پسندوں کو نیم فوجی قواعد کی تربیت دی۔ اس کے علاوہ دارانگ، چموگاڑی، کامروپ، گوہاٹی، سلچر اور کچھار ضلع میں بھی ٹریننگ کیمپ کھولے گئے۔ جن میں رضاکاروں کو بھرتی کرکے نیم فوجی طرز پر تربیت دیکر مسلح کیا گیا۔

خفیہ پولیس رپورٹ کے مطابق آسام میں خونریزی سے پہلے ایک پمفلٹ جو بالاصاحب دیورس کی تقریروں پر مشتمل تھا تقسیم کیا گیا۔ جس سے فرقہ وارانہ فضا اور بھی زہرآلود ہوئی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ سنہ ۱۹۵۱ء کے بعد مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) سے آئے ہوئے ہندوؤں کو آباد کرنا ہوگا اور اسی دوران جتنے مسلمان بنگلہ دیش سے آئے ہیں انھیں فوراً آسام سے نکالا جائے۔

آسام کی خفیہ پولیس نے آر-ایس-ایس کے لیڈروں کی تقریروں کے جو نمونے وزارت داخلہ کو دیئے ہیں ان کے اہم نکات۔

○ ریاست میں مسلمانوں کی آبادی اگر اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو ایک دن آسام مسلم ریاست میں تبدیل ہوجائے گا۔ (سودرشن جی مقام گوہاٹی ستمبر سنہ ۱۹۸۲ء)۔

○ ہندوؤں میں اتحاد قائم ہونے کے بعد ہی آسام میں غیرملکیوں کا مسئلہ حل ہوگا۔ (بالاصاحب دیورس کی تقریر ۱۹/اکتوبر سنہ ۱۹۸۲ء سلچر)

○ اس علاقہ میں مسلمانوں کی آبادی مسلسل بڑھتی جارہی ہے اگر یہی عالم رہا تو آسام بہت جلد ایک مسلم اسٹیٹ بن جائے گا۔ (بالاصاحب دیورس ۲/اکتوبر سنہ ۱۹۸۲ء اتھگاؤں، گوہاٹی)

○ آسام اگر صرف ہندو ریاست رہے۔ جب ہی آسام کے مسئلہ کا حل ممکن ہے۔ (دیورس ۱۳/اکتوبر سنہ ۱۹۸۲ء جورہاٹ، شیب ساگر اور نوگاؤں)

پولیس رپورٹ کے مطابق فروری سنہ ۱۹۸۳ء کو چالکو علاقہ میں دیپ ناتھ ہیڈ ماسٹر کی رہائش گاہ پر آر۔ایس۔ایس کی ایک خفیہ میٹنگ ہوئی جس میں چاپڑ تھانہ سے ملحق علاقوں کے انتہاپسندوں نے کافی تعداد میں شرکت کی۔ اس میٹنگ میں مسلمانوں پر قاتلانہ حملوں کے منصوبے تیار کئے گئے۔ اور پھر ۵/فروری سنہ ۱۹۸۳ء کی صبح سے غروب آفتاب تک آسام کے بیشتر علاقوں کو فرقہ پرستی کی آگ میں جھونک دیا گیا اور دیکھتے دیکھتے ہٹلر اور چنگیز کے خونی کارنامے ماند پڑ گئے اور برہمپترا کا پانی مسلمانوں کے خون ناحق سے لال ہوگیا۔

محترمہ اندرا گاندھی اپنے تیر سے خود زخمی

آسام سے متعلق ساری شہادتیں محترمہ اندرا گاندھی کے اس بیان کا پردہ فاش کر دیتی ہیں کہ آسام کا خونی ڈرامہ مسلمانوں کے خلاف نہیں، بلکہ معاشی اور سیاسی ہے! اور اگر یہ بات بھی مان لی جائے تو کیا معاشی اور سیاسی یورش مذہبی اور فرقہ وارانہ نہیں ہو سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ جب آگ لگائی جائے تو غیر متعلق لوگ بھی اس میں جل جائیں لیکن اصل سوال تو یہ ہے کہ یہ آگ لگائی کس کے خلاف گئی؟

آسامی زبان میں ہدایت نامہ:- آسام میں مسلمانوں کو قتل کرنے کے لیے آسامی زبان میں ہدایت نامہ کے ذریعہ کہا گیا ہے مسلمانوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو ایک پچیس نکاتی پروگرام کا سائیکلو اسٹائل پرچہ ڈاک سے اور نجی طور پر علاقوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ اسکا پتہ مشہور صحیفہ نگار خاتون سیما مصطفےٰ نے لگایا ہے۔

ہدایات اس طرح ہیں:-

(۱) سیلاب کے دوران پشتوں پر پناہ گیر مسلمانوں کو چن چن کر وہیں قتل کر دو سعیدہ سے دھوبری تک مسلمان ملیں گے۔

(۲) سب سے پہلے مسلم گاؤں کا انتخاب کر کے نشانہ بناؤ اور مسلمانوں کو نیست و نابود کر دو۔

(۳) مسلم فرقہ کے سارے لیڈروں کو پہچانو اور ایک ایک کر کے قتل کر دو۔

(۴) سرکاری دفتروں میں مسلمانوں کے پیٹ چاک کر کے ہلاک کر دو۔

(۵) سارے مسلم طلباء کے ہوسٹلوں پر حملہ کرو مثلاً تیز پور، میں وارانگ مسلم طلباء ہوسٹل اور کاٹن کالج مسلم طلباء ہوسٹل۔

(٦) ٹھیکہ کا کام کرنے والے سارے یومیہ مسلم مزدوروں اور کارکنوں کا صفایا کرد اور ایسا طریق کار اپناو کہ وہ لاپتہ سمجھے جائیں اور سراسیمگی پھیل جائے۔

(۷) ویران علاقوں میں مسلم راہ گیروں اور بسوں کے مسلم مسافروں کا اغوا کر کے جان سے مار دو۔

(۸) مسلم خواتین کا اغوا کرو۔ (جان سے مارنے کی ہدایت نہیں انھیں لونڈیاں بنالو)

(۹) اس ہندو تحریک کے مخالف مسلم پولیس افسروں کو بھی چن چن کر مار دو۔

(۱۰) سراسیمگی پھیلانے کے لیے وقفہ وقفہ سے بم کے دھماکے کرو۔

(۱۱) مسلمانوں کو قتل کرنے کے لیے بنگالی ہندؤں میں گھس کر معلومات فراہم کرو۔

(۱۲) دولت مند اور بااثر مسلم زمینداروں کے یہاں ڈاکہ ڈالو اور ان کا صفایا کر دو۔

(۱۳) منظم قتل کے لیے مسلم علاقوں میں رضاکار فورس بھیجنے کے لیے ان کو پولیس وردی سلوا کر دو۔ بلے لگاؤ۔ گاڑیاں فراہم کرو۔

(۱۴) آسامی زبان کے اخباروں میں خطوط کی بھرمار کردو کہ مسلمان مار ڈالے جائیں گے۔

(۱۵) مسلمان مسافروں کی بسیں روک کر ان کو قتل کرو۔

اسی طرح دوسری بہت سی ہدایات دی گئی ہیں۔

صیاد اپنے جال میں:- ۲۵/اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء کے آزاد ہند کلکتہ نے آسام طلباء یونین کا ایک بیان نشر کیا ہے۔ جس میں آسام میں ہندو مسلم کی تمیز اور مذہب کی بنیاد پر مرکز کی طرف سے غیر ملکیوں کی شناخت پر تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔ یونین نے حزب اختلاف سے کہا ہے کہ مرکز مذہب کی بنیاد پر آسام کے مسئلہ کو حل کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ مذاکرات سے گریزاں ہے۔ مرکزی حکومت مذہب کی بنیاد پر غیر ہندستانیوں کو الگ کرنا چاہتی ہے یعنی اگر آسام میں کوئی مسلمان ہے تو وہ ہندستانی نہیں ہے اور

اگر کوئی شخص ہندو ہے چاہے وہ بنگلہ دیش سے کیوں نہ آیا ہو وہ ہندستانی ہے۔"
لیکن مولانا اسعد مدنی کہتے ہیں ..... "میری لیڈر و وزیراعظم اندرا گاندھی سے اچھا ہندستان میں کوئی لیڈر نہیں۔" (پندرہ روزہ چراغ حرم فروری سنہ ۱۹۸۳ء جلد ۱۷)

آسام کی وبا بہار تک

صوبہ بہار میں کانگریس (ا) کی منظم سرکار کام کر رہی ہے۔ ۲۹ / جولائی سنہ ۱۹۸۳ء کو ریاست بہار کے ضلع پورنیہ میں کشن گنج سب ڈویژن کے گاؤں لکشمی پور میں مقامی بھاٹیا مسلم کسانوں اور سنتھالوں (ہندوؤں) میں تصادم ہوا۔ جس میں چار ہندو اور دو مسلمان ہلاک ہوئے۔ جب پولیس پہونچی تو مسلمانوں پر ظلم وستم شروع ہو گیا۔ گاؤں ویران ہو گیا۔ مسلمانوں کی فصلیں کاٹ لی گئیں۔ مرد اپنی جان بچا کر بھاگ گئے تو پولیس نے عورتوں کی اجتماعی عصمت دری کی۔

کشن گنج سے شائع ہونے والے ہفت روزہ اخبار "ہمارا پرچم" کے ایڈیٹر شمیم ربانی نے ۴/ اگست سنہ ۱۹۸۳ء کے "ہمارا پرچم" میں درج ذیل رپورٹ شائع کی ہے.....

۲۹ / جولائی کو جمعہ کے دن مسلمان جمعہ کی نماز ادا کرنے گئے ہوئے تھے۔ اسی بیچ سیکڑوں سنتھالی دھان کے کھیت کاٹنے مسلح ہو کر آگئے۔ مسلمانوں نے اپنے کھیت کاٹنے کے لیے مدافعت کی۔ لیکن سنتھالیوں نے تشدد برپا کر کے مسلمانوں پر تیر چلانا شروع کر دیئے۔ شمل اور عبدالحق کے مکانوں میں آگ لگادی۔

اطلاع ملتے ہی قریبی پولیس تھانوں کے تھانیدار بھی پہونچ گئے۔ اور سنتھالیوں سے ملے۔ رات ۱۱ بجے تک ڈی۔ایس۔پی کشن گنج بھی وہاں پہونچ گئے۔ اعلیٰ حکام نے امن و

امان کے قیام کے لیے کیمپ لگا کر مجسٹریٹ اور دسٹرکٹ آرم فورس کے جوان تعینات کئے۔ جنھوں نے مسلمانوں کی بستی میں تشدد اور گرفتاریاں شروع کر دیں۔ لوٹ مار بھی شروع کر دی۔ عماد الدین (من ملی) اور فضل الرحمان لکشمی پور کو مار کر پانی میں ڈال دیا۔ اس کے بعد مسلمان گھروں کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ۲/ اگست کو اس حلقہ کے ممبر اسمبلی جناب نجم الدین وہاں پہونچے۔ اس کے بعد اور بھی سیاسی کارکن وہاں پہونچ گئے۔ پولیس فورس کے ظلم و جبر کی کہانی مسلمانوں نے سنائی۔ پولیس نے گاؤں کی جوان لڑکیوں کی اجتماعی آبروریزی کی جن میں... صابرہ، تسلیمہ، دل روشن، راشدہ، صیفن، اختر خاتون، کتابن وغیرہ کی پولیس کے جوانوں نے اجتماعی عصمت دری کی۔ صابرہ عرف صابی کے ساتھ کئی دنوں تک جبراً زنا کیا جاتا رہا۔ کتابن کی شرمگاہ میں بندوق کی نال ڈالکر پولیس نے اپنے ظلم و جبر کا ثبوت دیا۔ محمد نجم الدین، محمد مشتاق اور اجیت سرکار (تمام ممبران اسمبلی) کے سامنے ان مظلومین نے بیانات دیئے۔ پولیس جسے امن و امان کے قیام اور مظلومین کے تحفظ کے لیے تعینات کیا گیا تھا۔ وہ محافظ ہی لوٹ مار قتل اور آبروریزی کے مرتکب ہوئے۔ نجم الدین ایم-ایل-اے نے وزیراعظم، وزیرداخلہ اور دوسرے ذمہ داروں کو ٹیلی گرام دیکر حالات سے آگاہ کیا۔

اس سے پہلے ۱۴/ دسمبر سنہ ۱۹۷۴ء میں بھی سنتھالی ہندووں نے موضع سنگھی ماری میں حملہ کر کے چودہ بھاٹیا مسلمانوں کو قتل کر دیا تھا اور ان کے گھروں میں آگ لگا دی تھی...

اور اب نئی مصیبت:- اسی کشن گنج ضلع پورنیہ کے چھ ہزار مسلم خاندانوں کو حکومت بہار کی جانب سے نوٹس دیا گیا ہے کہ وہ اپنی ہندستانی شہریت کا ثبوت فراہم کریں ورنہ انھیں بنگلہ دیش کی سرحد میں ڈھکیل دیا جائے گا۔

آزاد ہند کلکتہ نے اپنی ۱۴/ اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں... "برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر" کے زیر عنوان لکھا ہے کہ... "آر-ایس-ایس کے لیڈر

بالاصاحب دیورس نے مغربی بنگال اور بہار کے بارے میں دو سال پہلے کہنا شروع کر دیا تھا کہ مغربی بنگال اور بہار کے اضلاع میں بنگلہ دیشی مسلمان آکر بس رہے ہیں ان ریاستوں کی حکومتیں اس کی روک تھام کریں اور غیر ملکیوں کو نکالیں، اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو پھر مجبور ہو کر آر-ایس-ایس کو یہ کام اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا۔

مگر یہ معاملہ صرف کشن گنج تک محدود نہیں ہے دوسرے علاقوں تک اسکا دائرہ پھیلے گا۔ مغربی بنگال میں مالدہ، مرشد آباد، ویسٹ دیناج پور اور چوبیس پرگنہ کلکتہ میں بھی یہ قصہ شروع ہو چکا ہے۔ پچھلے دنوں کلکتہ سے دہلی تک ملک بھر کے اخبارات بنگلہ دیشی دراندازوں کی خبروں سے بھر گئے۔"

اس سازش میں مرکزی سرکار برابر کی شریک ہے۔ کشن گنج کے مسلمانوں پر جو مصیبت آگئی ہے اسکا علاج کیسے ہوگا کچھ پتہ نہیں۔ اس طرح بنگلہ دیش کی سرحد پر تار لگا کر لاکھوں مسلمانوں کو بے گھر کر دیا جائے گا اور مرکزی سرکار کی بے قصوری ثابت کرنے کے لیے محترمہ اندرا گاندھی اپنے زر خرید مسلمانوں کے ذریعہ مسلم حکمرانوں کو مطمئن کرنے کیلئے روانہ کر دیں گی۔ اور آسام، بہار اور بنگال کے مسلمان روندے جاتے رہیں گے۔

مغربی بنگال میں خود مرکزی سرکار کے حکم سے سابقہ ووٹر لسٹ کالعدم قرار دیکر نئی ووٹر لسٹ تیار کئے جانے پر کام ہو رہا ہے اور اس نئی ووٹر لسٹ میں جان بوجھ کر مسلمانوں کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ جس پر ستمبر سنہ ۱۹۸۳ء کے پہلے ہفتہ میں جمعیتہ العلماء کے ایک وفد نے تشویش ظاہر کی ہے۔ اس وفد کے سامنے بے شمار ایسے واقعات آئے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ پورے پورے مسلم گاؤں ووٹر لسٹ سے خارج کر دیئے گئے ہیں۔ یہ ایک سازش ہے جس کے تحت پورے مشرقی منطقہ کو مسلمانوں سے پاک کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے جس میں ملک کی فرقہ پرست طاقتیں مرکزی اور صوبائی سرکاروں کی سرپرستی میں کام کر رہی ہیں۔

تجھ پر نثار جان و دل، مڑ کے ذرا یہ دیکھ لے
دیکھ رہی ہے کس طرح، ہم کو نگاہ کافری

شہریت........اور فرقہ واریت

اکھل بھارتی ودیارتھی پریشد (کل ہند طلباء کی کونسل جو فرقہ وارانہ تنظیم ہے) کی طرف سے بہار کے پورنیہ اور کٹیہار اضلاع میں غیر ملکیوں کی دراندازی کا ہوا کھڑا کیا گیا۔ جس کے پیچھے بہار کی موجودہ چندر شیکھر کانگریس (ا) کی سرکار اور خود الکشن کمیشن موجود ہے۔ کانگریس کا شروع ہی سے المیہ یہ ہے کہ سیکولرازم اور سوشلزم کے نعروں کے ساتھ ہی عملاً اس نے فرقہ وارانہ روّیوں کو ہی اپنایا ہے۔ مسلمانوں کو برباد کرنے، نقصان پہونچانے اور انھیں ہراساں کرنے میں وہ فرقہ پرست تنظیموں کے پس پشت ہمیشہ کھڑی رہتی ہے اور ان تنظیموں کو سرکاری مشنری کے ذریعہ امداد پہونچایا کرتی ہے۔ ودیارتھی پریشد کے جنرل سکریٹری سوشیل کمار نے بہار میں تقریباً تین لاکھ بنگلہ دیشی دراندازوں کا الزام لگایا ہے۔ لیکن سردست پورنیہ ضلع کے اُرریا حلقہ میں چار ہزار اور ٹھاکر گنج حلقہ میں چھ ہزار ایک سو بھاٹیا مسلمانوں کو نونس دیئے گئے ہیں کہ وہ اپنی ہندستانی شہریت ثابت کریں۔ اس کے علاوہ دس ہزار افراد کی فہرست اور تیار ہو رہی ہے۔ جن کو نونس دیئے جائیں گے۔ جن میں ایسے لوگوں کے نام بھی ہیں جو الکشن کمیشن کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ اُرریا حلقہ کے ایک ممبر اسمبلی جناب تسلیم الدین کی بیوی اور بیٹوں کو بھی اپنی شہریت کے ثبوت کے لیے نونس ملا ہے۔

درانداز کون؟:— آخر بنگلہ دیش سے مسلمان بھاگ کر ہندستان کیوں آئیں گے؟ ہاں وہاں سے ہندو اسلامی حکومت کے اعلان کے بعد بھاگ سکتے ہیں اور وہی بڑی تعداد میں ان علاقوں میں داخل ہوئے ہیں۔ جس کی سزا ہندستان کی سیکولر سرکار یہاں کے مسلمانوں اور بنگلہ دیش کو دینا چاہتی ہے تاکہ بنگلہ دیش کو اسلامی معاشرہ کی تخلیق سے

روکنے کیلئے سیاسی دباؤ ڈالا جائے اسی جھنجھلاہٹ میں بنگلہ دیش کی سرحد پر خار دار تار لگانے کا اعلان کیا گیا ہے۔ ملیشیا، بنگلہ دیش، پاکستان اور ایران سے لگاتار اسلامی نظام کے نعروں نے ہندستانی سرکار اور سیاسی گروہوں کو بوکھلا دیا ہے۔ اسی بوکھلاہٹ میں سرکاری اور فرقہ پرست تنظیموں نے ہندستانی مسلمانوں پر اپنا دباؤ بڑھا دیا ہے تاکہ یہاں مسلمانوں سے ان اسلامی تحریکوں کی مخالفت میں بیانات دلوائے جائیں۔۔۔ مگر اس میں بھی کامیابی نہیں ہو سکی ہے سوائے اس کے کہ ملک کے اندر سیاسی پارٹیوں کے مسلمان ہندستان کی مسلم سیاسی تنظیموں سے مسلمانوں کو دور رہنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں بھیانک انجام سے ڈراتے رہتے ہیں۔

پورنیہ، کٹیہار، بھاگلپور، سنتھال اور سہرسہ کے علاقوں میں تقریباً پچیس لاکھ سے زیادہ مسلمان (بھاٹیا) آباد ہیں۔ یہ بھاٹیا مسلمان مغربی بنگال کے مرشد آباد، مالدہ، اور ندیا اضلاع سے آکر تیس سال پہلے آباد ہو گئے تھے۔ اس کی تصدیق پورنیہ، کٹیہار اور کشن گنج حلقوں سے سی۔ پی۔ آئی (ایم) جنتا پارٹی اور خود کانگریس (ا) کے بہت سے ایم۔ ایل۔ اے کر چکے ہیں کہ یہ لوگ ہندستان کے مستند شہری ہیں۔ اور ان میں سے زیادہ تر کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ بنگلہ دیش کیا اپنے گاؤں تک سے باہر نہیں گئے ہیں۔

سارے نوٹس صرف مسلمانوں کو دیئے گئے ہیں جس کے فوری اسباب سیاسی ہیں۔ ان علاقوں کا دورہ کرنے والوں کا کہنا ہے کہ کسی ایک ہندو کو بھی نوٹس نہیں ملا ہے۔ صرف مسلمانوں کو نوٹس دیئے جانے کے پیچھے حکومت کی بدنیتی اور فرقہ وارانہ ذہنیت پوری طرح کھل کر سامنے آچکی ہے۔ یہ نوٹس سنہ ۱۹۸۰ کی انتخابی فہرستوں میں درج ناموں کے خلاف بھی جاری کی گئی ہیں۔

بہار کے کانگریس (ا) وزیر اعلیٰ چندر شیکھر سنگھ، ودیارتھی پریشد اور الکشن کمیشن اس سلسلہ میں کوئی مناسب دلیل بھی نہیں رکھتے۔

بہار کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر جگن ناتھ مصرا نے بھی اس طرز عمل پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے۔۔۔ "ان کے دور وزارت میں پندرہ سو بنگلہ دیشی باشندوں کی

شناخت کی گئی تھی۔ جن کو اسی وقت ان کے وطن بھیج دیا گیا تھا۔ یہ بات بڑی حیرت کی ہے کہ گذشتہ ڈھائی ماہ کے اندر لاکھوں کی تعداد میں بنگلہ دیشی باشندے کیسے ہندستان میں داخل ہوگئے۔ جن لوگوں کو نوٹس جاری کئے گئے ہیں ان میں سے ہزاروں کو وہ (سابق وزیراعلیٰ) ذاتی طور پر جانتے ہیں کہ وہ ہندستان کے مستند شہری ہیں۔"

آگے انھوں نے موجودہ حکومت سے کہا..... "اس طرح کے امتیازی سلوک کے سنگین نتائج نکلیں گے۔"

اصل بات یہ ہے کہ کانگریس کو یہ احساس ہو گیا ہے کہ مسلمان بڑی تعداد میں اسے ووٹ نہ دیں گے۔ اسی لیے ودیارتھی پریشد کی تیار کردہ اسکیم میں اسکا بھی فائدہ ہے۔

بہار اسمبلی کے سابق وزیراعلیٰ اور اس وقت حزب اختلاف کے لیڈر کرپوری ٹھاکر نے بھی دراندازی کی کہانی کو بے بنیاد قرار دیا ہے۔

یہ جو رہ رہ کے مجھے خون کی بو آتی ہے
کہیں تم میں کوئی قاتل تو نہیں ہے یارو

اندرا گاندھی اور فرقہ پرست طاقتیں

سنہ ۱۹۸۰ میں واپسی کے بعد وزیراعظم کا رخ فرقہ پرستی کی طرف بڑھتا ہی چلا گیا۔ جس کی سب سے بڑی مثال وزیر خارجہ کی حیثیت سے پی۔ وی۔ نرسمہاراؤ کی تقرری ہے۔ موصوف جب آندھرا پردیش کے وزیراعلیٰ تھے تو انھوں نے ہندوپاک جنگ کے دوران مسلم لیڈروں کو قید کیا اور ایک تقریر میں کہا:

"The ears of the Indian Muslims should be filled with lead, so that

they did not tune in to Radio Pakistan."

"The Illustrated Weekly March 30, April 5, 1980, Page 9,

By Majeed Husain (Indian Muslims)

"ہندستانی مسلمانوں کے کانوں میں سیسہ انڈیل دینا چاہئے، تاکہ وہ ریڈیو پاکستان نہ سن سکیں۔"

ایک ایسے آدمی کا وزارت خارجہ کے لیے انتخاب خود ہی بتا رہا ہے کہ محترمہ کدھر جا رہی ہیں؟

ہندو ماہنامہ "روی وار" میں کیول رام نے ایک مضمون میں وزیر اعظم اندرا گاندھی کے فرقہ واریت کی طرف میلان کا ذکر کرتے ہوئے جو کچھ کہا تھا۔ اسکا کوئی اطمینان بخش جواب محترمہ کی طرف سے نہیں آیا۔ اس مضمون کے بعد مسز گاندھی کی کانگریس اور آر۔ ایس۔ایس کے خفیہ روابط کا ذکر سیاسی دنیا میں بڑی تیزی سے ہونے لگا۔ تو محترمہ نے حزب اختلاف کی دشمنی کا ذکر کیا اور اس بات کو کہ وہ فرقہ واریت کی طرف جا رہی ہیں بے بنیاد بتایا۔

لیکن انھوں نے آسام، پنجاب، کشمیر اور مراد آباد وغیرہ میں جو رویہ اپنایا ہے وہ اس بات کی جیتی جاگتی مثال ہے کہ ان کے عزائم کیا ہیں؟ان ریاستوں میں انھوں نے ہندووں کی ہر جگہ حمایت کی، جس کے نتیجہ میں آسام میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ وہ آسام، پنجاب اور کشمیر میں ہندستانیوں کی نہیں ہندووں کی محافظ بن کر ابھری ہیں۔ حالانکہ آسام میں جو حالات تھے وہاں انھیں مسلمانوں کی حمایت نہ سہی ان کے ساتھ انصاف سے پیش آنا تھا مگر انھوں نے فرقہ پرستوں کے آگے ہتھیار رکھ دیئے۔ اسلئے کہ آسام کے مسلمانوں کو پنجاب کے ہندوؤں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ زیادتیوں کے سامنے کے ساتھ ہی ساتھ جان و مال کا بھی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ اور آج بھی قتل و غارت گری اور عدم تحفظ کے سایہ میں زندگی گذار رہے جو آسام کے بعد بہار تک پھیلتا جا رہا ہے۔

اسی فرقہ وارانہ رجحان کی بدولت جموں و کشمیر کے پرانے کانگریسی لیڈر سید میر قاسم

نے کانگریس (ا) کو خیرباد کہدیا اور الزام لگایا کہ محترمہ کانگریس کی سیکولر پالیسیوں سے ہٹ گئی ہیں۔

"روی وار" کے صحافی کیول رام کی تحریر کو تقویت ملتی ہے شری راجیشور راؤ کے بیان سے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ مسز گاندھی اکثریتی فرقہ کی محافظ کی حیثیت سے ابھرنے کے لیے ہندو فرقہ پرستوں کے تئیں نرم رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں ...... مسز گاندھی خود کو وشوہندو پریشد کے کردار میں پیش کررہی ہیں۔ کانگریس (ا) کی پالیسی اقلیتوں سے صف آرائی کی ہے اور یہ اقلیتیں ہیں، مسلمان، عیسائی اور سکھ تاکہ ہندو فرقہ پرستوں کو بتایا جاسکے کہ ہندوؤں کی محافظ مسز گاندھی ہیں۔

مسٹر راجیشور راؤ نے ان کی فرقہ پرستی کی ایک مثال پیش کی..... انھوں نے کہا کہ ہردوار میں وشوہندو پریشد نے ایک مندر تعمیر کیا جسکا افتتاح مسز گاندھی نے کیا۔ اس تقریب میں آر۔ ایس۔ ایس کے لیڈر بالاصاحب دیورس اور جنرل سکریٹری راجندر سنگھ بھی موجود تھے۔ کانگریس (ا) کے بعض لیڈر وشوہندو پریشد سے وابستہ ہیں جبکہ معلوم ہے کہ یہ تنظیم آر۔ایس۔ایس کا محاذ ہے اور خطرناک طور پر اسکا فروغ ہو رہا ہے۔"

ہمیں اسکی شکایت نہیں کہ وہ کدھر جارہی ہیں۔ ہندو ہونے کے ناطے ان کا حق ہے کہ ہندوؤں کی مذہبی، تہذیبی اور تمدنی تقریبات میں شریک ہوں، لیکن وزیراعظم کی حیثیت سے ان کی ذمہ داری ہے کہ دوسروں کو زندہ رہنے کا حق بھی دیں۔

انھیں سمجھنا چاہئے کہ جنوب میں ان کی سرکاریں ختم ہوچکی ہیں۔ جس کی خاص وجہ اقلیتوں سے ان کی دوری ہے۔ جنوبی ہندستان میں ان کی فرقہ وارانہ پالیسیوں اور برہمن ازم کی طرف ان کی واپسی کے سبب وہاں کے مسلمانوں، عیسائیوں اور ہریجنوں نے کانگریس کا ساتھ چھوڑ کر علاقائی پارٹیوں کے دامن میں پناہ لے لی۔

کشمیر میں محترمہ نے جس طرح الکشن کی مہم چلائی وہ خالص فرقہ وارانہ بنیادوں پر تھی اور اس میدان میں انھوں نے سبکو پیچھے چھوڑ دیا اور بی۔ جے۔ پی کے لیڈر اٹل بہاری باجپئی بھی وہاں سے بھاگ نکلے۔ اور اس طرح گویا بی۔ جے۔ پی، آر۔ایس۔ایس اور اندرا

گاندھی کے درمیان ایک خاموش سمجھوتہ ہو گیا۔ اور یہی کھیل وہ پنجاب میں کھیل رہی ہیں۔ سکھوں کا مقابلہ وہ پنجاب کے ہندوؤں اور ہندو فرقہ پرستوں کو ساتھ لیکر کرنا چاہتی ہیں اور کیا انھیں یہ خبر نہیں کہ پنجاب کے پورے مسئلہ کے پیچھے درمیانہ درجہ کے ہندو فرقہ پرست تاجروں کا ہاتھ ہے۔ یہ ہاتھ نہ امریکہ کا ہے نہ پاکستان کا۔

جس طرح آزادی سے پہلے ملک کا بڑا ہندو سرمایہ دار مسلمانوں کے خلاف ایسے حالات پیدا کر رہا تھا کہ کسی طرح ملک تقسیم ہو جائے تاکہ ہندو سرمایہ دار اپنی مرضی سے ملک کو چلا سکیں بالکل یہی حالات پنجاب کے سلسلہ میں درمیانہ درجہ کے ہندو سرمایہ دار نے پیدا کر دیئے ہیں۔ جس پر کنٹرول ہے بی۔ جے۔ پی اور آر۔ ایس۔ ایس کا۔ ٹرانسپورٹ پر سکھوں کا قبضہ ہے۔ کپڑے کا بازار اور تجارت ان کے قبضہ میں ہے۔ درمیانہ درجہ کی صنعت پر وہ قابض ہیں، بڑے بڑے زراعتی فارموں پر سکھوں کا قبضہ ہے اور اب وہ غلہ کی منڈی بھی اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہتے ہیں، اسکا اثر ہندو کاروباری طبقہ پر پڑا ہے اور ہندو کاروباری طبقہ اپنی سازشوں سے ایسے حالات بنا رہا ہے کہ پنجاب کو بقیہ ہندستان سے الگ ہو جانے پر مجبور کر دیا جائے تاکہ سکھوں سے بازار خالی کروا کر ان پر ہندو اجارہ داروں کو قبضہ دلایا جاسکے ...... اس سازش میں شعوری یا غیر شعوری طور پر محترمہ خود بھی شریک ہو گئی ہیں، اسلئے کہ جو تحفظ محترمہ اندرا گاندھی اور اٹل بہاری باجپئی پنجاب اور کشمیر میں ہندوؤں کے لیے چاہتے ہیں، پورے ملک میں وہی تحفظ مسلمانوں اور عیسائیوں کو کیوں دینا نہیں چاہتے؟

مسلمان اور دوسری اقلیتیں مسز گاندھی کے موجودہ طرز عمل سے مطمئن نہیں ہیں دوسری طرف روسی مشوروں کے باوجود کہ ہندستان کی کمیونسٹ پارٹی مسز گاندھی کی مدد کرے، کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری راجیشور راؤ نے وزیر اعظم اندرا گاندھی کی خارجہ پالیسیوں کی حمایت کے ساتھ ہی اندرونی پالیسیوں پر شدید نکتہ چینی کی ہے۔ جس سے صف آرائی اور گالی گلوج کی نوبت آ گئی ہے۔ راجیشور راؤ کے دلائل میں وزن ہے اور محترمہ کی فرقہ وارانہ ذہنیت یا طریق عمل کے لیے ایک سرٹیفکٹ بھی ہے۔

وزیراعظم اندرا گاندھی کی فرقہ وارانہ ذہنیت کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ ستمبر سنہ ۱۹۸۳ء میں غیر ملکی دورہ پر قبرص کی راجدھانی "نکوشیا" میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ـــ "ہندستان کی ایک ہزار سالہ تاریخ کچھ ایسی ہے جس پر فخر نہیں کیا جاسکتا۔"

یاد رہے ایک ہزار سالہ تاریخ مسلم عہد حکمرانی ہے۔ جس میں ہندستان کو بنایا اور سنوارا گیا۔ جدید ہندستان اور اسکی منصوبہ بند ترقی کا شرف مسلم عہد حکمرانی کو ہی حاصل ہے۔ اس وقت ہندستان کی زمین پر جتنے اعلے نقش و نگار، سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہیں سب مسلمانوں کی ہی دین ہیں درہ خیبر سے بنگال تک سڑکوں کا نظام، زمین کی پیمائش، زراعت اور باغبانی کا فن، ریونیو کا ڈھانچہ، ڈاک کا انتظام سب کچھ مسلمانوں نے ہی دیا۔ عدل و انصاف اور عدالتوں کی انتظامیہ پر بالادستی یہ ایک ہزار سالہ تاریخ کے ہی درخشاں نشانات ہیں ـــ ان سب سے بڑھ کر خود محترمہ اندرا گاندھی کا وزیر اعظم بنایا جانا بھی ہندستان میں اسلام ہی کا مرہون منت ہے۔ اگر ہندستان میں اسلام کی تعلیمات کا گہرا اثر نہ پڑا ہوتا تو ہندو مذہب کے اصول کے مطابق یا تو انھیں اپنے شوہر کی چتا کے ساتھ ستی ہونا پڑتا ورنہ ہندوؤں کے مقدس شہر کاشی میں بیواؤں کی صف میں بیٹھ کر ڈھاک کے پتوں پر دال بھات کھا رہی ہوتیں۔ اسلئے کہ ہندو رسم و رواج کے مطابق کسی مبارک موقع پر کسی بیوہ کا سایہ پڑنا بھی بدشگون سمجھا جاتا ہے۔ یہ اسلام ہی کی دین ہے کہ آپ دنیا میں دندناتی پھرتی رہیں اور اپنے محسن عہد کو گالیاں دیتی ہیں۔ اور ہندستان کی وزیر اعظم ہیں۔

ایک ہزار سالہ عہد حکمرانی کو قبرص میں گالی دینے کا ایک مقصد اور تھا کہ اس طرح یونان و قبرص کے حکمرانوں کو خوش کیا جائے اور ہندستان کے ہندو فرقہ پرستوں کو بھی اسلئے کہ قبرص و یونان اور ہندستان کا یہ درد مشترک ہے۔

لیکن اگر اندرا گاندھی فرقہ پرستی کے ذہن کی مالک نہیں اور اپنے اس بیان میں وہ سچی ہیں تو عملی نمونہ اسکا پیش کریں۔ مسلمانوں کے بنیادی مسائل میں دو کا فوری حل ہی محترمہ اندرا گاندھی کی نیک نیتی کا ثبوت ہوگا۔

(۱) فرقہ وارانہ اور پولیس ایکشن کی راہ سے عزت، آبرو اور جان و مال کا تحفظ۔

(۲) آبادی کے تناسب سے ملازمتوں میں جگہیں۔ تاکہ معاشی ناانصافی اور امتیازی سلوک کا خاتمہ ہوسکے۔

لیکن ایک ہی وقت میں متضاد اعلانات سے کچھ ہونے والا نہیں۔ ۱۶/ ۱ اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ کو دہلی میں یہ کہنا کہ فرقہ پرستی یا عصبیت پھیلانے والی تنظیموں پر پابندی نہیں لگے گی اور دوسری سانس میں یہ کہنا کہ اقلیتوں کی حفاظت کی جائے گی۔ کیسے ہوگا؟

سنجے گاندھی کے بعد اب راجیو گاندھی کو مستقبل کا وزیر اعظم بنانے کی تیاری شروع ہوچکی ہے۔ راجیو گاندھی نے اپنے گرد یو۔ پی کے لیے تقریباً دس نوجوان کوارڈینیٹر مقرر کئے ہیں جو پورے صوبہ کے کانگریسیوں اور وزیروں کے کاموں کو نوٹ کر کے راجیو تک پہونچاتے ہیں۔ ان نوجوانوں کا معیار وفاداری "راجیو زندہ آباد، دیش کا نیتا راجیو جیسا ہو" کے نعروں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ نہ ان کے ساتھ ان کی راتیں گذریں۔ نہ سفر اور مصائب میں ساتھ ہوا۔ ان کا طرز فکر کیا ہے؟ ملک میں پھیلی فرقہ وارانہ تنظیموں کا ان پر کتنا اثر ہے اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ اندرا گاندھی جنھوں نے مولانا آزاد اور رفیع احمد قدوائی کی آنکھیں دیکھی ہیں اور وہ اس طرح بدل سکتی ہیں تو راجیو جو اپنی ماں کی آنکھیں دیکھ رہے ہیں مستقبل میں ہندستانی مسلمان کے ساتھ کیا کریں گے؟

سوچتا ہوں تو ہر اک نقش میں دنیا آباد
دیکھتا ہوں تو دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی

ہر پر تشدد اور غیر یقینی مسئلہ کے بارے میں محترمہ ایک ہی جملہ دہراتی رہی ہیں کہ دہشت پسندی یا بدامنی یا اشیاء کی گرانی کا رجحان پوری دنیا میں بڑھتا جا رہا ہے اور کئی دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ہندستان کی صورت حال کہیں بہتر ہے ـــــ یہ اپنے منھ میاں مٹھو بننے والی بات ہے۔

ہمارے پڑوس میں نیپال ہے۔ کہاں روز وہاں مسلمانوں کا قتل ہو رہا ہے جبکہ وہاں مسلمانوں کی اچھی بھلی آبادی ہے۔ اور دنیا میں واحد ہندو اسٹیٹ ہے۔

ہمارے پڑوس میں بنگلہ دیش ہے بڑی اور نمایاں ہندو آبادی کا ملک ایسے حالات

میں جب بہار، بنگال اور آسام سے مسلمانوں کو مار کر بنگلہ دیش میں ڈھکیلا جا رہا ہے کہاں بنگلہ دیش میں ہندوؤں کے خلاف پر تشدد واقعات ہو رہے ہیں۔؟ اور کہاں یہ نعرے لگ رہے ہیں کہ مسلمانوں ایک ہو جاؤ، ہندوؤں کو نکال باہر کرو!

پاکستان میں کون ہندوؤں کے گھروں کو نذر آتش کر رہا ہے؟ اور انھیں ہندستانی سرحدوں میں کیا ڈھکیل رہا ہے؟۔ یہ صرف ہندستان ہے جہاں کی واضح اکثریت کے لیڈر اقلیت سے خوف زدہ دکھائی دے رہے ہیں۔ اور ان باتوں کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے محترمہ ساری دنیا میں ہندستان جیسے حالات پائے جانے کی بات کرتی رہتی ہیں۔۔۔۔۔ اسرائیل کے اندر بھی مسلمان عربوں کے خلاف نفرت کا وہ ماحول شاید موجود نہ ہوگا۔۔ جو ماحول پچھلے تین برسوں (۱۹۸۰) سے مسز گاندھی کی قیادت میں ملک کے اندر مسلمانوں کے خلاف پیدا کر دیا گیا ہے، اس کے نتیجہ میں ملک کی سیاست تیزی سے فرقہ پرستی کی طرف بڑھ رہی ہے، اسلئے کہ سرکار در پردہ اس میں شریک ہو چکی ہے۔ گذشتہ تین برسوں میں ہندستان کے اندر مسلمانوں کے خلاف پولیس اور بلوائیوں کی یورش، انتہا پسند مذہبی تنظیموں کی جنون انگیزی، فرقہ وارانہ سرگرمیاں، مسلمانوں میں عدم تحفظ کا احساس، فرقہ پرست عناصر کی پشت پر سرکار کی طاقت، بھارت میں رہنا ہے تو گئو ماتا کہنا ہے، وندے ماترم بولو، ورنہ بھارت چھوڑو جیسے نعرے، اور مسلمانوں کا بے رحمانہ قتل عام، پاکستان نوازی کا گمراہ کن پروپیگنڈا، اور ممالک اسلامیہ کی ابھرتی ہوئی طاقت کا خوف دلا کر ہندوؤں کے سینہ میں مسلمانوں اور عالم اسلام کیلئے نفرت کے جذبات ابھارنے کے طریقے، پکار پکار کر بتا رہے ہیں کہ ہندستان کی موجودہ سیاست کدھر جا رہی ہے؟ اور سیاست کا یہ رُخ سیکولرازم اور ناوابستگی سے ہندو ٹائپ آف سیکولرازم اور اسلام دشمنی کی طرف جاتا دکھائی دے رہا ہے۔

کھیل کا میدان اور ہندستان

عالمی کپ میں ہندستان کی جیت کو خوشی میں جون سنہ ۱۹۸۳ء کے آخری ہفتہ میں بمبئی کے علاقہ مالیگاؤں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ جس کے بعد ۴۸ گھنٹہ کا کرفیو نافذ کرنا پڑا۔ اتر پردیش کے شہر خورجہ ضلع بلند شہر میں بھی اسی خوشی میں فساد برپا کیا گیا۔

۲۵/ جون کو ماہ رمضان کے مقدس مہینہ میں دونوں جگہ مسلمانوں پر یلغار ہوئی۔

۶/ جولائی سنہ ۱۹۸۳ء کے مالیگاؤں کے فساد کے سلسلہ کی ایک رپورٹ پیش کی جاتی ہے۔

منماڑ ریلوے اسٹیشن (جنکشن) سے ۳۵ کلومیٹر احمد نگر شاہراہ پر دریائے موسم کے کنارے مالیگاؤں قصبہ ضلع ناسک میں ہے۔ یہاں کا تیار شدہ کپڑا ملک و بیرون ملک میں جاتا ہے۔ اپنی صنعت اور دستکاری کی وجہ سے ہر وقت روشن رہنے والا یہ علاقہ جسکی آبادی تقریباً ۳۵ لاکھ ہے جس میں ستر فی صد مسلمان بنکر (کپڑا بنانے والے) اور صنعت کار ہیں، جو پاور لوم پر ساریاں اور ملوں کے لیے کپڑا تیار کرتے ہیں۔ سوت کا منافع بخش دھندھا ہندو مارواڑی اور مہاجن کرتے ہیں۔

مالیگاؤں کے مسلمانوں نے جنگ آزادی میں بھی قربانیاں دی ہیں جو بھلائی جا چکی ہیں۔ پورے ملک میں تحریک خلافت کے پانچ مسلم شہیدوں کی یاد منائی گئی[لیکن آزادی کے بعد شہید ہونے والے سیکڑوں مسلمانوں کی یاد کون قائم کرے گا] لیکن اس کا بھی دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ان شہداء کے نام لکھنے کی اجازت کلکٹر نے نہیں دی۔

سنہ ۱۹۶۳ء میں فساد ہوا۔ سنہ ۱۹۶۷ء میں قتل و غارت گری ہوئی۔ ایک درسی کتاب میں ایک مضمون میں محمد صلعم پر توہین آمیز احتجاج کے جرم میں ۲/ نومبر سنہ ۱۹۸۲ء کو بری طرح لوٹا اور برباد کیا اور جلایا گیا۔

مسٹر کاکا نی مارواڑی کے پاس آتش گیر مادہ رکھنے کا لائی سنس ہے۔ جس سے پتھروں کو ڈائینامیٹ کیا جاتا ہے۔ اس سے ۶ / جون سنہ ۱۹۸۳ء کو عید گاہ کے راستہ میں دھماکہ کیا گیا۔ فایر بریگیڈ والے آگ بجھانے آئے جس میں دوسرے دھماکے سے دو فایر مین وہیں ختم ہو گئے۔ ایک بڑا پتھر اچھل کر اسپتال کی عمارت میں گرا جس سے ایک آدمی اور مرا۔

۲۵ / جون سنہ ۱۹۸۳ء کو پرووینشل کپ جیتنے کی خوشی میں شہر میں چراغاں رہا۔ لیکن ۲۶ / جون کو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جب تراویح ہو رہی تھیں پٹاخے چھٹائے گئے۔ ایک وکیل مسٹر واسدیوین نائیکر نے ہندؤں کو جمع کر کے مسلمانوں کے خلاف تقریر کی پولیس ساتھ ساتھ تھی تھانہ انچارج مسٹر جھریکر نے بھی ہندؤں کی مدد کی۔ کانگریس کے مسلمان مسٹر عبدالقادر بھی زخمی ہوئے [مگر یہ کانگریس کا بندہ یہی کہتا ہوگا کہ غلطی مسلمانوں کی ہے] ایک مسلمان میاں بیوی جو ساتھ جارہے تھے ان پر بھی حملہ کیا گیا۔ اس کے بعد دوکانیں اور کارخانے لوٹے گئے۔ بیکریوں کو بھی لوٹا گیا۔ پھر دونوں طرف سے لوٹ مار شروع ہوئی۔ بسیں اور کاریں بھی جلیں۔ دیہات تک یہ وبا پھیلی جہاں مسلمانوں کی کھڑی فصلیں اور انگور کے باغات کاٹ ڈالے گئے۔ اسکوٹر، ٹریکٹر اور کاریں یہاں بھی جلائی گئیں۔ موضع وڈیر کھا کھوڑی کے مسٹر حکیم الدین کا ڈھائی لاکھ روپیہ کا نقصان ہوا۔ قصبہ میں مسٹر شرما کی ایک فینسی ٹکسٹائل کی فیکٹری بھی جلی۔ دیہاتوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی کم تھی وہاں ان کا نقصان زیادہ ہوا۔

ہندستان اور پاکستان کا کھیل کا میدان، یہاں مسلمانوں کا قبرستان بننے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

۱۳ / اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء کو سری نگر میں ویسٹ انڈیز سے کرکٹ میچ کے دوران سری نگر میں کشمیر کے کچھ نوجوانوں نے ہندستانی ٹیم پر ڈھیلے بازی کی۔ جس کی مذمت سبھی نے کی لیکن محترمہ اندرا گاندھی کو اس میں بھی ہندو مسلم مسئلہ نظر آگیا اور یہ رویہ ہندستان اور ہندو دشمنی کا مسئلہ بن گیا۔ لیکن کیا یہ بات جو سری نگر میں ہوئی ہندستان

کے عام مزاج سے الگ کوئی چیز تھی۔

ایشیاڈ سنہ ۱۹۸۲ء میں دہلی میں جہاں محترمہ خود موجود تھیں جب ہندو پاک ہاکی میچ ہو رہا تھا۔ اس میچ میں ہندستان کا ایک فلم اسٹار جو محترمہ کا بڑا چہیتا ہے، امیتابھ بچن، ہندستان کا جھنڈا لئے کھیل کے میدان میں بھارت ماتا کی جے پکارتا پھر رہا تھا لیکن محترمہ نے اسے منع نہیں کیا۔

دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں پاکستان کے اچھے کھیل کی تعریف دہلی میں نہیں کی گئی بلکہ دوسرے ملکوں کی ہمت افزائی ان کے خراب کھیل کے باوجود کی گئی محترمہ نے ناگواری کا اظہار نہیں کیا۔ ستمبر۔اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء میں ہندو پاک کرکٹ میچوں میں پاکستان کے ساتھ غیر شریفانہ برتاؤ کیا گیا۔ حیدرآباد کے میدان میں آئینہ سے پاکستانی کھلاڑیوں پر سورج کی شعاعیں ڈالی گئیں۔ ناگپور میں ان پر ٹماٹر پھینکے گئے ۔۔۔ مگر محترمہ نے مذمت نہیں کی۔۔۔ اگر کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ (حصہ) ہے تو اس بات پر خوش ہونا تھا کہ ناگپور سے کشمیر تک ایک ہی ذہن کارفرما ہے۔ اس پر ناراضگی کیا؟

کانگریس (ا) کے جنرل سکریٹری مسٹر راجیو کو صرف جموں و کشمیر کی صورت حال خلاف معمول دکھائی دے رہی ہے جبکہ ۱۱/ نومبر سنہ ۱۹۸۳ء کو وہ آزادانہ تقریر فرما رہے تھے لیکن آسام جہاں سخت پہرہ میں اسی دن محترمہ تقریر فرما رہی تھیں وہاں کے حالات معمول پر تھے۔۔۔ جسے پیا چاہے وہی سہاگن، اگر فاروق عبداللہ آپ کی لیڈر شپ کو تسلیم کر لیں تو حالات معمول پر آجائیں گے اور وہ سیکولرازم کا نشان بن جائیں گے۔ ورنہ پارلیمنٹ سے کھیل کے میدان تک مسلمان غدار قرار دے دیئے جائیں گے۔

تم وہ ہو سمندر جنہیں کھا جاتا ہے
ہم وہ ہیں سمندر کو جو پی جاتے ہیں

شری لنکا اور ہندستان

ظلم بھوے راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلانے لگے

۲۹ / جولائی سنہ ۱۹۸۳ء کے اخبارات میں قومی سطح کے بیشتر لیڈروں نے شری لنکا میں پھوٹ پڑنے والے تشدد پر اپنے رد عمل اور پریشانی کا اظہار کیا ہے۔

وزیراعظم اندرا گاندھی نے عجلت میں ۲۸ / جولائی کو اپنے وزیر خارجہ کو لنکا بھیجا ہے۔ شری لنکا میں ۲۹ / جولائی سے پچھلے پانچ دنوں میں ۱۷ تامل باشندوں کی ہلاکت کی اطلاع ملی ہے غیر سرکاری اندازہ سو افراد کی موت کا ہے۔ اس فساد میں ہزاروں دوکانیں جلائی گئی ہیں۔ سترہ بڑی فیکٹریاں برباد کردی گئی ہیں۔ پچاس ہزار افراد بے گھر ہوئے ہیں۔ کیمپوں میں ۳۵ ہزار افراد ہیں۔ قتل کی زیادہ تر وارداتیں جیل میں ہوئی ہیں۔ خبر ہے کہ جفنا کے قید خانہ میں تامل قیدیوں نے سنہالی قیدیوں پر حملہ کردیا ۱۳۰ سپاہیوں نے پاگل بن کر ۱۷۵ مکانات کو نقصان پہونچایا ہے۔ ایک شخص ہلاک اور بہت سے زخمی ہوئے ہیں۔

لنکا کی وزارت ریاست کے سکریٹری مسٹر ڈگلس لیانگے نے سپاہیوں کے خلاف ایک جملہ کہا ہے ..... "تادیبی کاروائی کی جائے گی۔"

اسکو ہمارے قومی پریس نے پسند نہیں کیا؟ بھارتی قومی پریس کو معلوم ہونا چاہئے کہ سری لنکا ہمارا اصلی پڑوسی ہے اور وہ ہندستان سے پتلا نہیں موتتا۔ جو صاف اور دو ٹوک بات کہدے۔ اسے بھی داؤں پیچ ہمارے ہی جیسے آتے ہیں۔ اسی لیے ان سپاہیوں کو پہلے پاگل پن کا سرٹیفکٹ دے دیا گیا۔ پھر تادیبی کاروائی کی جائے کا ذکر کیا گیا جس میں بڑی گنجائش ہے!

ساتھ ہی سرکاری اعلان میں کہدیا گیا جو تامل باشندے قتل ہوئے انھیں دہشت

گردی میں گرفتار کیا گیا تھا۔

نئی دہلی میں شری لنکا کے ہائی کمیشن کے سامنے انا ڈی-ایم کے-ڈی-ایم-کے اور کانگریس (ا) کے ممبران پارلیمنٹ نے مظاہرے کئے۔

کانگریس (ا) کے چالیس ممبران پارلیمنٹ نے کانگریس (ا) کے دو جنرل سکریٹریوں کی قیادت میں (جے-کے-موپنااور چندولال) جن میں عورتیں بھی شامل تھیں جے-وردھن صدر شری لنکا ہائے ہائے کے نعرے لگائے۔

کانگریس (ا) کے ممبران پارلیمنٹ نے مسز گاندھی سے مل کر کہا کہ وہ شری لنکا کے سفارت خانہ کے سامنے مظاہرہ کریں گے جن میں آندھرا کے سابق وزیراعلیٰ برہما نند ریڈی بھی شامل تھے۔

ڈی-ایم-کے-کے ممبران پارلیمنٹ نے محترمہ گاندھی کو میمورنڈم پیش کیا۔ جس میں کہا گیا کہ شری لنکا کی سرکار پر زور ڈالیں کہ تامل باشندوں کے قتل عام کو روکا جائے۔

صف ماتم :- تامل ناڈو کے وزیراعلیٰ نے چھ روز تک ریاست میں سوگ منانے کی اپیل کی۔ سیاہ بلے، بسوں اور کاروں پر کالے جھنڈے لگا کر۔

دراوڑ منترا کزگم کے صدر مسٹر کرونا ندھی نے وزیراعظم سے کہا کہ ہندستانی فوجیں بھیج کر قتل روکا جائے جیسے بنگلہ دیش بھیجی تھیں۔

اب تک کی خبروں کے مطابق چار سو اشخاص مارے گئے ہیں۔ چار سو کی موت، پچاس ہزار بے گھر ہونے والوں پر پورے ملک کی لیڈرشپ، ممبران پارلیمنٹ اور دوسرے لوگوں نے بڑا شور و ہنگامہ کیا۔

لیکن آسام میں جہاں دس ہزار قتل ہوگئے۔ تین لاکھ بے گھر ہوئے ان پر اتنے بڑے ملک میں رونے والا کوئی نہیں۔ ان کے لیے سوگ منانے والا کوئی نہیں۔ اور یہ اس جرم میں قتل ہوئے کہ اپنے کو ہندستانی کہتے تھے۔ لیکن جو اپنے کو تامل کہتے ہیں ہندستانی نہیں ان کے لیے یہ محبت و ہمدردی کس تنگ دلی کا مظہر ہے؟

گنگ ٹوک سکم میں ۲۹ / جولائی سنہ ۱۹۸۳ء کو محترمہ اندرا گاندھی بولیں۔۔۔۔۔۔
"شری لنکا کے واقعات پر ہندستان خاموش نہیں رہے گا۔"

تامل ناڈو کامراج کانگریس کے نائب صدر مسٹر اے۔ راما مورتی چھ دن کا شری لنکا کا دورہ کرکے ۲۹ / جولائی کو لوٹے تو انھوں نے بتایا کہ شری لنکا کے وزیر صنعت کا رن یتھیو اس فساد کی رہنمائی کر رہے تھے۔

یہاں بھی مسلمانوں کے خلاف فرقہ پرستوں کو وزراء اکساتے ہیں آزادی کے بعد یہ نعرے بلند ہونے لگے یہاں کی زمین اتنی گرم کردو کہ مسلمان رہ نہ سکیں۔" اور یو۔ پی میں کانگریس سرکار کے وزیر اردو زبان کی مخالفت کھلے عام کرتے ہیں۔

شری راما مورتی نے کہا ۔۔۔ "وہاں کی سرکار فسادیوں کے سامنے بے بس ہے۔ (یہاں بھی بے بس ہے جس کے نتیجہ میں آسام میں دس ہزار مسلمان قتل کئے گئے اور ۳۶ برسوں میں دو لاکھ مسلمان مارے گئے۔)

انھوں نے مزید کہا کہ شری لنکا میں اندرا گاندھی کے کارٹون چھاپے گئے ہیں جن میں ان کو شیطان دکھایا گیا ہے جس کی للچائی ہوئی نظریں شری لنکا پر پڑ رہی ہیں۔۔۔۔۔ یہ راز کی باتیں ہیں۔۔۔۔۔ ہم کیا جانیں؟

اقوام متحدہ میں بھارت کی نئی منطق

اقوام متحدہ میں شری لنکا کے تامل مخالفت قتل عام کے ذکر پر ہندستان اور شری لنکا کے نمائندہ کے درمیان تصادم ہو گیا۔ شری لنکا نے کہا کہ ہندستان اس کے داخلی معاملات میں مداخلت کر رہا ہے۔ ہندستانی نمائندہ نے ۲۲ / اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء کو رفیوجیوں کی نئی آمد کو روکنے کے لیے بین الاقوامی تعاون سے متعلق سیاسی کمیٹی میں شری لنکا کا ذکر کیا۔ شری لنکا کے نمائندہ نے پنجاب اور آسام کا حوالہ دیا۔ اس پر ہندستان نے کہا کہ ہندستان اور شری لنکا کا مسئلہ الگ الگ ہے۔ "ہندستان کے مسئلہ سے پڑوسی ملکوں کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن شری لنکا کے رفیوجی ہندستان کے لیے مسئلہ ہیں۔"

حیدر آباد موت کی آغوش میں!

نظام الملک آصف جاہ اول بانی سلطنت نظام کا شہر، شاعر و وزیر و سیاستمدار، اورنگ زیب عالمگیر سے محمد شاہ رنگیلے تک ہر معرکہ کا فاتح، انسانی شرافت اور محبت و رواداری کا نمونہ، جسکا مقولہ تھا کہ انسانی زندگی گندم اور جو نہیں ہے جسے ہر سال بویا اور کاٹا جائے۔ شاعری میں بیدل جیسے نکتہ داں نے جس کے فن کو سراہا ہو جس نے اپنے عہد حکمرانی میں عدل و انصاف کی بنیاد قائم کی۔ آصف جاہ کا محل تعمیر ہو رہا ہے راہ میں ایک غریب ہندو کا مکان آجاتا ہے، مکان نہ توڑا جائے تو دیوار ٹیڑھی رہ جاتی ہے...... نظام کے کارندوں نے پہلے تو کوشش کی کہ مکان آسانی سے مل جائے مگر جب مالک مکان تیار نہ ہوا تو ڈرایا دھمکایا۔ آصف جاہ دہلی میں تھے اسی بیچ مکان کے مالک نے کسی طرح اپنی گذارش آصف جاہ تک دہلی پہونچا دی اور وہاں سے حکم نامہ پہونچا..... "کسی غریب کے مکان کو گرا کر میں اپنے محل کی دیوار سیدھی کرنا نہیں چاہتا۔ اسکا مکان چھوڑ کر دیوار ٹیڑھی اٹھا دی جائے۔" ایسے عادل کا شہر حیدر آباد!

آج جمہوری دور میں شہروں کو خوبصورت بنانے کے نام پر مسلمانوں کی غریب بستیوں، قبرستانوں اور مساجد کو جس طرح مسمار کیا گیا ہے اس کی نظیر تاریخ عالم میں ملنا مشکل ہے۔

اسی امن و سلامتی کے حیدر آباد میں پنڈت نہرو سے این۔ ٹی۔ راما راؤ تک مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی گئی۔ مسلمان حاکموں نے سب کو زندہ رہنے کا حق دیا تھا لیکن آزادی کے بعد مسلمانوں سے ہی یہ حق چھین لیا گیا۔

حیدر آباد میں نئی سرکار بننے کے بعد امید تھی کہ فلمی ہیرو، فلم کی دنیا میں سب کا دل جیتنے والا، سیاست کی دنیا میں بھی ہردلعزیزی حاصل کرے گا..... مگر.....

اک دل نشیں کلی جو سر باغ کھل گئی   تو خاک میں لطافت گلزار مل گئی
پہنی قبائے نرم تو جلد اور چھل گئی   ٹھہرا جو دل تو صبر کی بنیاد ہل گئی

شبنم اِدھر گِر ، ورق گل پہ جڑ گئی
گلزار زندگی پہ اُدھر اوس پڑ گئی

این- ٹی-راما راؤ، فلم کے ہیرو ہندؤں کے مقدس کیسری رنگ کے ریشمی لباس میں ملبوس، دل کے بڑے کالے نکلے۔ ۹ / ستمبر سنہ ۱۹۸۳ء سے ۲۷ / ستمبر تک لگاتار فساد کا بھنگی سرگرم عمل رہا جس میں ۱۴۵ انسانی جانیں گئیں۔

اس فساد کی روداد آزاد ہند کلکتہ کے ایڈیٹر جنھوں نے مغربی بنگال کے ڈپٹی اسپیکر کلیم الدین شمس کے ہمراہ فساد زدہ شہر کا دورہ کیا تھا۔ ۲۸ / ستمبر سنہ ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں بیان کی ہے۔ جسکا عنوان ہے۔ "حیدر آباد موت کی آغوش میں"

"ایک تہذیبی شہر کے گلے پر خنجر چلایا جا رہا ہے"

۲۳ / ستمبر سنہ ۱۹۸۳ء حیدر آباد شہر کا سب سے خراب دن تھا۔ جب اس کے دس شہریوں کو مختلف مقامات پر دن کے اجالے میں اور رات کے اندھیرے میں قاتلوں کے چھرے نے موت کی آغوش میں ابدی نیند سلا دیا۔ فساد زدہ حیدر آباد کے دورہ کا یہ پہلا دن تھا۔ ڈپٹی اسپیکر مغربی بنگال کلیم الدین شمس کا استقبال کرنے حیدر آباد ہوائی اڈے پر بہت سے لوگ آئے تھے۔ جن میں مجلس تعمیر ملت کے نائب صدر اور تلگو دیشم کے سکریٹری جناب انصر بیگ بھی تھے۔ دوپہر کے کھانے کے فوراً بعد ہم فساد زدہ علاقوں کے دورے پر نکل گئے۔ ہری باولی، مغل پورہ، شاہ علی بنڈہ، دبیر پورہ، چنچل گوڑہ وغیرہ کا دورہ کیا۔ علاقے ویران، سنسان، آمدورفت ناپید، اکا دکا راہ گیر نظر آجاتے یا پھر بند دروازوں کے پیچھے خوفزدہ چہرے جھانکتے ہوئے نظر آتے۔ ہر آنکھ میں خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔ چہروں پر اداسی، اور بے یقینی کی حالت چھائی ہوئی تھی۔ یہ پرانا شہر حیدر آباد ہے۔ نظام دکن کے دور کا حیدر آباد۔ مگر اب یہاں غربت کے سایہ گہرے ہو گئے ہیں، جہاں زندگی مسکراتی کم روتی زیادہ ہے۔

ہم د بیر پورہ کی مسجد یٰسین جنگ گئے تھے۔ جسے ۲۱/ ستمبر کو گنیش کے جلوس کے دن بلوائیوں نے پتھراؤ کر کے شدید نقصان پہونچایا تھا اور اندر داخل ہو کر توڑ پھوڑ مچائی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مسجد میں رکھے ہوئے قرآن مجید کے نسخوں کی بھی بے حرمتی کی گئی۔ گنیش[1] کے جلوس کا یہ راستہ نہیں تھا مگر اس طرف جلوس لایا گیا۔ پولیس نے مقررہ راستے سے ہٹ کر جلوس کے اُدھر آنے پر رکاوٹ نہیں ڈالی۔ اور جلوس نے آتے ہی مسجد پر دھاوا بول دیا شاید یہ پہلا موقع ہے جب یہ الزام نہیں لگایا گیا کہ جلوس پر مسجد سے پتھر پھینکے گئے اور تلاشی لینے پر مسجد سے بم اور دوسرے مہلک ہتھیار برآمد نہیں ہوئے۔

گنیش کے اس جلوس کی داغ بیل سنہ ۱۹۸۰ء میں سابق وزیراعلیٰ کانگریس چنا ریڈی نے ڈالی تھی۔ یہ جلوس ہندو طاقت کا مظہر ہوتا ہے جس میں چار پانچ ہزار مورتیاں اور ۵ تا ۱۰ لاکھ لوگ شریک ہوتے ہیں۔ معظم جاہی مارکیٹ کے سامنے چوراہے پر وزیراعلیٰ راما راؤ نے گنیش کے جلوس کا استقبال کیا۔ جلوس نعرے لگا رہا تھا۔ ہم سے جو ٹکرائے گا مٹی میں مل جائے گا۔ ہندو ہندو بھائی بھائی۔ ہندستان کا وکاس (ترقی) ہندو ایکتا میں ہے۔

گنیش کے جلوس والے اپنے جھنڈوں میں لاٹھیوں اور لوہے کی سلاخوں کو لگا کر لائے تھے۔ ٹرکوں کے اندر پتھر بھرے ہوئے تھے۔ جن پر دری وغیرہ بچھا کر جلوس والے بیٹھے تھے۔ پھر یہی پتھر فساد شروع ہوتے ہی مسجد اور لوگوں کے گھروں پر برسنے لگے۔ لاٹھیاں اور لوہے کی سلاخیں چلنے لگیں۔ سعید آباد سے جو جلوس روانہ ہوا تھا اس نے کرما گوڑہ براہ چنچل گوڑہ اور دبیر پورہ میں اقلیتی فرقہ کی دوکانوں اور مکانوں کو ایک طرف سے لوٹنا اور توڑنا شروع کر دیا۔ چھاونی نادعلی بیگ میں بھی نصف درجن مکانوں پر حملہ کیا۔

اسی رات اخبار منصف کا گلا گھونٹا جاتا ہے۔ رات کے دو بجے اخبار کے دفتر اور پریس پر چھاپہ مار کر پولیس اسے سر بمہر کر دیتی ہے۔ دوسرے دن ۲۲/ ستمبر کو اخبار شایع نہیں

---

[1] ہاتھی۔

ہوا۔ ایک اور اخبار "رہنمائے دکن" کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آتے آتے رہ گیا۔ اخبار کا پریس اس کے دفتر سے دوری پر تھا اور پولیس کو یہ بات معلوم نہیں تھی۔ جب پتہ چلا تو دیر ہو چکی تھی اور اخبار نکل چکا تھا۔

پولیس کا ناقص انتظام:- فساد زدہ شہر میں پولیس کا انتظام نہ ہونے کے برابر تھا۔ کہیں کہیں دو چار پولیس والے کبھی کونے میں دبکے ہوئے بیٹھے دکھائی دے جاتے، اس کے علاوہ فساد زدہ علاقوں میں پولیس کی موجودگی کا کوئی احساس یا پتہ و نشان نہیں تھا۔ اسی شام وزیر اعلیٰ نے پریس کو بتایا کہ انھوں نے فسادیوں کی رسی ڈھیلی کر دی ہے یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا ہوتا ہے۔ فی الحال وہ صبر و تحمل سے کام لے رہے ہیں ــــ لوگ سڑکوں پر مارے جا رہے تھے۔ حیدر آباد کی گلیاں بے گناہوں کے خون سے لالہ زار ہو رہی تھیں۔ اور چیف منسٹر صاحب صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنے کے لیے رسی ڈھیلی کئے ہوئے تھے۔ ۲۴ ستمبر تک کرفیو نہیں لگایا گیا تھا اور لوگوں کو سڑکوں پر قاتلوں کی ماہرانہ خنجر زنی کا شکار ہونے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اسوقت تک چالیس افراد جان سے مارے جا چکے تھے۔ پچاس اسپتال میں تھے۔

دوسرے دن ۲۴ / ستمبر کو چیف منسٹر این۔ ٹی۔ راما راؤ سے ملاقات ہوئی۔ کلیم الدین شمس نے وزیر اعلیٰ سے پولیس نظر نہ آنے کی شکایت کی اور راما راؤ سے دو ٹوک کہدیا آپ کی پولیس پر اقلیت کو ذرا بھی اعتماد باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اول تو پولیس کا انتہائی ناقص بند و بست ہے اور جب کسی جگہ پولیس حرکت میں آتی ہے تو اقلیتی افراد اسکا ظلم و ستم سہنے کے سوا کچھ نہیں سناتے۔ یہ سن کر این۔ ٹی۔ راما راؤ تلملا گئے۔ اور انھوں نے کہا جناب میری پولیس شاندار کارنامہ انجام دے رہی ہے۔ اس تلخ گفتگو کے بعد ملاقات زیادہ خوش گوار انجام کو نہیں پہونچ سکتی تھی۔ ان کی پارٹی کے سکریٹری مسٹر انصر بیگ نے پہلے ہی اچھی طرح ان کے کان بھر دیئے تھے۔ بات یہ ہوئی تھی کہ ایسوسی ایٹیڈ نیوز سروس کے ذریعہ کلیم الدین شمس کا بیان مقامی اخبار "رہنمائے دکن" میں اسی صبح

چھپ گیا تھا ــــ "تلگودیشم حکومت نظم و قانون کی برقراری میں ناکام رہی ہے۔ انصر بیگ صاحب اس بیان پر بڑے چراغ پا تھے۔ شاید وہ سمجھ رہے تھے کہ کلیم الدین شمس چاپلوس اور منافق لیڈروں کی طرح این۔ ٹی۔ راما راؤ کی حکومت کو سرٹیفکیٹ دیکر جائیں گے اور کہیں گے کہ ان کی حکومت بڑا اچھا کام کررہی ہے۔ ۴۰، ۵۰ آدمی مارے گئے تو کیا ہوا باقی سب خیریت ہے۔ مسٹر کلیم الدین شمس نے اپنے اس اٹل ایقان کا اظہار کیا ہے کہ "آندھرا پردیش میں تلگودیشم حکومت مجہول، ناکارہ اور نظم و قانون کی برقراری میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ ینز ستی پولیس کے ارباب کرائے کے غنڈوں کی خدمات حاصل کرکے فساد برپا کررہے ہیں۔ جسکا واحد مقصد ہے کہ اس شہر سے مسلمانوں کی تہذیب اور کلچر کے نشانات کو ملیا میٹ کردیا جائے۔ جس کی مثال آج بھی ہندستان کے طول و عرض میں دی جاتی ہے۔" ("رہنمائے دکن" ۲۴/ ستمبر حیدر آباد)

کلیم الدین شمس کا دوسرا بیان حیدر آباد کے کثیر الاشاعت اخبار سیاست میں چھپا جس میں انھوں نے کہا ــــ "حیدر آباد میں دو ہفتوں سے حالات خراب ہیں مگر حکمراں ابھی تک پولیس پر انحصار کئے ہوئے ہیں۔ اور معصوم افراد کی جانیں تلف ہورہی ہیں۔ دیگر سیاسی حکومتوں کو مغربی بنگال کی حکومت سے سبق لینا چاہئے۔ جہاں جب بھی فساد کی کوشش کی جاتی ہے تو وزراء پولیس پر تکیہ کرنے کے بجائے خود متاثرہ مقام پر پہونچ کر حالات پر کنٹرول کرلیتے ہیں۔ جارحانہ فرقہ پرستی کے خلاف آہنی پنجہ استعمال کیا جاتا ہے۔"

حیدر آباد میں ہونے والے فساد پر مغربی بنگال اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر کلیم الدین کا بیان آپنے دیکھا۔ اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ جیوتی باسو نے فسادات پر قابو پانے میں سیکولر ذہن کا ثبوت دیا ہے۔ وہ خود رفیوجی ہیں اور فساد کے اس درد کو جانتے ہیں۔ یہ حادثہ انھیں فرقہ پرستی کی طرف بھی لے جاسکتا تھا مگر انھوں نے اپنی بہادری اور اعلیٰ ظرفی سے نفرت کی آگ پر قابو پایا ہے۔ بنگال کی مٹی نے سیکولر ذہن کے لوگ ماضی میں بھی پیدا کئے تھے۔ مولانا آزاد نے ہندستان کے ہندو لیڈروں میں صرف ایک سیکولر انسان کی نشاندھی کی ہے اور وہ سی۔ آر۔ داس تھے۔ باقی کسی لیڈر کے لیے

ان کی زبان سے سیکولر کا لفظ نہیں نکلا۔ اسوقت بنگال کے ایک ممبر پارلیمنٹ (جن کا تعلق فارورڈ بلاک سے ہے) میں ذاتی واقفیت رکھتا ہوں اور کہہ سکتا ہوں کہ ان کا ذہن صاف ہے اور وہ بھی سیکولر قدروں کے علمبردار ہیں اور نفرت کی سیاست سے کوسوں دور ہیں ان کا نام ہے چتا باسو۔

جیوتی باسو اور ان کی سرکار کا رویہ قرآن پر پابندی کے خلاف مقدمہ میں منصفانہ رہا ہے اور ان کی سرکار میں مسلمانوں کی عزت و آبرو اور جان و مال محفوظ ہے۔ لیکن سرکاری ملازمتوں سے بیدخلی جس طرح کانگریس کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

میرٹھ کی کہانی.... بھارتی پارلیمنٹ کی زبانی

لوک دل کے ممبر پارلیمنٹ (راجیہ سبھا) ستیہ پال ملک نے (جو خود میرٹھ کے باشندے ہیں) راجیہ سبھا (اپر ہاؤس) میں میرٹھ کے فساد پر ہونے والی بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا (جس کی رپورٹ ہفت روزہ نئی دنیا دہلی ۱۹/ تا ۲۵/ اکتوبر سنہ ۱۹۸۲ء شایع ہوئی ہے)۔۔۔ "میں اپنی معلومات اور ذمہ داری کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں کہ عید کے پہلے (بقرعید) تک جتنے لوگ گرفتار ہوئے، جتنے لوگ مارے گئے، جتنے مکانات جلائے گئے، جتنی دوکانیں لوٹی گئیں، جتنے گھروں میں گھس کر پی-اے-سی نے بدتمیزی کی اسکا پورا نتیجہ نکالیں گے تو آپ اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ یکطرفہ کاروائی ہوئی۔ پی-اے-سی اور ایڈمنسٹریشن کا رول بالکل یکطرفہ رہا۔ اور اس میں مسلمانوں کے ساتھ میرٹھ میں زیادتی ہوئی اسکی سبکو مذمت کرنی چاہیے۔

ستیہ پال ملک نے کہا وہ جذبات میں آکر یہ بات نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ ایمانداری سے کہنا چاہتے ہیں کہ ان جیسے لوگ جنھوں نے سنہ ۱۹۴۷ء کے فسادات نہیں دیکھے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ایسے ہندستان میں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ جس میں تیوہاروں کے موقع پر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو مبارکباد نہ دے سکیں۔

انھوں نے کہا.... " پی-اے-سی کا رویہ اقلیتوں، محنت کشوں اور طلباء کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔"

" پی-اے-سی مسلمانوں کو لوٹتی ہے۔ اسلئے ہندو صرف پی-اے-سی چاہتے ہیں۔"

لوک سبھا (پارلیمنٹ) میں ڈی-ایم-کے ممبر پارلیمنٹ سی-ڈی-ڈھنڈ پانی کی تقریر۔ انھوں نے کہا.... "مسز گروندر کور برار کو نسوانیت کی بے حرمتی نہیں کرنا چاہئے۔ میرٹھ میں پی-اے-سی نے ایک لڑکی کی آبروریزی کی جس کے باپ کا نام

کریم الدین ہے اور اس بد نصیب لڑکی کا نام فاطمہ نظیرہ ہے۔ یہ پی۔اے۔سی کی ننگی جارحیت ہے اور پی۔اے۔سی کا یہ سلسلہ مسلسل چل رہا ہے۔"

"میرٹھ کا فساد وزیراعظم کے بیان کا نتیجہ۔"

میرٹھ کے فساد کے بارے میں رام نہورارا کیش ایم۔پی الہ آباد۔ غلام محمد خاں ایم۔پی مراد آباد۔ ترپن سنگھ نگی ایم۔پی ٹیڑھی گڑھوال۔ ہریش کمار گنگوار ایم۔پی پیلی بھیت۔ رام لال راہی ایم۔پی سیتاپور نے ایک مشترکہ بیان میں کہا۔۔۔ "اگر فساد کسی ری ایکشن (رد عمل) کا نتیجہ ہے یا ہوسکتا ہے تو صرف پچھلے اگست سنہ ۱۹۸۲ء میں امریکہ کی یاترا (سفر) کے دوران وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کا نیویارک ٹائمز کو دیا گیا انٹرویو ہے جس میں یہودیوں کو خوش کرنے کے لیے وزیراعظم نے نیویارک میں کہا کہ ہمارا ملک سیکولر ہے مگر عرب ممالک ہندستانی مسلمانوں کو پیسہ دیکر ان مسلمانوں کے ذریعہ ہندستان کے ہریجنوں کا مذہب تبدیل کرا رہے ہیں اس طرح میرٹھ کا فساد وزیراعظم کے اس بیان کا نتیجہ ہے۔"

کمیونسٹ پارٹی کے اندر جیت گپتا نے کہا۔۔۔ "میں نے دیکھا کہ بہت سے مسلمانوں کے مکانات جلا ڈالے گئے۔ لیکن انھیں کے بیچ ہندؤں کے چار گھر محفوظ تھے۔ جب میں نے ہندؤں سے پوچھا تو انھوں نے کہا۔۔۔ مسلمانوں کے یہ مکان پی۔اے۔سی نے جلائے ہیں۔"

مسٹر گل شیر ممبر پارلیمنٹ جو کانگریس (ا) کے آل انڈیا اقلیتی سیل کے چیرمین بھی ہیں، نے کہا کہ اگر میرٹھ میں میں اپنا نام گل شیر بتا دیتا تو میری پٹائی ہوجاتی لیکن میں نے اپنے کو مسٹر گروندر کور برار کا سکریٹری کہہ کر اپنی جان بچائی۔"

یہ سیکولر ہندستان ہے جہاں مسلمان ممبر پارلیمنٹ بھی بے خوف ہو کر اپنا نام نہیں بتا سکتا۔

نگری نگری قریہ قریہ موت کا تانا بانا ہے
میرٹھ ہے ہر شہر یہاں ہر گاؤں یہاں ملیانا ہے

میرٹھ میں پھر فساد

ہندستان میں عید خوشیوں کے بجائے آگ و خون کا سیلاب ہندستانی مسلمانوں کیلئے لیکر آتی ہے۔ رمضان المبارک سے ہی موت کا بھیانک سایہ مسلط کردیا جاتا ہے۔ اس مرتبہ عید میں میرٹھ اور دہلی کے مسلمانوں کے خون سے زمین رنگین کی گئی۔ خون مسلمانان ہند کتنا کم قیمت ہو گیا۔

دہلی میں ۱۹ / مئی سنہ ۱۹۸۷ کو ہندوؤں نے گڑبڑ شروع کی اور اس دن معاملات قابو میں آگئے۔ ۲۲ / مئی کو الوداع کی نماز میں جامع مسجد کے امام عبداللہ بخاری نے اپنے خطبہ میں امن قائم رکھنے اور مسلمانوں کو نماز کے بعد اپنے گھروں کو واپسی کی تلقین کی لیکن واپسی پر راستے میں مسلمانوں پر پتھراؤ شروع کیا گیا اور فوراً ہی لوٹ مار اور آتش زنی شروع کردی گئی جسکا سلسلہ رات گئے تک چلتا رہا۔ جس میں پندرہ جانیں گئیں۔ بہت سے مسلمان پولیس کی گولیوں سے زخمی ہوئے۔ اور کچھ کو چھرے مارے گئے۔ زیادہ تر زخمی مسلمان اسپتالوں میں نہیں گئے کہ پولیس ان کو جھوٹے مقدموں میں پھانس دے گی۔

ایسے مسلمان بچوں اور نوجوانوں کو گولیوں کا شکار بنایا گیا جو اپنے گھروں کی چھتوں سے بھارت کی بہادر پولیس کی بربریت دیکھ رہے تھے اور وہ پرندوں کی طرح زمین پر آرہے۔

۲۴ / مئی سنہ ۱۹۸۷ کو کرفیو میں ڈھیل دیکر پندرہ منٹ کے لیے اس کے خاتمہ کا اعلان ہوا تو مسلمان اپنی ضرورتوں سے باہر آئے تو بوڑھوں بچوں اور عورتوں پر پولیس کی لاٹھیاں چلنے لگیں اور ان کو لہولہان کردیا گیا۔ بغداد میں ہلاکو اذان دلواتا تھا اذان

کی آواز سن کر جو مسلمان باہر نکلتے قتل کر دیئے جاتے تھے۔

۲۳ / مئی کو جو مسلمان زخمی ہو کر جے۔پرکاش نرائن اسپتال پہونچے تھے ان پر بھی پولیس کا ڈنڈا چل رہا تھا۔ ان میں روزہ دار مسلمان بھی تھے۔ جنھیں روزہ کھولنے کے لیے پانی تک نہیں دیا گیا بلکہ ان کے ہونٹوں پر پولیس والوں نے بندوق رکھ کر کہا..... "کٹوؤں (ہندو مختون کو کٹوا کہتے ہیں) مُوت (پیشاب) پی کر روزہ کھولو" اسی رات تین زخمیوں نے جام شہادت نوش کیا۔ محمد زاہد (ساکن حویلی اعظم خاں)، عتیق احمد (ساکن چاندنی محل)، فخرعالم (ساکن کٹرہ غلام محمد)، محمد زاہد کو جس کی عمر پندرہ سال تھی پولیس نے اسوقت گولی ماردی جب وہ اپنے گھر کی چھت سے جھانک رہا تھا۔ بیچارہ پرندہ کی طرح سڑک پر آرہا۔ لاالہ الااللہ کا ورد زبان پر رہا۔

اسی طرح کوچہ ناہر خان میں محمد شریف کو گولی مار کر شہید کردیا گیا۔ بلّی ماران پرانی دہلی میں کانگریس(ا) کے ممبر پارلیمنٹ شمیم احمد صدیقی پر پولیس نے حملہ کر کے سڑک پر ڈپل دوڑا دیا۔ دہلی کے اس علاقہ میں چالیس دوکانیں سترہ اسکوٹر اور کئی ٹرک نذر آتش کر دیئے گئے۔

۱۹ / مئی سنہ ۱۹۸۷ء کو بلّی ماران دہلی (جو مسلم محلہ ہے) میں اسکوٹر اور سائیکل سوار میں ٹکر ہو گئی مسلمان راہ گیر دونوں کو الگ کرنے لگے۔ جو دونوں ہندو تھے۔ ہندو گنڈے یہ سمجھے کہ اسکوٹر والا ہندو ہے اور مسلمان سائیکل سوار کی مدد کر رہے ہیں جو شاید مسلمان ہوگا۔ حالانکہ ہندستان میں سائیکل اور اسکوٹر کی ٹکر میں لوگ سائیکل سوار کی، کار اور اسکوٹر میں اسکوٹر سوار کی، کار اور بس کی ٹکر میں کار والے کی حمایت کرتے ہیں۔ یہاں ہندو غنڈوں نے مسلمانوں پر حملہ کردیا جو شر مٹانے کے لیے ایک دوسرے کو الگ کر رہے تھے۔ یہاں سے آگے بڑھ کر دوسرے علاقوں میں بھی مسلمانوں پر حملے شروع ہوگئے۔ محلہ چرخی والان کے ہندوؤں نے جہاں ان کی اکثریت ہے مسلمانوں پر پتھراؤ شروع کیا، دوکانیں لوٹی گئیں۔ اسی علاقہ کے محبوب الٰہی کا مکان جلا دیا گیا مسلم عورتوں پر یورش کی گئی محمد اظہار پر چھرے سے حملہ ہوا۔ کشمیری سوداگروں کو مارا پیٹا

گیا۔ مولانا وقار احمد صاحب بھی مارے گئے۔ محلہ جوگی واڑہ میں ایک ہندو نے اپنی بندوق سے فائرنگ کی۔ مسجدوں پر حملے ہوئے نمازیوں کو مارا گیا۔ اسی علاقہ کی ایک مسجد کے امام شوکت علی صاحب جو کلکتہ چوبیس پرگنہ کے باشندہ تھے شہید کر دیئے گئے۔ حوض قاضی کی چھتہ صوفی والی مسجد پر بھی حملہ ہوا۔ جہاں محمد متین اور اخلاق احمد صاحب کو بری طرح زخمی کردیا گیا۔ یہ رپورٹ لکھانے گئے تو پولیس نے الٹے ان کو مجرم قرار دے دیا۔ غرض سیتا رام بازار سے لال کنواں تک مسجدوں اور مسلمانوں پر حملے جاری رہے پولیس خاموش تماشائی بنی رہی۔

میرٹھ میں پولیس ایکشن:- میرٹھ میں ۱۹ / مئی کو پولیس ایکشن شروع ہوا۔ جس میں پی۔اے۔سی (پراونشیل آرمڈ کانسٹبلری) اترپردیش نے مسلمان نوجوانوں کی مقعد میں بندوق کی نال ڈالکر فایر کئے۔ ایک ہفتہ تک فوج کی آمد کے باوجود قتل و غارتگری فسادی کرتے رہے۔ آتش زنی میں تین ہزار مسلمان بے گھر ہوگئے۔ پولیس نے فوج کو کام کرنے نہیں دیا پولیس اور پی۔اے۔سی ہندو بلوائیوں سے ملکر مسلمانوں کا قتل کرتی رہی۔ املاک کی بربادی اور لوٹ مار جاری رہی۔ ۱۹ / مئی سے کرفیو کا نفاذ یکطرفہ تھا۔ ایک ہندو کا قتل ہوگیا تھا بس مسلمانوں کے خلاف قتل و غارتگری شروع ہوگئی۔ سنت بھنڈران والا نے ایک سردار کے سر کی قیمت ۱۰۵ ہندو لگائی تھی پورے ملک میں سرداروں سے بولنے والا کوئی نہیں۔ مسلمانوں کے سر بے قیمت ہوگئے۔ لہٰذا ہر جگہ قبرستان بنالیے گئے۔ علماء آسایش پسند سیاسی لیڈر خود پسند بن گئے تو مسلمان بے حیثیت ہوگئے۔

۲۱ / مئی سنہ ۱۹۸۷ء کی دوپہر کو پانچ سو ہندو محلہ نگم بازار میرٹھ میں لوٹ مار اور آتش زنی پولیس کے زیرسایہ کرتے رہے۔ ہندی ہفت روزہ چوتھی دنیا کے نمائندہ ویریندر سینگر اور اروند کمار سنگھ نے کہا کہ ایک مسلم نوجوان نے ہم سے لفٹ مانگی (اپنی کار میں بٹھانے کی درخواست کی) ورنہ پولیس ہمیں مار ڈالے گی۔

میرٹھ کے محلہ عبدالوال شاہ پیر گیٹ میں ۱۸ / اور ۱۹ / مئی کی درمیانی شب میں پولیس سیڑھیاں لگاکر مسلمانوں کے گھروں میں گھسی اور تین سو مسلمانوں کو گرفتار کرلیا۔ گاڑیاں دوڑا کر مسلمان بچوں اور عورتوں کو روند دیا گیا۔ جب مسلمان زخمیوں اور مردوں کو اٹھانے گئے تو سورج کنڈ روڈ کے جانوروں کے دواخانہ سے پولیس نے حیوانیت کا ثبوت دیتے ہوئے لگاتار گولیاں چلانا شروع کردیں تاکہ زخمی اور لاشیں اٹھائی نہ جاسکیں۔

زہر ہے سانپ لیکن وہ ہنس کر کبھی
آدمی کی طرح کاٹ سکتا نہیں

اسی کے قریب گولہ کنواں محلہ کی مسجد پر حملہ کرکے امام مسجد کا ہاتھ کاٹ لیا گیا۔

آستیں سے خون تو دھوڈالیئے　　پھر ہمارے قتل پر شرمائیے

اس کے بعد ہاشم پورہ محلہ پر حملہ کیا گیا اور پورے شہر کو آگ لگا کر چنگیز خاں کی یاد تازہ کردی گئی۔ گولہ کنواں کے چھپائی (کپڑا چھاپنے) کارخانے جلائے گئے۔ مدرسوں اور مساجد کو بھی نذر آتش کردیا گیا۔ سو گھنٹوں سے زائد یہ آتش زنی کا سلسلہ چلتا رہا۔ انتظامیہ کو کچھ خبر ہی نہیں کہ آتش زنی کی کتنی وارداتیں ہوئیں۔ شاہراہوں پر جلی لاشیں پڑی رہیں جن کی جنس کی بھی تشخیص نہیں ہوسکی۔ شاستری نگر محلہ میں ہر مسلم گھر کو سو ہندو پولیس اور پی۔اے۔سی کے تحفظ کے سایہ میں گھیرے تھے۔ محلہ کے لوگ مسلم مکانوں کی نشاندھی کررہے تھے۔ جو بھاگنا چاہتا جلتی ہوئی آگ میں پکڑ کر ڈالدیا جاتا۔ فساد پھیلانے والوں میں دیا پار سنگھ (مرچنٹس ایسوسی ایشن) میرٹھ کا جنرل سکریٹری اور پی۔ کھنہ پیش پیش تھا۔ جس نے ہندو اکثریت کے محلوں کے مسلمانوں کو لٹوایا اور قتل کروایا۔

موانہ بس اسٹینڈ کی مسلمانوں کی ساری بسیں جلادی گئیں۔ مسلم موٹر میکینک اسی دہکتی ہوئی آگ میں ڈالدیئے گئے۔ اس جگہ کی خصوصیت یہ ہے کہ پورا انتظامی عملہ یہیں رہتا ہے۔ اسٹینڈ سے ملا ہوا سول لائنز کا پولیس اسٹیشن ہے۔ جہاں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سیتر

سپرنٹنڈنٹ پولیس، ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ، سرکل آفیسر وغیرہ سب موجود۔

شہر کے بعد میرٹھ سے پانچ کلومیٹر دور "ملیانہ گاؤں" کو مقتل مسلمانانِ ہند بنایا گیا۔ ۲۳ / مئی کو بلا کسی سبب کے پی۔اے۔سی مسلم گھروں میں داخل ہو گئی۔ علاقہ کے ہندوؤں کے ساتھ امن و دوستی اور ایک ساتھ عیدالفطر منانے کا معاہدہ دھرا رہ گیا۔ ایک سیکولر مسلمان سلیم اختر صدیقی نے ۲۳ / مئی کو بتایا کہ ہندو، مسلمان ایک جگہ جمع ہوئے تھے اور سب ٹھیک تھا۔ مگر جب پی۔اے۔سی کی قتل و غارت گری شروع ہوئی تو ایک بھی ہندو کھڑا نہیں ہوا نہ ایسا کرنے سے اسے روکا۔

اردو کے ایک شاعر بشیر بدر کا ٹی۔وی شاستری نگر کی یورش میں بچ گیا اور ان کی کار نہیں جلی تو ان کے اندر کوئی خفتہ حمل بیدار ہو گیا انھوں نے اپنے اندر ایک نئے انسان کی بیداری کا اعلان کیا۔

وزیر جا رہے ہیں۔ تصویروں میں گم سم کھڑے ہیں۔ سن سب رہے ہیں۔ مگر ظلم کا سدباب کیسے ہوگا؟ ہر وزیر اور افسر کہتا ہے حالات قابو میں نہیں۔ قبرستانوں میں قبریں کھودی گئیں اسکول جلائے گئے۔

جن محلوں میں مسلمان اکثریت میں تھے وہاں پی۔اے۔سی کے ساتھ فوج اور جہاں ہندو اکثریت میں تھے صرف پی۔اے۔سی تعینات تھی۔

محلہ اِیلیان میں مکانوں کے اندر مسلمانوں کی لاشیں سڑ گئیں مگر دفن نہیں ہونے دی گئیں۔ اس محلہ میں صرف عورتیں بچی ہیں مرد یا تو شہید کر دیئے گئے یا خانہ قید۔

۲۷ / مئی کو اسلام نگر کی محمودہ بیگم اپنے چار بچوں کو اپنے سینے سے لگا کر چھپانا چاہتی تھیں۔ لیکن فسادیوں نے پی۔اے۔سی کی مدد سے پٹرول چھڑک کر آگ لگائی اور پھر گولیاں چلا کر خاکستر کر دیا۔

قریب کے ایک کنویں سے دس لاشیں نکالی گئیں۔

مراد نگر کے قریب ایک نہر سے پندرہ لاشیں نکالی گئیں۔ پچاس لاشیں گنگا نہر میں بہتی رہیں۔

ملیانہ کے محلوں اسلام نگر، ملتان نگر، کشن پورہ اور ملیانہ سے ایک سو چالیس (۱۴۰) مسلمان غائب ہیں۔ جن کو پی۔ اے۔ سی نے ٹرکوں پر لے جا کر گولیوں سے اڑا دیا۔ گاؤں کے اندر نہ جانے کتنے مسلمان جلا دیئے گئے۔

۲۳ / مئی کو پی۔ اے۔ سی نے ہریجنوں کے ساتھ شراب پی اور پھر لوٹ مار شروع کر دی۔ کہیں ہریجن جو خود برہمنت اور ہندوازم کا شکار ہیں ہندو مسلم دنگوں میں ہندو ہو جاتے ہیں اور اونچی ذات کی زیادتیوں کو بھلا کر مسلمان کے قتل میں شریک ہو جاتے ہیں۔

غرض یہ کہ بوڑھا، بچہ، جوان، مرد و عورت جو بھی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیوا تھا تباہی سے بچ نہ سکا۔

نئی دہلی کے ایک ہفت روزہ نئی دنیا نے اپنی ۹ / جون سنہ ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں شکایت کی کہ میرٹھ میں سنجیدہ مسلم قیادت نہیں ہے۔ جذباتی مسلمانوں کے ہاتھ میں قیادت ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو مصائب جھیلنا پڑ رہے ہیں جو مصائب و مسائل کے تجزیہ کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ پورس کے ہاتھی ہی تو کہتے رہے ہیں چالیس برسوں سے،

میرٹھ میں کانگریس (ا) کی محسنہ قدوائی ممبر پارلیمنٹ اور مرکزی وزیر ہیں ایک بڑے مسلم صوفی قاضی قدوہ سے اپنی نسبت جوڑتی ہیں۔ متشرقین کا یہ انداز رہا ہے کہ بہت سی اچھائیاں گنا کر کوئی ایسی بات کہہ دی کہ سب پر پانی پھر گیا یہی انداز بعض اردو صحافیوں کا بھی ہے ہندستانی مسلمانوں کے لیے باقی پریس تو خیر دشمن ہی ہے۔

ایک ترقی پسند شاعر غلام ربانی تاباں کو میرٹھ میں انسانی خون دکھا، مسلمان کا خون نہیں۔ محترم ہندو خون جافنا (شری لنکا) میں بہہ رہا تھا جس کی فکر بھارتی سرکار اور حزب اختلاف دونوں کو تھی اسلئے وہ انسانی خون بھی بھارت میں انسانی خون کا مطلب ہے ہندو خون۔ مگر میرٹھ میں تو مسلم خون تھا۔ فجی کی جمہوری سرکار نسل پرست مگر چالیس برسوں میں دولاکھ مسلمانوں کا خون بہانے والی بھارتی سرکار جمہوری اور سیکولر۔

میرٹھ کے دوسرے محلے یہ ہیں میاں محمد نگر، گلزار ابراہیم۔ شکور نگر، کھنہ روڈ، رشید نگر اور تارا پوری جہاں پولیس، پی۔ اے۔ سی اور ہندو بلوائیوں نے ڈیڑھ بجے دن کو

۱۹ / مئی کو دھاوا بولا۔ نہتے روزہ داروں پر بموں، گولیوں اور تیزاب کی بوتلوں سے حملہ کیا گیا۔ جنھوں نے بھاگنا چاہا ان پر گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ مکانات لوٹے گئے۔ عورتوں کی بے آبروئی کی گئی اور آخر میں آگ لگا کر زندہ مسلمانوں کو ان ہی کے گھروں میں جلادیا گیا جس سے بچنے کیلئے وہ اسلام میں آئے تھے۔

بیس سالہ مغیث، ۴۰ سالہ محمد سلیمان، ۶۵ سالہ محمد حنیف، ۴۰ سالہ صادق کو پی-اے-سی نے گولی مار دی محمد سلیمان کو تھانہ لساڑی گیٹ کے داروغہ د گپال نے گولی ماری۔ تاراپوری محلہ میں محمد حنیف کی بیوی رحیمن کو اس کے گھر کے اندر گھس کر پی-اے-سی کے ایک سپاہی نے گولی مار دی۔ اسی محلہ کے محمد شفیع کی شریک حیات بسم اللہ کو محلہ کے غنڈوں رشی رام اور رام پھول کے سامنے گولی مار کر شہید کر دیا۔ ۳۲ سالہ ہاشم نے بھی یہیں جام شہادت نوش کیا۔

محلہ شکور نگر میں مسجد گلی والی کے اٹھارہ سالہ حمید اور پچاس سالہ گھسیٹا کو لساڑی گیٹ کے داروغہ د گپال نے گولی ماری۔ سعید احمد پی-اے-سی کے ہاتھوں شہید ہوا۔

محلہ رشید نگر کے ۲۵ سالہ معروف خاں، ۶۰ سالہ فاطمہ، ۲۷ سالہ محمد اقبال کو پی-اے-سی نے ہلاک کیا محمد اقبال کی لاش غائب ہو گئی۔ اینہ بیگم اور مجیداً دونوں خواتین کو زندہ جلادیا گیا، صلاح الدین پی-اے-سی کے ہاتھوں مارے گئے۔

محلہ میاں محمد نگر میں ۱۹ / مئی کو محمد حنیف، محمد عوض، نور جہاں اور عبدالحمید کو زندہ نذر آتش کر دیا گیا۔ محمد حنیف کی جلی ہوئی ہڈیاں ان کی بہن رشیدن نے محفوظ کر لی ہیں۔ راجیو گاندھی کی سیکولر انتظامیہ کے پاس ہلاک شدگان کی فہرست نہیں ہے۔

جو سر کو جھکادے اسے کر دیتے ہیں یہ قتل
خونی ہیں گنہگار ہیں مقتل کے محافظ
جائیں تو کہاں جائیں گرفتار ستم آج
ہر موڑ پہ دیوار ہیں مقتل کے محافظ

اس ملک میں ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ پی-اے-سی والے بے گناہ ہیں، تو

ملیانہ میں آگ کیسے لگی؟ نہروں میں لاشیں کہاں سے آئیں؟ کیا ملیانہ کے مسلمانوں نے اجتماعی خود کشی کا پروگرام بنایا تھا؟

امنسٹی انٹرنیشنل نے ملیانہ کے قتل عام پر احتجاج کیا میرٹھ کے قتل میں لاپتہ اشخاص کی تعداد ۱۷۰ سے ۲۰۰ تک بتائی۔ مگر ملک میں قومی یکجہتی کے علمبردار پی-اے-سی کی بے گناہی کے جھوٹے گواہ۔

سرکاری طور پر نہر کی لاشوں پر گولیوں کے نشان ۱۹۰ ہلاکتوں کو تسلیم کئے جانے کا انتظامیہ کا احسان۔

گنگا نہر کے زخمیوں میں بچنے والا سترہ سالہ ذوالفقار ناصر بھی ہے۔ جس کے بیان کے مطابق چھ ٹرکوں میں مسلم نوجوانوں کو پی-اے-سی لے گئی ہر ٹرک پر ۳۵،۳۰ مسلمان تھے۔ یاسین اور اشرف کو اسی کے سامنے گولی ماری گئی اس کے بازو میں گولی لگی جس کو مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا پھر گولیاں چلتی رہیں لاشیں دریا میں گرتی رہیں۔

امنسٹی انٹرنیشنل نے مقتولین کی صحیح تعداد اور غیر جانبدارانہ تحقیقات کا مطالبہ کیا ہے۔

لندن میں بھی مظاہرے ہوئے اور امریکی اخبارات میں اشتہارات نکالکر امریکی عوام کو ہندستان میں مسلمانوں کے خون ناحق پر متوجہ کیا گیا ہے۔

نہ مدعی، نہ شہادت، حساب پاک ہوا
یہ خون مرد مسلماں تھا رزق خاک ہوا

[میرٹھ کے بعد] بڑودہ فساد کاشکار

۳۰/ اکتوبر سنہ ۱۹۸۲ء کی خبروں کے مطابق ۱۲ زخمی اور ایک ہلاک۔
فوج طلب۔ ۳/ نومبر سنہ ۱۹۸۲ء تک سات ہلاک۔
بڑودہ،ہمت نگر، اور گجرات کے دوسرے علاقوں کے بعد گوا پر بھی شب خون مارا گیا۔

پاناجی اور واسکوڈی گاما (گوا) میں بھی فساد پھوٹ پڑا اور بہت سی جھوپڑیاں جلادی گئیں۔

بڑودہ میں یہ فساد تقریباً دو ماہ تک چلا۔ ۲۰ / دسمبر سنہ ۱۹۸۲ء کو مرکزی وزیر داخلہ پی- سی- سیٹھی نے کہا۔ "(یقین دہانی کرائی (بڑودہ میں پائیدار امن کے لیے حکومت پوری کوشش کرے گی۔" انھوں نے مزید کہا کہ..... "اسباب کا تجزیہ مشکل ہے جن کی بنا پر جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔"

دو ماہ تک بڑودہ (گجرات) میں اور ۳۶ برسوں سے پورے ملک میں ہونے والے فسادات کا تجزیہ ہی نہ ہوسکا (لیکن سنہ ۱۹۸۳ء میں مرکزی سرکار نے ایک تجزیاتی رپورٹ چھاپ دی ہے جسکا ذکر آگے آئے گا۔) کہ فسادات کیوں ہوتے ہیں۔

ہندستان کی سائنسی ترقی

ہندستانی پولیس اور پی- اے- سی کے پاس ایسی حساس گولیاں ہیں جو سونگھتی ہوئی چلتی ہیں ہندوؤں کو چھوڑ کر صرف مسلمانوں کے سینوں کو چھلنی کرتی ہیں۔ سائنسی ترقی کے بھی کیا کرشمے ہیں۔!!!

قومی آواز ۶،۵/ نومبر سنہ ۱۹۸۲ء ۲۰/ دسمبر سنہ ۱۹۸۲ء ۲۱،۲۲،۲۳/ دسمبر سنہ ۱۹۸۲ء لکھنو ایڈیشن۔

بڑودہ کے اسپتال میں زخمی ہونے والے ایک لڑکے کے باپ نے ایک وزارتی گروپ سے بتایا کہ۔ "پہلے دو دنوں کے فساد میں پولیس خاموش تماشائی تھی جو ایک پولیس افسر کے تبادلہ سے شروع ہوئے۔ جس میں دس افراد ہلاک ہوئے۔"

پولیس اسوقت حرکت میں آتی ہے جب مسلمانوں کی طرف سے نقصان پہونچنے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔

بڑودہ کے فسادات کے بارے میں بعض مرکزی وزیروں کے بیانات ہم پچھلے صفحات میں بھی نقل کر چکے ہیں۔ پولیس اور پی-اے-سی نے ہمیشہ ہی مسلمانوں کو مارا ہے اور حکومت فسادات کا تجزیہ کرنے میں ناکام رہی ہے اور اگر کبھی تجزیہ ہوا تو مجرم مسلمانوں کو ہی ٹھہرایا گیا ہے!

گجرات میں فسادات کی نئی تکنیک

دہشت گردی کی روک تھام کے لیے ۱۸/ مئی سنہ ۱۹۸۵ء کو پارلیمنٹ میں بل پیش کیا گیا۔ اس کے مطابق سزائے موت، پانچ سال کی سزا، یا اس جرم پر اکسانے والوں کو تین سال کی سزا یا عمر قید کی سزا دی جائے گی۔

۲۴/ مئی سنہ ۱۹۸۵ء کو صدر جمہوریہ کے دستخط کے بعد انسداد دہشت گردی بل پاس ہو گیا۔ اس بل کا نفاذ جموں کشمیر پر تو ہوگا لیکن آسام اور گجرات میں نہیں ہوگا۔ گجرات جہاں ۲۴/ مئی تک فساد میں ۱۲۴ اموات ہو چکی ہیں۔

گجرات کے فساد کی خوبی یہ ہے کہ دنیا یہ سمجھ رہی ہے کہ یہ جھگڑا گروہی ہے۔ اور اونچی ذات و نیچی ذات کے ہندوؤں کی لڑائی ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں ریزرویشن کیلئے اصل لڑائی یہی ہے لیکن جانی اور مالی نقصان مسلمانوں کو پہونچایا جا رہا ہے۔ فساد کی نئی

تکنیک استعمال کی جارہی ہے۔ اس جھگڑے کے آڑ میں مارا جاتا رہا ہے مسلمانوں کو!

صوبہ گجرات میں ریزرویشن کے لیے چلنے والی تحریک نے لوٹ مار اور قتل و غارت گری کی شکل اختیار کرلی۔ بینک جلے، ٹیلیفون، بجلی کے کھمبے، لکڑی کی دوکانیں اور پختہ دوکانوں کو نشانہ بنایا گیا۔ آگ لگانے کے بارہ، بلوہ اور فساد کے اٹھارہ اور پتھراؤ کے اکیس واقعات ایک دن میں سورت کے علاقہ میں ہوئے۔

ناڈیاڈ شہر میں کھادی کا بڑا ذخیرہ جلایا گیا، گرام ادیوگ (دیہی صنعت) کے گوداموں میں آگ لگائی گئی۔ باردولی میں ایک جیپ جلی، ضلع کھیدیا کے ناڈیاڈ تعلقہ کے قریب گروہی تصادم میں تین ہلاک ہوئے۔

وزیراعلیٰ نے کہا حالات جلد ہی ٹھیک ہوجائیں گے۔

ہندستان میں ایک ہی راستہ ہے کہ ہر تحریک کا رخ مسلمانوں کے خلاف موڑ دو اصل تحریک ختم ہوجائے گی سب مسلمانوں کو مٹنے پر لگ جائیں گے یا خاموش ہوجائیں یا اردو اخبار میں مسلمانوں کے لیے بیانات دیں گے ہندی اور انگریزی اخبارات میں جو مسلمانوں کی زبان نہیں ہے دوسری بات کہیں گے۔

۲۲ / مارچ سنہ ۱۹۸۵ ءتک ریزرویشن تحریک فرقہ وارانہ بن گئی اصل مسئلہ پیچھے چلا گیا لیکن مسلمانوں کا قتل عام جاری ہے۔ ۲۳ / مارچ کو مرکزی وزیرداخلہ ایس- بی -چوان نے گجرات کا دورہ کیا۔ مگر قتل و غارت گری جاری۔ دریاپور سے فساد شروع ہوا۔ کرفیو کے باوجود چھرے بازی کی پانچ واردات ہوئیں۔

مسلم ممبران پارلیمنٹ نے وزیراعظم سے فساد زدہ علاقوں کے کے دورہ کی اپیل کی۔

۲۱ / مارچ کو وزیرداخلہ نے راجیہ سبھا میں اعتراف کیا کہ گجرات میں ریزرویشن مخالف تحریک نے سخت ہندو مسلم دنگوں کی شکل اختیار کرلی۔ پرانے شہر احمد آباد میں آتش زنی کے چھ واقعات ہوئے لیکن پولیس نے فائرنگ نہیں کی اسلئے کہ یہ ہندو کر رہے تھے۔ کرفیو زدہ علاقہ شاہ پور میں ایک سہ منزلہ عمارت کی چھت پر ایک لڑکی کی سڑی ہوئی لاش ملی جس کے سینہ پر گولی کا نشان تھا۔

اس قتل و غارت گری کے باوجود وزیر داخلہ نے ۲۵ / اپریل کو اعلان کیا کہ گجرات کے معاملات میں مرکز مداخلت نہیں کرے گا مگر پنجاب میں کرے گا، کشمیر میں کرے گا۔

فوج کی موجودگی کے باوجود احمد آباد میں خونریزی۔ کرفیو اور فوجی گشت کے باوجود ۲۴ / اپریل کو بڑے پیمانہ پر قتل و غارت گری، بے شمار مکانات نذر آتش اور دوکانیں خاکستر۔ گجرات کا تیسرا شہر بھاؤنگر بھی لوٹ مار اور آتش زنی کا شکار۔ ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے تین راؤنڈ گولی چلی زخمی ایک نہیں۔ احمد آباد اور جام نگر پہلے فسادات کی لپیٹ میں تھے۔ بھاؤنگر میں گولیاں چلتی رہیں ہجوم نے ۲۹ تانگوں، دو میدہ ملوں ، ۱۳ ٹیکسیوں اور سات رکشا اسکوٹروں کے علاوہ ایک عمارت کو بھی جلا ڈالا۔

ان فسادات نے ۲۰ / مئی سنہ ۱۹۸۵ء تک ۱۱۲ کی جانیں لیں۔

شمالی گجرات کے ندیا میں بھی تیزاب بلب اور جلتے کمبل پھینکے گئے۔

فساد کی اس نئی تکنیک کو قومی پریس نے نہایت ہوشیاری سے چھپانے کی کوشش کی اور مسلم دشمنی میں اپنے اوپر پولیس کے ہاتھوں ہونے والے ظلم کو بھی جھیل گئے۔ لیکن خون ناحق کہاں تک چھپتا آخر ایلسٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا اور ہیرالڈ ٹریبون نے ہمت کر کے لکھا کہ اس تحریک کی آڑ میں مسلمانوں کو مارا جا رہا ہے۔ ان کی رپورٹ یہ ہے کہ ریزرویشن مخالف تحریک کے سلسلہ میں جو بدترین قتل و غارت گری ہوئی وہ باپو نگر (احمد آباد) میں جہاں زیادہ تر مسلمانوں کی آبادی ہے۔ رکھیال کے علاقہ میں ہندو پٹیل برادری کا مسلمانوں پر غصہ اس لیے تھا کہ مسلمان اونچی ذات کے ہندوؤں کے ساتھ ملکر ہریجنوں کو کیوں نہیں مار رہے ہیں۔ رکھیال میں ہریجنوں کے خلاف ہونے والے تشدد میں جب مسلمانوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا بلکہ اکثر جگہوں پر مسلمان مظلوم ہریجنوں کی مدد کے لیے کھڑے ہو گئے تو اونچی ذات کے ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے۔ ہندستان کے ہر شہر میں ہریجنوں کی آبادیاں مسلم محلوں کے ساتھ ہیں اسلئے کہ اونچی ذات کے ہندوؤں نے کبھی انھیں اپنے ساتھ آباد نہیں ہونے دیا۔ لیکن مراد آباد کے سنہ ۱۹۸۰ء کے فساد میں انھیں ہریجنوں خاص کر مہتروں نے مسلمانوں پر حملے کئے۔

اونچی ذات کے ہندووں نے گاؤں گاؤں بڑے سلیقہ سے آبادکاری کی تھی آج بھی دیہاتوں میں اسکو دیکھا جاسکتا ہے۔ مشرق، مغرب اور شمال کی سمت اونچی ذات کے ہندو آباد کئے گئے اور جنوب کی سمت نیچی ذات ہریجن وغیرہ تاکہ ان کے جسم سے لگی ہوئی ہوا بھی اونچی ذات والوں کے نہ لگے۔ کوئی بھی بین الاقوامی ایجنسی کسی بھی گاؤں میں جاکر ہندو لیڈروں کی وسیع النظری، رواداری اور پرانی تہذیب کی شاندار روایات کو دیکھ سکتی ہے۔

۱۸ / مارچ سنہ ۱۹۸۵ء کو اونچی ذات کے ہندووں نے مسلمانوں پر اسوقت حملے شروع کئے جب ریزرویشن مخالف تحریک میں وہ ان کے ساتھ شریک نہیں ہوئے۔ ہڑتال میں حصہ نہیں لیا اور کمزور ہریجنوں کی حفاظت کے لیے کھڑے ہوگئے اور اپنے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کے مطابق کہ اگر زمین پر ظلم ہو رہا ہے تو طاقت ہو تو ہاتھ سے روک دو ورنہ زبان سے ظلم کو ظلم کہو۔ یہاں مسلمانوں نے ہاتھ کا استعمال بھی کیا اور زبان بھی اور ایمان کی پہلی اور دوسری سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر ظلم کے خلاف اپنے کو برباد کرلیا اور ہنستے کھیلتے شافع محشر کا میدان حشر میں دیدار کرنے کیلئے سر نہ جھکا کر سروں کو کٹاتے چلے گئے۔

عجیب مزاج ہے ہندو قوم کے سربرآوردہ لوگوں کا ۲۳ / اپریل سنہ ۱۹۸۵ء کو ایک مصالحتی میٹنگ بلائی اور مسلمانوں پر حملہ کردیا وہاں پولیس تو تھی نہیں لہٰذا مسلم نوجوانوں نے اس حملہ کو پسپا کردیا۔ اب پوری تیاری اور سرکاری تحفظ کے ساتھ اسی دن ۶ بجے شام کو مسلمانوں پر ہندووں کی طرف سے حملہ ہوا۔ جو پوری رات جاری رہا۔ اندرا غریب نگر (احمد آباد) کی بستی میں C.R.P کی موجودگی میں اور S.R.P نے خود مسلمانوں پر بلوائیوں کے ساتھ گولیاں چلائیں۔ غیر سرکاری اطلاع کے مطابق سو مسلمان شہید ہوئے۔ جب فوج پہونچی تو یہ حملہ رُک گیا۔ حسین احمد جو بلاک ۱۶ کا باشندہ ہے جسکو پولیس نے گرفتار کیا وہ عینی شاہد ہے ان تمام واقعات کا اس نے پولیس انسپکٹر مسمی رانا، مسمی گوئل، مسمی پٹیل اور یادو (یادو کا تعلق پس ماندہ ذات سے ہے) کے براہ راست فساد میں شریک ہونے کی بات کہی۔ جو لوگ زندہ بچ رہے انھوں نے مسلمانوں پر گولیاں چلانے

والوں کے نام بتائے جیسے ڈاکٹر بھاگی رتھ آریہ، اور ان کے دونوں بیٹے، دنیش اور پردیپ ہجوم کی قیادت کرنے والوں میں مسمی ترشول، میگھ سنگھ، رام اوتار اور دھیرو بھائی قابل ذکر ہیں۔ یہ سب لوگ آنند فلیٹ کے باشندہ ہیں۔

امن چوک میں دو ہزار مسلمان امدادی کیمپ میں پہونچے یہ وہ تھے جو قتل سے بچ رہے تھے۔ ملبے سے فوج کے جوانوں نے آٹھ مسلمانوں کی لاشیں نکالیں۔ ان میں ایک شہید نے اپنے پاجامہ پر پولیس کی گاڑی کا نمبر نوٹ کرلیا تھا۔ کیا ہوش و ہواس و شان شہادت ہے G.T.M 586

غنچہ اک گریہ خنداں ہے کسے تھا یہ گماں
نغمہ اک خندہ گریاں ہے یہ معلوم نہ تھا

تمام رات شہر جلتا رہا۔ ہیرالڈ ریویو کے مطابق اندرا غریب نگر اور باپو نگر کی مسلم آبادی پر پولیس اور غنڈوں نے حملہ کیا۔ یہ پولیس کی چار گاڑیوں پر پہونچے تھے۔ یہ حملہ رات ۲:۴۵ منٹ پر شروع ہوا۔ مکانوں اور دوکانوں کو جلانے کے لیے پولیس کی گاڑیوں کا تیل استعمال کیا گیا۔ اکثر کو زندہ جلادیا گیا۔ ابید کر کی صنعتی بستی پر حملہ کرکے دو سو مکانوں کو نذر آتش کیا گیا۔ احمد آباد کے اخبارات نے باپو نگر پر حملہ اور قتل و غارت گری کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ باپو نگر کالونی مسلم کالونی ہے۔

۱۸ / مارچ سنہ ۱۹۸۵ء کو احمد آباد میں تشدد کی شروعات کیسے ہوئی اسکی معقول وجہ مرکزی اور صوبائی سرکاریں نہ بتا سکیں۔ بات یہ نہیں ہے کہ فساد دریاپور سے شروع ہوا۔ دریاپور تو حساس علاقہ ہے ہی پولیس کے ریکارڈ میں۔ اور گذشتہ کئی برسوں سے وہاں ایس۔ آر۔ پی کا ایک دستہ مامور ہے۔ اس کے باوجود وہاں سے فساد کیسے شروع ہوا؟ دریاپور اور کالوپور سے فساد شاہ پور ریلیف روڈ، جمال پور، دہلی گیٹ اور تین دروازہ محلوں تک پھیلنے میں چند گھنٹے لگے۔ اصل سوال یہ ہے کہ ریزرویشن مخالف تحریک جسکا تعلق اونچی ذات کے ہندؤں سے تھا۔ پولیس کی سربراہی میں مسلمانوں کے خلاف قتل و غارت گری کی طرف کیسے مڑ گئی؟

خیال رہے کہ ۲۱/اپریل کو شاید کرفیو اس لیے ہٹایا گیا تھا تاکہ بلوائیوں کو یکجا ہونے کا موقع مل جائے ۲۲/کی رات کو ۱۱ بجے عائشہ بیگم نے (جو گجرات کی سابق وزیر تعلیم تھیں) وزیر داخلہ امر سنگھ چودھری کو ٹیلی فون کیا۔ وزیر صاحب نے کہا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں اپنے وقت پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

منصوبہ کے مطابق جب آنند فلیٹز سے پتھراؤ شروع ہوا تو پیچھے میدان میں مسجد کے قریب پولیس نے پوزیشن سنبھال لی۔ باقی رستوں سے بھیا رام لال پہلوان کی سربراہی میں بلوائیوں کے جتھے جمع ہونے لگے۔ سنہ ۱۹۶۹ء کے بلوؤں میں بھی اس شخص نے اہم رول ادا کیا تھا۔ رام لال پہلوان کے مقامی کانگریس (ا) لیڈروں سے قریبی تعلقات ہیں۔ کانگریس (ا) کے کارپوریٹر راجیندر راجل ان میں اہم ترین آدمی ہے۔

رام لال اس بستی کا غنڈہ ہے اور زمینوں پر قبضہ کر کے مکان بنواتا ہے۔ کانگریس کے مقامی لیڈروں سے اس کو مدد ملتی ہے جس کی وجہ سے پولیس بھی نہیں بولتی۔ فساد کے زمانہ میں ان آباد زمینوں پر قبضہ کا بہترین موقع ملتا ہے جو غریب مسلمانوں نے بڑی جانفشانی سے اپنے سر چھپانے کے لیے آباد کی تھیں۔

راجیو گاندھی کے آنے کے بعد کانگریس (ا) پر غنڈہ عناصر کے اثرات زیادہ بڑھ گئے ہیں ایک ہندی کہاوت (یا لوک کہاوت ہے) سوما سور (اندھا سو میں) ہزاراں کانا (کانا کہیں ہزار میں ایک) آدھے سگر میں کھینچا تانا (آدھی دنیا میں ٹیڑھی آنکھ والا) اور کھینچا تانا کہے پکار۔ کنجے سے رہیو ہشیار۔ اور کنجا کہے سن مُرا بھائی منہ چپے کے بلی بلی جائی (منہ چپے کے قربان جاوں)۔

تو راجیو گاندھی ہیں منہ چپے۔

گجرات کے بڑے شہروں خاص کر احمد آباد میں مجرمانہ پیشوں پر اونچی ذات کے ہندو پٹیل قابض ہیں۔ مسلمان اور ہریجن نچلی سطح پر اپنی معاشی بدحالی سے مجبور ہو کر کام کرتے ہیں۔ احمد آباد میں شراب، نشیلی اشیاء، اور جوئے کے اڈوں کے اصل مالک یہی ہندو پٹیل ہیں۔ لیکن ان کو چلانے کے لیے فاقہ مست مسلمانوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس

طرح پولیس سے براہ راست ٹکراؤ مسلمانوں کا ہوتا ہے۔ اور پولیس سب کچھ جانتے ہوئے مسلمانوں کو اصل مجرم بنا کر پیش کرتی ہے۔ مگر سازشی پٹیل برادری کے ہندؤں سے نہیں بولتی لیکن جندا کی سازشی حرکتوں پر اس کے سر پر ایک لاکھ کا انعام رکھ دیتی ہے۔

بہرحال پھر آنند فلیٹز کی طرف آتے ہیں۔ سارے بھاگنے کے راستے مسلمانوں کے لیے بند کر دیئے گئے۔ پولیس کی گولیوں سے ۱۸ مسلمان شہید میدان کی طرف شہید ہو گئے۔ جن میں ڈاکٹر شمس الدین بھی تھے جن کی لاش کو جلا ڈالا گیا دو گھنٹہ میں چھ ہزار مسلمان خانما برباد ہو گئے۔ جن کو امن چوک کے ریلیف کیمپ میں پناہ ملی۔ پانچ سو مکانات تباہ کئے گئے۔ عینی شہادتوں کے باوجود قاتلان مسلمانان احمد آباد کو گرفتار نہیں کیا گیا۔ وزیراعلیٰ گجرات نے کچھ نرمی برتی تھی مسلمانوں کو پٹوانے میں اسلئے اسی وقت ان کو عملاً بے اثر کر کے وزیرداخلہ امر سنگھ چودھری کو ہی اختیارات دے دیئے گئے تھے۔ بعد میں انھیں ہٹا کر مسلمانوں کو بے دریغ قتل کرانے کے انعام میں وزیرداخلہ کو وزیراعلیٰ گجرات بنا دیا گیا۔

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ دست و ناخن قاتل نہ آستیں پہ نشاں
نہ رزم گاہ میں برسا کر معتبر ہوتا
کسی علم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا

سنہ ۱۹۶۹ء سے سنہ ۱۹۸۷ء تک گجرات کا صوبہ مسلمانوں کی خون آشامی میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ اور اب سنہ ۱۹۹۴ء کی جنوری میں بھی وہی حال ہے۔

ٹانڈہ۔۔۔ ضلع فیض آباد میں کیا ہوا؟

۱۶/اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء کو درگا پوجا اور محرم کے رسومات کی وجہ سے ماحول کشیدہ تھا۔ اور یہ بات انتظامیہ ضلع فیض آباد کے علم میں تھی۔ جس کی وجہ سے قصبہ ٹانڈہ میں پی۔اے۔سی تعینات کردی گئی۔ اسی دن شام کو سرکل افسر (سی۔او) ٹانڈہ اور ایس۔ڈی۔ایم ٹانڈہ نے ۳۱ ہندو بلوائیوں کو جو باہر سے آئے تھے گرفتار کرلیا۔ لیکن ۱۷/اکتوبر کو ان بلوائیوں کو سرکاری گاڑی سے ٹانڈہ عزت کے ساتھ پہونچا دیا گیا۔ جو مقامی ممبر اسمبلی کی مدد سے ہوا اور اسی کے دباؤ سے ان دونوں افسروں کا بلوائیوں کی گرفتاری کے جرم میں تبادلہ کردیا گیا۔ اور اب باہر سے مسلح افراد کا بے روک ٹوک قصبہ میں داخلہ شروع ہوگیا۔ اسی دن قصبہ میں تعینات پی۔اے۔سی کو بھی واپس بلالیا گیا۔ اور پولیس سپرنٹنڈنٹ بھی واپس چلے گئے۔ ضلع انتظامیہ نے حالات کی سنگینی کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں۔ ۱۷/اکتوبر کی رات سے ہنگامے شروع ہوگئے۔ پولیس کھڑی دیکھتی رہی۔ اور اس طرح ۱۸/اکتوبر کو سویرے سے بھرپور فسادات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور باہر سے آئے ہوئے حملہ آوروں نے دھاوا بول دیا اور قصبہ کے کنارے کی آبادی کو لوٹا، برباد کیا اور نذر آتش کردیا۔ جس میں بیس جانیں گئیں اور ۱۰۰ مکانات جلائے گئے۔ لیکن مقامی پولیس نے مسلمانوں کی طرف سے لکھائی جانے والی ابتدائی رپورٹیں تک درج نہیں کیں اور یہی نہیں جو افراد اس فساد میں شہید کئے گئے تھے ان کے اہل خاندان کو الٹے گرفتار کرنا شروع کردیا گیا اور جھوٹے مقدمات میں پھانسا جانے لگا۔ مثلاً نصیرالدین جو بلوے میں مارے گئے ان کے بھائی اور لڑکوں کو الٹے گرفتار بھی کیا گیا اور جیل بھیج دیا گیا۔ مسلمانوں ہی کا جانی ومالی نقصان ہوا اور انھیں کو جھوٹے مقدمات میں پھانسا گیا۔

شہید ہونے والوں کے اسمائے گرامی:-

(۱) نصیر الدین مرحوم ولد محمد الدین محلہ سکراول۔ ٹانڈہ ضلع فیض آباد
(۲) سید آفاق احمد ولد محمد اطہر محلہ کشمریا ٹانڈہ ضلع فیض آباد
(۳) رجب علی ولد رضی شاہ محلہ آسوپور ٹانڈہ ضلع فیض آباد
(۴) مراد علی ولد مان شاہ محلہ آسوپور ٹانڈہ ضلع فیض آباد
(۵) رفیع محمد ولد شکور شاہ محلہ آسوپور ٹانڈہ ضلع فیض آباد
(٦) محترمہ کنیز فاطمہ بیوہ عبد اللطیف محلہ کشمریا، ٹانڈہ ضلع فیض آباد۔
(۷) سید دلشاد حسین ولد توکل حسین محلہ راٹھ حویلی، ٹانڈہ ضلع فیض آباد۔
(۸) اکبر علی ولد روشن محلہ علی گنج، ٹانڈہ ضلع فیض آباد۔
(۹) نوشاد احمد انصاری ولد قمر الدین محلہ سکراول، دکنی دروازہ ضلع بستی۔
(۱۰) سراج احمد انصاری ولد قمر الدین باہر سے آئے ہوئے تھے، مقیم ٹانڈہ ضلع فیض آباد۔
(۱۱) اسرائیل عرف چھیدا ولد محمد اشرف محلہ علی گنج، ٹانڈہ ضلع فیض آباد۔
(۱۲) عبد الخالق صفائی مزدور ولد جمن ٹانڈہ میونسپلٹی میران پورہ، ٹانڈہ ضلع فیض آباد۔
(۱۳) سمیع اللہ ولد عبد الخالق میران پورہ، ٹانڈہ ضلع فیض آباد۔
(۱۴) بی۔ بی۔ شکیلہ ولد عبد الخالق میران پورہ، ٹانڈہ ضلع فیض آباد۔
(۱۵) رحم علی مرحوم ولد پتہ نہیں محلہ مرغی پورہ، ٹانڈہ ضلع فیض آباد۔
(۱٦) محمد تقی ولد ستن محلہ مبارک پور، ٹانڈہ ضلع فیض آباد۔
(۱۷) عبد اللہ شاہ ولد پتہ نہیں محلہ تکیہ کیدار شہید سکراول، ٹانڈہ ضلع فیض آباد۔
(۱۸) مولوی وصی اللہ ولد پتہ نہیں محلہ مدرسہ انور العلوم بھوے پور، ٹانڈہ ضلع فیض آباد۔
(۲۰) دو طالب علم .... مدرسہ انور العلوم بھوے پور، ٹانڈہ فیض آباد۔

زخم کو پھول تو صر صر کو صبا کہتے ہیں،
جانے کیا دور ہے کیا لوگ ہیں، کیا کہتے ہیں؟

ناانڈہ میں بہتر (۷۲) گھنٹہ تک کرفیو جاری رہا۔ تقریبا ساٹھ گھنٹوں کے دوران مسلم محلوں میں کھانے کا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا بوڑھے اور بچے بھوک سے بے قرار تھے۔ اسی (۸۰) گھنٹوں کے بعد صحافیوں کا ایک گروہ جب وہاں ڈبل روٹی وغیرہ لیکر پہونچا تو لوگ ٹوٹ پڑے۔ فساد ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت عمل میں آیا۔ انتظامیہ اور سیاسی پارٹیاں سب اس میں برابر کی شریک تھیں۔ قصبہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اسی لیے ان کو برباد کرنے کے لیے باہر سے آدمی بلائے گئے تھے ڈیڑھ دو سو کلومیٹر تک کے فاصلہ سے فرقہ پرستوں کے جرائم پیشہ افراد ناانڈہ کو لوٹنے اور جلانے کے لیے آئے لیکن وہ ابتدائی لمحات جن میں وہ اپنا مقصد پورا کر سکتے تھے دو افسروں کی نادانی سے ضائع ہو گئے اور اسی غصہ میں سیاسی دباؤ ڈلوا کر سویرے ہی ان کا تبادلہ کروادیا گیا اور ان فرقہ پرستوں کے جتھوں کو سرکاری گاڑیوں سے موقع پر پہونچا دیا گیا۔ اس بیچ قصبہ کے مسلمانوں نے بھی اپنے دفاع کی تیاریاں مکمل کر لیں اور اندر کی ہندو آبادی اس سے بے تعلق ہو گئی نتیجہ میں قصبہ کے اندر یہ بلوائی مسلمانوں کا کچھ بگاڑ نہ سکے لیکن کنارے کے سارے مکانوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔

افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ مقامی ممبر اسمبلی لوک دل گوپی ناتھ ورما بلوائیوں کے جلوس کی رہنمائی کر رہے تھے۔ باہر سے دوڑ دھوپ کر کے ممبر اسمبلی اترپردیش تقریباً چھ ہزار آدمیوں کو لائے تھے۔ اسی مجمع نے مسلمانوں کے مکانوں کو جلایا لوٹا اور قتل کیا اور اسی ممبر اسمبلی کے دباؤ پر جسکا تعلق حزب اختلاف کے لوک دل گروپ سے تھا اور انتظامیہ کانگریس (ا) کی غلام، دو فرض شناس افسروں کا فوری تبادلہ عمل میں آگیا اور حزب اقتدار و حزب اختلاف اس مسئلہ پر باہم شیروشکر ہو جایا کرتے ہیں۔

۱۸/۱ اکتوبر کو قصبہ سے پچپن (۵۵) کلومیٹر دور فیض آباد (ضلع ہیڈکوارٹر پر) میں "بند" کا نعرہ دیا گیا اور جلسہ عام میں مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کو اکسایا گیا لیکن نہ تو

کسی کو گرفتار کیا گیا نہ گولی چلائی گئی۔ ٹانڈہ سے فیض آباد، گونڈہ، گورکھپور اور بہرائچ جانے والی سڑکوں پر رکاوٹ کھڑی کردی گئی اور شاہراہوں پر کئی گھنٹوں تک سیاسی غنڈوں کا قبضہ رہا۔ اور ضلع انتظامیہ خاموش تماشائی بنی رہی لیکن بہرائچ میں مسلمانوں کے احتجاجی جلسہ پر گولیاں برسادی گئیں۔

رُخِ نگار زندگی نقاب در نقاب ہے
نہ ہوگا ختم سلسلہ مگر نقاب اٹھائے جا

مسلم مجلس کی رپورٹ کے مطابق بیس آدمیوں کو قتل کیا گیا۔ لیکن سرکار چار آدمیوں کی موت سے زیادہ اقرار نہیں کرتی۔ ۲۷/ نومبر سنہ ۱۹۸۳ء کو وزیراعلیٰ اترپردیش نے ٹانڈہ کا دورہ کیا اور وہاں کہا سب ٹھیک ہے۔ پولیس بھی اچھی پی-اے-سی بھی اچھی، ہندو بھی اچھے مسلمان بھی اچھے۔ پاگلوں نے دنگا کروادیا۔ تھانہ ٹانڈہ کے انچارج کے مطالبہ پر اسے فیض آباد سپرنٹنڈنٹ پولیس کا پیش کار، بنادیا گیا۔ اب ساری درخواستیں اسی کے توسل سے پہونچیں گی جن کو مناسب سمجھے گا پیش کرے گا باقی کو دبا دے گا یا نوچ دے گا۔ اس طرح کے واقعات پورے ملک میں ہور ہے ہیں۔

بلوائیوں کو گرفتار کرنے والے افسروں کے فوری تبادلہ کے بعد وہ کون افسر ہوگا جو انصاف کرسکے گا؟ اسلئے کہ اسے فوراً مجرم قرار دیکر ہٹا دیا جائے گا۔ باقی جرائم پیشہ گروہ جوں کا توں برقرار رکھا جائے گا۔

حکام مجرموں کے ہیں دامن سئے ہوئے — سی-آئی[1]-ڈی ہے بادہ غفلت پئے ہوئے
داروغہ جی ہیں قول بدون کو دیئے ہوئے — چوروں سے کوتوال ہے سازش کئے ہوئے
لچھمن کا دل ہے شدت غم سے پھٹا ہوا
دربر ہے رام چندر کے راون ڈٹا ہوا

---

[1] بھارت کا خفیہ محکمہ۔

بہرائچ کا پولیس ایکشن

فساد کا نیا طریقہ:- بہرائچ کا شہر نیپال کی سرحد پر ہندستان کے صوبہ اتر پردیش کا آخری شہر ہے۔ اس کے بعد نیپال کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ شہدائے اسلام کا عظیم الشان مرکز اور ہندستان میں اسلام کی مجاھدانہ عظمتوں کا نشان ہے۔ تقریباً ایک ہزار برس تک سلاطین دہلی کی توجہ کا بھی مرکز رہا ہے۔ محمد تغلق نے بھی اس شہید اعظم کے مقبرہ کی زیارت کی ہے۔ التمش کے بیٹے ناصرالدین شاہ نے اس روضہ میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ فیروز شاہ تغلق اپنی والدہ کے ساتھ سید سالار مسعود غازی کی زیارت کیلئے تشریف بہرائچ لایا۔ ۱۰/ جون سنہ ۱۰۳۴ء میں سید سالار مسعود غازی یہاں کے راجاؤں کے ظلم کے خلاف مظلوموں کی مدد کیلئے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ آجتک ان تاریخوں میں ہر سال لاکھوں آدمی ان کے مزار اقدس پر جمع ہو کر نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں "اللہ کی راہ میں مارے جانے والوں کو مردہ نہ کہو" کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

اس عظیم شہر سے مجھے بھی اتر پردیش اسمبلی کا ممبر ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔

فرقہ پرست ضلع انتظامیہ نے امن کے اس شہر کو بھی اپنی بربریت کا نشانہ بنانے سے دریغ نہ کیا اور ۲۵/ اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء کو سویرے ۸ بجے اس شہر کے مسلمانوں پر پولیس ایکشن کر کے قتل و دہشت گردی کا بازار گرم کر دیا۔ یہاں بالکل نیا ڈھنگ اختیار کیا گیا۔ اور پولیس نے اپنی دو ماہ پرانی شکست کا بدلہ مسلمانوں سے لے لیا۔ اگست سنہ ۱۹۸۳ء کے تیسرے ہفتہ میں بہرائچ پولیس کی تحویل میں ایک شخص انیس انصاری کی ضربات پیہم سے موت واقع ہو گئی اس معاملہ میں ایک مقامی مسلمان وکیل نظام الدین خاں مرحوم نے پولیس کے خلاف عدالتی کاروائی کی جس کے نتیجہ میں ایک پولیس افسر معطل کر دیا گیا۔ جس پر سپرنٹنڈنٹ پولیس بہرائچ نے ان کے خلاف انتقامی کاروائی

کرنے کا اعلان کرتے ہوئے ان سے کہا کہ میں تم کو دیکھ لوں گا۔ مسٹر تم اس علاقہ کے فرقہ پرست نمبر اول ہو۔ اور تمھاری فائل مرکزی سرکار تک موجود ہے۔

اس واقعہ کو سامنے رکھ کر بہرائچ کے ۲۵/ ۱ کتوبر کے پولیس ایکشن کو دیکھیں تو تہہ بہ تہہ واقعات پر سے پردے اٹھتے جائیں گے اور اصل حقیقت سامنے آجائے گی۔

اگر چہ موجودہ واقعہ کا تعلق مسجد کی ایک چھوٹی سی زمین سے ہے جس پر مسجد کے متولی دکان یا دو کانیں بنوانا چاہتے تھے۔ جس میں ایک دوکان کا امیدوار ایک غیر مسلم بھی تھا لیکن جب اسے متولی کی طرف سے اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس نے دو کانیں بنوانے کے عمل کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ مسجد کی طرف سے مقدمہ کی پیروی بی۔ پی۔ سنگھ کاکا ایڈوکیٹ نے کی (بہرائچ میں وقف کے مقدمات وہی دیکھتے ہیں) اور ہائی کورٹ سے مسجد کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔ مسجد اور لب سڑک کنواں راجہ صاحب نانپارہ (ضلع بہرائچ) نے بنوا کر مسجد کے لیے وقف کر دیا تھا۔ مقدمہ جیتنے کے بعد اس پر دوکانوں کا نقشہ پاس ہوا۔ لیکن متولی صاحب نے پاس نقشہ کے خلاف چار فٹ آگے بڑھا کر بنیاد رکھی۔ جس پر پھر جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ اور اب مقدمہ دائر کرنے والے شخص کی سازش سے کنویں کی جگت پر پتھر رکھ کر پوجا شروع کروادی گئی۔ اور اس کے بعد اسی دن پولیس آئی اور پتھر جس تیزی سے رکھے گئے تھے اتنی ہی تیزی سے غائب کر دیئے گئے۔

اب یہاں سے جو افسوس ناک پہلو شروع ہوتا ہے وہ یہ کہ پورے شہر میں کوئی ایک مسلمان کھڑا نہیں ہوا جو کہتا کہ اگر بال برابر بھی ناجائز زمین مسجد کے حق میں استعمال کی گئی تو از روئے شریعت وہ حرام ہے۔ غم اسکا ہے کہ مسلمانوں سے شریفانہ قدریں رخصت ہوتی جارہی ہیں۔ دوسری طرف کوئی ہندو بھی نہیں کھڑا ہوا جو یہ کہتا کہ یہاں "شیولنگ" کبھی نہیں تھا اور جو نہیں تھا وہ نہیں ہوگا۔ اور اس طرح ۲۱/ ۱ کتوبر سنہ ۱۹۸۳ کی رات کو پولیس کی موجودگی میں جس طرح دن کی روشنی میں پتھر ہٹے تھے رات کی تاریکی میں منصوبہ بند ڈھنگ سے پھر رکھ دیئے گئے۔ اور ایک منصف جو زیر تبادلہ تھے اس سے پچھلی تاریخ میں حکم امتناعی بھی حاصل کر لیا گیا کہ شیولنگ اپنی جگہ سے ہٹایا

نہیں جاسکتا۔

۲۲/ اکتوبر کو فجر کی نماز میں جب مسلمان پہونچے تو پوجا (عبادت) ہو رہی تھی۔ اس کی اطلاع دسٹرکٹ مجسٹریٹ (ڈی-ایم) کو دی گئی۔ وہ ۲۴/ اکتوبر تک ہاں، نہیں میں الجھے رہے اور قوت فیصلہ کے فقدان کا شکار ہو گئے۔ ۲۴/ اکتوبر کو ۷ بجے شام کو مسلمانوں کے ایک وفد سے ڈی-ایم نے یہ کہا کہ کل سویرے پتھر ہٹا دیئے جائیں گے۔ اسی روز رات کو جب اس وفد کے لیڈر ملی کمپلکس (ایک عمارت) میں ضلع انتظامیہ سے ہونے والی بات سنا رہے تھے تو ۹ بجے کے قریب ایس-ڈی-ایم بہرائچ نے وہاں پہونچکر اس مجمع میں کہا کہ ڈی-ایم صاحب نے جو بات ابھی دو گھنٹہ قبل شہریوں کے وفد سے شیولنگ ہٹانے کی کہی تھی وہ قطعی نہیں ہے اسلئے کو انھوں نے قانونی مشیر سے مشورہ کیا تو اس کا کہنا ہے کہ ایسا کرنے پر توہین عدالت کا مقدمہ ان پر چل جائے گا۔ یہ سنکر وفد کے لوگوں نے کہا.... "کل سویرے گھنٹہ گھر میں جمع ہو کر ہم گرفتاریاں دیں گے آپ کلکٹر صاحب کو بتا دیں۔"

رات میں گیارہ بجے کے قریب انتظامیہ نے مسلمانوں کے ایک دوسرے گروپ کو جو اس مسئلہ میں دلچسپی رکھتا تھا۔ کلکٹر صاحب کے یہاں طلب کیا گیا۔ اس سے ڈی-ایم نے پھر کہا کہ کل سویرے یعنی ۲۵/ اکتوبر کو ۹ بجے ہم پنچایت کر کے اس کا فیصلہ کریں گے۔

وکیل صاحب کو اس فیصلہ کی اطلاع نہیں دی گئی۔ نہ اس گروپ سے کہا کہ گھنٹہ گھر میں گرفتاری کا پروگرام ملتوی کر دیں اور ۹ بجے تک دیکھیں کلکٹر کیا کرتے ہیں۔ وکیل موصوف سویرے، ۷ بجے گھنٹہ گھر میں آگئے۔ اور تین چار سو دوسرے لوگ بھی۔ انھوں نے گرفتاری دینے والوں کے ہاتھ اٹھوائے اور فہرست تیار کرنے لگے۔ قریب ۸ بجے وہی ایس-ڈی-ایم جس نے گذشتہ رات میں ڈی-ایم کے فیصلہ کی منسوخی کی اطلاع دی تھی پولیس کے ساتھ آگئے اور آتے ہی لاٹھی چارج شروع کروا دیا۔ گھنٹہ گھر کے اسٹیج پر لاٹھیاں برسنے لگیں۔ یہ دیکھ کر جو مجمع اِدھر اُدھر ہو گیا تھا اس نے پولیس پر پتھراؤ کر دیا

۔ بس فوراً ہی گولیاں چلنے لگیں دو آدمی موقع پر ہلاک ہو گئے. ایک نابینا کے پیٹ میں گولی لگی۔ایک نوجوان کے سینہ میں گولی لگ کر پیٹھ سے باہر نکل گئی. اس طرح نو آدمیوں کے گولیوں کے سنگین زخم آئے۔

۲۴/ اکتوبر کی رات میں گرفتاری کے اعلان کے بعد دفعہ ۱۴۴ نہیں لگائی گئی نہ نقضِ امن کے خطرہ کے تحت شہریوں کے وفد کے رہنما کو گرفتار کیا گیا۔ ایسی حالت میں کسی گروہ کا ایک جگہ جمع ہو کر احتجاج کرنا کیا دستورِ ہند کے تحت جرم ہے؟

چند اہم سوالات:۔

○ جب ۲۰، ۲۱/ اکتوبر سے حالات خراب ہو رہے تھے تو دفعہ ۱۴۴ کیوں نہیں لگائی گئی؟

○ شہریوں کے وفد کے رہنماؤں کو ۲۴/ اکتوبر کی رات میں گرفتاریوں کی دھمکی کے بعد بھی گرفتار کیوں نہیں کیا گیا؟

○ رات کے گیارہ بجے مسلمانوں کے دوسرے گروپ سے الگ بات کیوں کی گئی؟

○ اور اس بات کی اطلاع وکیل موصوف اور ان کے ساتھیوں کو کیوں نہیں دی گئی؟

○ ۲۵/ اکتوبر کو لاٹھی چارج اور گولی کے بعد فوراً ہی انیس انصاری کے کیس (مقدمہ) میں معطل کئے جانے والے ایس۔او۔ کو چارج کیوں دیا گیا؟

○ ایسے خراب ماحول میں ایس۔ پی بہرائچ، ڈی۔وائی۔ایس۔ پی کو ہدایات دیکر شہر کے باہر کیوں چلے گئے اور واقعہ کے فوراً بعد واپس آ گئے؟

○ ایک غیر مسلم حلوائی کو جو انیس انصاری کے مقدمہ میں پولیس کے خلاف گواہ تھا اس کو پولیس کے ایکشن کے دوران کیوں گرفتار کیا گیا؟

یہ وہ سوالات ہیں جن کی روشنی میں کہانی کا رخ یہ بتاتا ہے کہ ایس۔ پی اور وکیل صاحب کی ذاتی عداوت اور دشمنی میں ان کے گرد پولیس نے جال تیار کرنے میں بڑی ہوشیاری سے کام لیکر معاملہ اس جگہ پہونچا دیا، جہاں پولیس اور مسلم عوام کے درمیان براہ

راست تصادم کی نوبت آ گئی۔ اور اس کے بعد معطل شدہ انسپکٹر نے ایسے تمام لوگوں کے ساتھ (جو انیس انصاری کے معاملہ میں گواہ یا پیش پیش تھے) دوسروں کی بھی دل کھول کر پٹائی کی۔

پولیس ایکشن کی زد میں آنے والے محلے:- درگاہ شریف، چاند پورہ، قاضی پورہ، بشیر گنج، گدڑی، اور ناظر پورہ خاص ہیں۔

پولیس کی کہانی:- اس واقعہ سے متعلق پولیس نے یہ کہانی گڑھی، کہ گھنٹہ گھر میں مجمع مسلح تھا۔ کٹوں (دیسی پستول) سے لیس تھا۔
لیکن کسی پولیس والے کے کوئی چھرا یا گولی نہیں لگی، جبکہ پتھراؤ سے کئی پولیس والے زخمی ہوئے اس کے بعد پولیس نے ایف- آئی- آر درج کی۔ پہلی لسٹ سولہ (۱٦) آدمیوں کی، دوسری پندرہ کی، تیسری اسی (۸۰) آدمیوں کی اور چوتھی لسٹ میں پندرہ سو آدمی جن کو نام سے نہیں جانتی صورت دیکھ کر پہچانے گی، دوسری طرف جن کے نام رپورٹ میں ہیں ان کی ولدیت نہیں لکھی تاکہ ایک ہی نام کے کئی لوگوں کو گرفتار کرنے یا ڈرا دھمکا کر پیسہ وصولنے کی راہ کھلی رہے۔ مجموعی طور پر تین ہزار خاندانوں کو پولیس ایکشن کے دوران بے عزت کیا گیا۔ تلاشی لی۔ بے پردگی ہوئی اور ۳۲٦ لوگوں کو گرفتار کیا۔ جن میں چالیس نابالغ تھے۔

چھاپہ مار دستہ کا کمانڈر:- ایس- پی بہرائچ نے ایک سو بیس مسلمانوں کو گرفتار کیا اور پولیس کو توالی دیہات کے پچھلے حصے میں بند کر دیا پھر شہر کے مسلم محلوں میں اپنے دلالوں کے ساتھ جلسے کروائے اور وہاں اعلان کیا کہ اگر ایک بھی سپاہی کے ہاتھ لگا تو ۱۲۰ یرغمالی مسلمانوں کو جو دیہات کو توالی میں بند ہیں ایک لائن میں کھڑا کر کے گولی مار دی جائے گی اس طرح ان کو ۴۸ گھنٹہ تک جیل نہیں بھیجا اور حبس بیجا میں

رکھا۔ وہ اسرائیلی یا فلسطینی کمانڈر کی شکل میں کام کر رہا تھا۔ اس طرح ان یرغمالیوں کو کھانا پانی بھی نہیں دیا گیا اور پانی مانگنے پر ان کو ایک دوسرے کا پیشاب پینے کو کہا گیا۔ وہاں موجود پولیس کا عملہ گالیوں کے سوا کچھ نہیں دیتا اور کہتا ان کٹووں (مختون) کو بھنسے کے پیلھڑوں (فوطوں) میں سور کا گوشت ملا کر کھلاؤ۔ ان یرغمالیوں میں ستر سال کے بوڑھوں سے لیکر سولہ سال کے لڑکے تک تھے۔ تیسرے چوتھے دن اتر پردیش سرکار کے ایک وزیر رام سنگھ کھنہ نے وہاں پہونچکر ان کو جیل بھیجے جانے کی کاروائی پر عمل کرایا۔ پہلی مرتبہ ایس۔ پی نے ان سے بھی جھوٹ کہا کہ سب کو جیل بھیج دیا گیا مگر جیل کے معائنہ پر وہاں موجود قیدیوں نے ان یرغمالیوں کے جیل نہ پہونچنے کی شکایت کی وہاں سے واپس آکر انھوں نے ایس۔ پی کو ڈانٹا تب اس نے دو گھنٹہ کے بعد لسٹ تیار کر کے جیل روانہ کیا لیکن اس دروغ گوئی کے خلاف انھوں نے سپرنٹنڈنٹ بہرائچ کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی۔

محلہ درگاہ شریف:۔ یہ شہر کے شمالی کنارے پر آخری محلہ ہے اس کے بعد سڑک دیہات کی طرف نکل کر آسام روڈ سے مل جاتی ہے۔ اس راستہ پر پولیس والوں نے راہ گیروں کو نام پوچھ پوچھ کر لوٹا۔ اسی محلہ کے امان الحق کے مکان پر ایک جذامی کو بندوق کے کندوں سے محلہ کے تھانہ کی پولیس نے بری طرح مارا۔ چھن ولد امام علی جس کی لب سڑک لکڑی کی ٹھیکی ہے اس کے گھر پر حملہ کر کے ۵ ہزار دو سو روپیہ چھین لئے۔ بیس تولہ چاندی اور سونے کے بندے چھ آنے وزن کے تھانہ انچارج نے لئے۔ ۲۸/ اکتوبر کی رات میں محمد حسین سے جن کی عمر ۸۳ سال کی ہے پانچ سو روپیہ وصول کئے۔ برکت و غلام احمد سے پانچ سو روپیہ لیے۔ حاجی عباس سے ۱۰۵۰/= روپیہ لیے۔

پولیس چوکی محلہ بشیر گنج کے کارنامے:۔ اس محلہ میں کوئی بچا نہیں جس نے پولیس کے ظلم و جبر کی کہانی نہ سنائی ہو۔ محمد یونس کے گھر میں گھس کر

دو نوں ہاتھ توڑ دیئے۔ جمیل احمد کا ایک پیر توڑا۔ لطیف کا ہاتھ توڑا اور سارا مال و اسباب لوٹ لیا۔ رحمت اللہ کے دونوں پیر زخمی کر دیئے۔ ہاتھ بھی بیکار ہیں۔ عبدالاحد کے دونوں ہاتھ توڑ دیئے۔ چھ عدد سونے کے زیورات جن کی مالیت بارہ سو روپیہ، ایک سیکو گھڑی، اور چھ ہزار روپیہ نقد لوٹ لئے۔ سکندر کے داہنے پیر کی ہڈّی تور دی۔ ۸۷ روپیہ بھی لے لیے۔ غفار کی پٹائی پانچ سو روپیہ لیے۔ نثار کو مارا سات سو روپیہ بھی لیا۔ عبدالرحمان کو مارا اور تین سو روپیہ چھینا۔ محمد رفیق کو لاٹھیوں سے مار کر گھر پر چھوڑ دیا اور چھ ہزار روپیہ لوٹ لیا۔ غلام علی کو مارا گرفتار کیا پچیس روپیہ لے لئے۔ واحد کو گرفتار کیا پچیس روپیہ لے لئے۔

محلہ قاضی پورہ:۔ لڈن ولد اشفاق کی گرفتاری اور بارہ سو روپیہ بھی لیا۔ محبوب علی (چھوٹے شاہ تکیہ) مارا اور ہزار روپیہ چھین لئے۔ حاجی منّا کا بایاں ہاتھ توڑ دیا۔

محلہ گدڑی:۔ عبدالحفیظ کے پیر کی ہڈّی توڑ دی (کینٹ کے کارخانہ کا مزدور) حاجی فرید کے گھٹنے کی چپنی توڑ دی، پولیس کے سپاہی ہر لاٹھی پر کہتے تھے "کہو رام حاجی جی! اللہ نہیں! ان کے بڑے لڑکے کا پیر توڑا، ہاتھ میں کیلیں ٹھونکیں، گھر میں ناشتہ دان تک نہیں چھوڑا۔

محلہ ناظر پورہ:۔ حاجی عبدالرحمان کو گرفتار کیا دو سو روپیہ بھی اڑا لئے۔ ریاض الدین کے گھر پر چھاپہ مارا چار ہزار روپیہ کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ عبدالجبار کو مارا ہڈّی توڑ کر چھوڑ دیا۔

محلہ چاند پورہ:۔ محمد حسین ولد نادر کی بائیں ہاتھ کے کندھے کی ہڈّی توڑ دی اور چھ سو روپیہ نقد لے لئے۔ اسی طرح ۹۱ آدمی ہیں۔ جنھیں گھروں کے اندر گھس کر مارا ہاتھ پیر توڑے اور گرفتار کیا۔ جن میں ۲۶ مسلمان بالکل ناکارہ کر دیئے ہیں۔ جمیل جو

گولی لگنے سے موقع ہی پر شہید ہو گئے۔ اپنے پیچھے بیوہ اور تین چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ گئے۔

محلہ قاضی پورہ میں ایک بڑی بی نے مجھے دیکھ کر اس پولیس ایکشن پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جملہ میں پوری تصویر کھینچ دی محترمہ نے کہا۔۔۔ "بھیا فوج بہرائچ میں عید منا کے چلی گئی۔"

پولیس کے جوانوں نے جو بہرائچ کے مختلف تھانوں اور پولیس چوکیوں کے ہیں، نہ تو کسی گھر میں مرغی چھوڑی نہ بکری۔

گولیاں چلانے، مسلمانوں کو برباد کرنے اور لوٹنے کے بعد فوراً ہی شیوٹنگ ہٹا دیا گیا۔ نہ انتظامیہ پر توہین عدالت کا مقدمہ چلا نہ ہی اس واقعہ پر مقامی لیڈروں نے اس کی مذمت کی۔ بلکہ پولیس اپنے دلالوں سے ملکر گرفتاریوں کا سلسلہ جاری کئے ہوئے ہے۔ جو لوگ اس روز شہر میں موجود نہیں تھے ان کے نام بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔

یہ تو ایک جگہ کی کہانی ہے پچھلے ۴۶ برسوں سے پورے ملک میں یہی سلسلہ چل رہا ہے۔ ایک مہینہ کے اندر دو سو کلومیٹر کے اندر تین جگہ اتر پردیش میں مسلمانوں کو روندا گیا۔ یہی ٹانڈہ فیض آباد میں ہو رہا ہے یہی مئو میں کھیل کھیلا جا رہا ہے اور ایک ماہ گذر جانے کے بعد بھی گرفتاریوں اور دہشت گردی کا سلسلہ رکا نہیں ہے۔ ۱۸/ اکتوبر ٹانڈہ، ۲۵/ اکتوبر بہرائچ اور ۵/ نومبر سنہ ۱۹۸۳ء مئو ناتھ بھنجن میں مسلمانوں کے خلاف پولیس اور فرقہ پرستوں نے تباہی مچادی۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لیے

عام مسلمان، سرکار، فرقہ پرستی اور چاپلوس مسلمان

ہندستان میں مسلمانوں کو سہ رُخی حملہ کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ایک طرف سرکار، اسکی مشینری اور باوردی تنخواہ دار ملیشیا ہے، دوسری طرف ملک کی فرقہ پرست طاقتیں جنھیں حزب اقتدار و حزب اختلاف کی درپردہ حمایت حاصل ہے اور تیسری طرف ان سب پارٹیوں کے وہ مسلمان جو مسلمانوں کو ہی تبدیل ہونے کا مشورہ دیتے رہتے ہیں اور حزب اقتدار و حزب اختلاف کی کلہاڑیوں میں بینٹ بن کر مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو چیرنے کا کام کرتے رہتے ہیں۔

ہندستان کی حکومت ہاتھی کی طرح ہے۔ جس کے دکھانے کے دانت اور کھانے کے دانت اور ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف تحریکات، خطرناک رپورٹیں اور خفیہ سرکلر انگریزی میں اور ان کے حق میں اردو میں بیانات دیئے جاتے ہیں اور اس طرح مسلمانوں کو گمراہ کیا جاتا ہے۔

ہندستان کی سبھی پارٹیاں ساری برائیوں کی جڑ جن سنگھ اور اب بھارتی جنتا پارٹی اور آر۔ایس۔ایس کو قرار دیتی ہیں۔ لیکن جن سنگھ یا آر۔ایس۔ایس ایک فکر کا نام ہے۔ اور وہ فکر یہ ہے کہ ہندو تہذیب قدیم سے قدیم تر ہے اور ایشیا میں ساری روشنی اسی کے ذریعہ پہونچی مسلم عہد میں اس چراغ کو گل کر دیا گیا۔ مسلمان ہندستان کے وفادار نہیں ہو سکتے ہندو دیوی دیوتاؤں کے سانچے میں مسلمان اپنے کو ڈھال کر ہندو تہذیب کا جز و بن جائیں اور اسلام، اپنے پیغمبر یا خدا کا کوئی مجسمہ بنا کر ہندوؤں کے ڈھنگ سے پوجا (عبادت) کریں تو انھیں گوارا کر لیا جائے گا۔

اس فکر کے ماننے والے سبھی پارٹیوں میں بکھرے ہوئے ہیں اور قریب قریب ہر ہندو کی یہی فکر ہے۔ صرف نرم و گرم الفاظ کا فرق ہے باقی فکر میں شدید ہم آہنگی پائی جاتی

ہے چنانچہ خود پنڈت نہرو اپنی کتاب میری کہانی میں کہتے ہیں۔۔ "اکثر کہا جاتا ہے کہ ہندو مت پر صحیح معنوں میں مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود اس کی کشش کتنی سخت ہے اور اس کی بقا میں کتنی قوت ہے۔"۔۔۔۔۔۔ لیکن قرآن اور اسلام سے متعلق فرماتے ہیں۔۔ "اس کے بعد جو کچھ انھوں (مولانا محمد علی) نے کہا اس پر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ کہنے لگے کہ میرا ایمان ہے کہ جو کوئی قرآن کو بے تعصب ہو کر تلاش حق کے خیال سے پڑھے گا وہ اس کی صحت کا ضرور قائل ہو جائے گا۔"[1]

آر۔ایس۔ایس ایک ہوا ہے، کوئی ہندو لیڈر (جو سنہ ۱۹۲۵ء سے سنہ ۱۹۳۰ء کے درمیان سن بلوغ کو پہونچا ہے) ایسا نہیں ملے گا جو آر۔ایس۔ایس کی سرگرمیوں میں شریک نہ ہوا ہو چاہے آگے چلکر اس سے الگ ہو گیا ہو لیکن اس کی فکر کے سایہ میں پروان ضرور چڑھا ہے۔ وہ ایک ہوا ہے، جو ہر گھر میں داخل ہو چکی ہے۔ شہروں اور قصبوں میں کوئی گھر ایسا نہیں ہے جس میں اس فکر سے متاثر ہونے والے ہندو موجود نہ ہوں اور اِدھر سنہ ۱۹۸۰ء کے بعد اس فکر نے محترمہ اندرا گاندھی کے زیر سایہ بڑی تیزی سے اس کو پھیلانے کا کام کر کے، ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بڑے بڑے جتھوں کی شکل میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، ہندو غلام ہونے جارہے ہیں، عربوں کے روپیہ سے اسلام کی طاقت پھیلائی جارہی ہے، سرکاری اور غیرسرکاری طور پر اس فکر و نظر کی تشہیر ہو رہی ہے۔ اس فکر کے سایہ میں پرورش پانے والوں میں خود پنڈت نہرو کے عہد میں دو بااثر لوگ موجود تھے سردار ولبھ بھائی پٹیل (وزیر داخلہ) اور پرشوتم داس ٹنڈن یہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر بھی رہے تھے۔

ہندستان میں ہونے والے فسادات کی ذمہ داری سرکاری رپورٹوں کے مطابق مسلمانوں پر ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلہ کی ایک رپورٹ ۵/اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء کو بنگلہ زبان کے اخبار "آنند بازار پتریکا" میں اس عنوان کے تحت چھپی۔۔ "فرقہ وارانہ فسادات

---

[1] میری کہانی۔ پنڈت نہرو کی خود نوشت سوانح حیات۔

کے لیے فرقہ پرست مسلمان ذمہ دار" یہ کلدیپ نیر کی رپورٹ کا ترجمہ ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ مرکزی حکومت کی تجویز کے مطابق بہار، اتر پردیش، گجرات، آندھرا، کرناٹک، تامل ناڈو، اور مغربی بنگال وغیرہ ریاستوں میں سنہ ۱۹۷۷ء سے فرقہ وارانہ فسادات بڑھتے جا رہے ہیں۔ اعلیٰ پیمانہ پر تحقیقاتی کاروائی کرنے کے بعد خیال ظاہر کیا کہ فرقہ وارانہ فسادات کی ذمہ داری مسلمانوں پر عاید ہوتی ہے حکومت کا کہنا ہے۔۔۔

(۱) مسلمانوں میں فرقہ پرستوں کا اثر روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ لوگ اسلامی اصول و نظریہ اور مذہبی روایات وغیرہ واپس لانا چاہتے ہیں۔

(۲) مسلم اخبارات اور مختلف ادارے فرقہ پرست خیالات کی تبلیغ اور اشاعت میں حصہ لے رہے ہیں۔

(۳) تحقیقات کرنے پر یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ عرب ممالک سے اسلام کو پھر زندہ کرنے اور اس کا بول بالا کرنے کی خاطر بہت بڑی رقم آرہی ہے اور مختلف مذہبی ادارے مالی قوت حاصل کر رہے ہیں۔

(۴) سنہ ۱۹۸۰ء اور سنہ ۱۹۸۱ء میں تامل ناڈو کے کئی علاقوں میں ہریجنوں کو بالجبر تبدیلئ مذہب کر کے مسلمان بنانے کی وجہ سے جو واقعات رونما ہوئے اس سے ان کٹر مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۵) قابل ذکر بات یہ ہے کہ / ۳۰ فی صد فرقہ وارانہ فسادات معمولی وجوہات کی بنا پر واقع ہوئے ان میں / ۲۵ فی صد مذہبی جذبات کو ہوا دینے کی وجہ سے ہوئے۔

(٦) کس طرح مذہبی جھگڑے شروع ہوتے ہیں؟

مذہبی جگہوں میں یا عبادت گاہوں میں ناجائز دراندازی، مذہبی جلوس نکالنے کا راستہ لیکر بحث و مباحثہ اور مساجد و قبرستان کے نزدیک مائیک بجانے کی وجہ سے فسادات شروع ہوئے۔

کلدیپ نیر کے قلم سے مرکزی سرکار کے یہ خیالات سامنے آئے ہیں۔

مرکزی فکر کی فتنہ پردازی:-

(۱) فرقہ پرستی کیا ہے؟ اس کی تعریف مرکزی سرکار نے نہیں کی۔ فرقہ پرستی کا مطلب ہوتا ہے، ایک فرقہ کے ذریعہ دوسرے فرقہ کے خلاف نفرت انگیز، جھوٹی اور بے بنیاد باتوں کے ذریعہ اشتعال پیدا کرنا اور اسے دوسرے کے خلاف کھڑا کر کے فتنہ و فساد برپا کروانا، جس کی خود مرکزی سرکار مرتکب ہوئی ہے کلدیپ نیر کے اس بیان کی روشنی میں۔ اسلامی اصول و نظریہ اور روایات کو واپس لانے کی کوشش کو فرقہ پرستی کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

(۲) کوئی مسلم اخبار اول تو نکلتا نہیں ہے۔ ہاں اردو اخبارات قومی پریس کی مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز باتوں کو ترجمہ کر کے چھاپتے ہیں تو ان پر مقدمے چلا دیئے جاتے ہیں لیکن اصل مجرموں کو چھوا نہیں جاتا، جیسے بنگلور سے شایع ہونے والے "ہفت روزہ نشیمن" کو سیکڑوں مقدمات میں پھانسا گیا ہے۔

(۳) عرب ملکوں سے بعض اسلامی اداروں کو ملنے والی رقم سے مرکزی سرکار کو اسلام کی زندگی سے پریشانی لاحق ہو رہی ہے لیکن انھیں ملکوں سے ہندستان کے مختلف پروجکٹوں کو ملنے والی رقم کے سہارے خود ہندستان طاقت حاصل کر کے عالم اسلام کے خلاف ہندو عوام میں نفرت پیدا کرنے کا کام کر کے کس جذبہ کو زندہ کر رہا ہے؟

(۴) تامل ناڈو میں ہریجن بالجبر مسلمان نہیں ہوسکتے اگر طاقت کے ذریعہ ہی مذہب کی تبدیلی عمل میں آسکتی تو ہندستان کی سرکار ہندستانی مسلمانوں کو کب کا ہندو بنا چکی ہوتی۔

(۵) آزادی کے بعد سرکار کی ایما اور مرضی سے مسلمانوں کی مسجدوں اور قبرستانوں کو بری طرح برباد کیا گیا ہے۔ جس طرح شہروں میں آبادی کا پھیلاؤ ہو رہا ہے اس کے لیے زد میں سب سے پہلے مسلمانوں کے قبرستان آئے اور قبروں کو کھود کر ان کی ہڈیوں کو روند کر بھارت ماں کے جیالوں نے ایک ہزار سالہ اپنی محرومیوں کا انتقام لے لیا ہے۔ ہندوؤں کو تو بجلی کے کرنٹ کے ذریعہ ایک ہی جگہ پر جلا کر راکھ کیا جاتا ہے لیکن

مسلمان مردوں کے لیے قدیمی قبرستانوں کو اجاڑنے کے بعد متبادل جگہیں فراہم کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری تھی جو اس نے پوری نہیں کی۔ آزادی کے بعد خفیہ طور پر تحصیلوں کو احکامات بھیجے گئے کہ کہیں قبرستانوں کا اندراج نہ کیا جائے بلکہ بنجر زمین لکھا جائے۔

ہندستان میں رواج چلا آتا ہے مساجد کے سامنے نماز کے وقت شور و غل اور گاجا باجا نہیں ہوگا...... لیکن سیکولر سرکار مسلم روایات کو مٹنے پر تل گئی اور اس نے قبرستانوں کو روندنے، مساجد کو برباد کرنے ان کے سامنے عمداً مسلمانوں کو نیچا دکھانے کے لیے باجا گاجا شروع کروایا تو مسلمانوں نے اعتراض کیا، اعتراض کیا تو ان پر پولیس کی مدد کے ساتھ بلوائیوں سے حملہ کروایا گیا اور اس طرح فساد کی ذمہ داری مسلمانوں پر ڈالدی گئی۔

(٦) آزادی کے بعد شرارتاً ہر مسجد کی بغل میں مندر (ہندو عبادت گاہ) بنانے کی کوشش کی گئی، قبرستانوں میں چنے بچھا کر اس پر مورتی رکھی گئی، زمین کو نرم کیا گیا پھر اسے توپا گیا اور پانی ڈالنا شروع کیا گیا پانی پا کر چنا پھولا، پہلے سے شور کیا گیا کہ فلاں جگہ درگا کی مورتی نکلنے والی ہے اور جو جو چنا پھولا مورتی باہر آگئی اور اس طرح اس زمین پر ہندؤں نے اپنا دعویٰ کر کے وہاں مندر بنانا شروع کر دیا۔ مسلمانوں نے مقابلہ کیا تو ان کو پٹوادیا گیا۔ فساد کی ذمہ داری مسلمانوں پر ڈالدی گئی۔

کلدیپ نیر کے ذریعہ چلنے والی رپورٹ پر اگر کوئی مسلم ملک یا بااثر بین الاقوامی طاقت پوچھ گچھ کرے تو سرکار کہہ دے گی ہمیں پتہ نہیں سرکار میں آر۔ایس۔ایس کے لوگ گھس آئے ہیں انھوں نے ایسی رپورٹ تیار کردی ہے۔ اس طرح سرکار دنیا کو دھوکا دینے کے لیے مسلمانوں کے خلاف نفرت بھری سیاست آر۔ایس۔ایس کے ذریعہ کرواتی ہے یہ دونوں ایک ہی سکہ کے دو رُخ ہیں۔ اور پھر مسلمانوں سے کہتی ہے اگر تم ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے تو ہم ان طاقتوں کا مقابلہ کیسے کریں گے؟

اب یہ رپورٹ عوام میں آئے گی تو اس سے طاقت ملے گی آر۔ایس۔ایس کو اور اس کے لیڈر کہیں گے سرکاری رپورٹ یہ ہے، ہم تو پہلے ہی باخبر کر رہے تھے۔ اس طرح سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر مسلمانوں کے خلاف نفرت کا بازار گرم رکھا جا رہا ہے جس

کے نتیجہ میں مسلمانوں کے خون سے سرزمین ہند لالہ زار بنتی جارہی ہے۔

بنیادی سوال:۔

ہندستان میں امن اسوقت تک کیسے قائم ہوسکتا ہے جب تک مسلمانوں پر مسلسل ہونے والے مظالم اور رقابتوں کے خاتمہ کی راہ تلاش نہ کرلی جائے ...... ہندستان کے اندر مسلمانوں کو امن نہ فراہم کرنے والی ہندستانی سرکار اور اسکی وزیراعظم[1]، پرشور بحرہند میں امن کے علاقے تلاش کررہی ہیں .... ہندستان کے اندر مسلمانوں کے خلاف ہونے والی ریشہ دوانیوں کی روک کے لیے عالم اسلام کی ایک کانفرنس کی فوری ضرورت ہے۔

ہندستان میں مسلمانوں کا کوئی گروہ ہندوؤں کے خلاف نفرت کی تبلیغ نہیں کرتا۔ سب میل جول کی بات کرتے ہیں۔ سب مل جل کر رہنے کی بات کرتے ہیں۔ سب نے سیکولر طریق زندگی کو تسلیم کرلیا ہے۔ حکومت الٰہیہ کی داعی جماعت اسلامی جس پر فرقہ پرستی کا الزام لگایا جاتا ہے ایمرجنسی کے زمانہ میں اس نے بھی ملک کی فرقہ پرست ہندو جماعتوں کے ساتھ مذہب کی بنیاد پر کمیونزم کے خلاف متحد ہو کر کام کرنے کی بات کی۔ آر۔ ایس۔ ایس کی طرف بھی دوستی کا ہاتھ بڑھایا لیکن اس میں اسے کامیابی نہیں ہوسکی اسلئے کہ ملک کی سبھی سیاسی اور کلچرل طاقتیں اصل خطرہ اور خوف اسلام ہی سے محسوس کرتی ہیں اور مسلمانوں کی اچھی بات بھی انھیں زہر سے زیادہ کڑوی لگتی ہے۔ اس طرح سرکاری سطح پر اور دوسری طرف فرقہ پرست تنظیموں کے ذریعہ ہر روز مسلمانوں کے خلاف ایک نیا فتنہ بیدار کیا جاتا رہتا ہے۔

تیسری طرف سیاسی پارٹیوں کے مسلمان، مسلمانوں کو مشورہ دیتے رہتے ہیں کہ انھیں لیڈروں کو اپنا آقا بنالو۔ اپنی الگ سیاسی تنظیم مت کھڑی کرو ورنہ تم پر اس سے زیادہ مصائب کے پہاڑ توڑے جائیں گے۔ ملک کے ہندو لیڈروں کے پاس ہی تمہاری

---

[1] نئے وزیراعظم اسی راہ پر ہیں۔

نجات کا نسخہ ہے۔ اور اگر ایسا نہیں کرتے تو تم روند اور کچل دیئے جاؤ گے۔۔۔۔ یہ لیڈر خالص دنیادار بھی ہیں، اور دینی و مذہبی حیثیت کے حامل بھی!

خائن ہوئے حریم امانت میں باریاب شیطان ہے فراز ہدایت کا آفتاب
بیڑے ڈبو چکے ہیں جو بے حد و بے حساب ان ظالموں کا حضرت الیاس ہے خطاب

وہ جو تمام راہ زنوں کا امام ہے
وہ شخص آج خضر علیہ السلام ہے

کلدیپ نیر کے قلم سے نکلی ہوئی سرکاری رپورٹ سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کے کسی مذہبی جلوس پر مسجد سے پتھر مارے۔ کہیں مورتی توڑ دی، ہندو عورت کو چھیڑ دیا وغیرہ۔۔۔۔ لیکن اس ملک میں عیسائی بھی رہتے ہیں ان کی تقریبات بھی ہوتی ہیں۔ پارسی بھی ہیں، بودھ بھی ہیں اور جنگ جو قوم سکھ بھی۔۔۔۔ لیکن مسلمان اس طرح کی حرکتیں صرف ہندوؤں ہی کے ساتھ کیوں کرتے ہیں؟ تاکہ اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کے سامان فراہم کر لیں؟

ہم جب ان کے سدباب کے لیے آواز اٹھاتے ہیں تو ہمیں پاکستانی کہہ دیا جاتا ہے، سرزمین حجاز سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ عرب کی سرزمین میں ڈھکیلنے کی بات کی جاتی ہے ورنہ ہندو تہذیب میں فنا ہو جانے کو کہا جاتا ہے۔ اور زندہ رہنے کی کچھ شرطیں رکھی جاتی ہیں۔ جن میں دو کا مطالبہ بڑی سختی سے کیا جاتا ہے۔

(۱) ہندوؤں اور مسلمانوں کے پوروج (اجداد) ایک ہیں۔ اسلئے سب کو ان کی پیروی کرنا اور ان کے نقش قدم پر چلنا چاہئے۔

(۲) نجات سبھی مذہبوں کی راہ سے ہوگی صرف اسلام کی راہ سے نہیں۔

ایک مرتبہ پروفیسر راجیندر سنگھ (جو اسوقت آر۔ایس۔ایس کے جنرل سکریٹری ہیں) نے مجھ سے کہا کہ اگر ان دونوں باتوں کو مسلمان مان لیں تو سمجھوتہ کی راہ نکل سکتی ہے۔ پھر انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی کے کچھ مسلم پروفیسروں سے اپنی گفتگو کے بارے میں جو اسی مسئلہ پر ہوئی تھی ذکر کیا۔

میں نے پوچھا۔۔۔ "وہ کیا بولے۔"
راجیندر سنگھ نے کہا۔۔۔ "انھوں نے میری باتوں سے اتفاق کیا۔"
میں نے جواب دیا۔۔۔ "ان کا اتفاق گمراہ کن تھا۔"
پروفیسر راجیندر سنگھ نے میری طرف گھبرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ "کیا مطلب۔"
میں نے عرض کیا۔۔۔ "پہلی بات کے لیے آپ خود تیار نہ ہوں گے۔ فرض کیجئے میری آپ سے دوستی اور تعلقات ہیں اور میں آپ کے یہاں آتا جاتا ہوں، آپ کے والد صاحب بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میں انھیں اپنے باپ کی جگہ سمجھتا ہوں اور ان کا انتقال ہو جاتا ہے، میں آپ کے دکھ میں شریک ہوتا ہوں اور میں کہتا ہوں کہ آج میرے سر سے بھی سایہ اٹھ گیا اور اب اس کے بعد ترکہ کی تقسیم کا مسئلہ آئے گا تو کیا آپ مجھے اس میں شریک کریں گے؟ اس بنیاد پر کہ وہ میرے باپ کی مثل تھے۔"
بولے۔۔۔ "ہرگز نہیں۔"
میں نے کہا۔۔۔ "جو بات آپ خود عملاً ماننے کے لیے تیار نہیں اسکا مطالبہ ہم سے کیوں کرتے ہیں؟ اسی لیے اسلام نے حکم دیا ہے کہ اپنے باپ کو چھوڑ کر دوسرے کے باپ کو اپنا باپ مت بناؤ یہ غیر فطری عمل اور گناہ عظیم ہے۔ پھر اسلام میں رشتہ فکر کی بنیاد پر جڑتا اور کٹتا ہے۔ خون کے رشتہ کو وہ اہمیت نہیں دیتا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو اس سے منع کر دیا کہ یہ بیٹا جو تمھاری فکر کے خلاف ہے تم میں سے نہیں۔
پروفیسر صاحب نے کہا۔۔۔ "لیکن نجات۔"
میں نے جواب دیا۔۔۔ "محترم، نجات ہمارے ہاتھ کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ بالکل خدا کا معاملہ ہے اور اگر ایسا ممکن ہوتا تو میں آپ کی نجات کے لیے سفارش کرتا ذرا وہاں بھی تفریح رہتی۔۔۔۔ مگر مجھے خود پتہ نہیں کہ میری نجات ہوگی یا نہیں۔۔۔ ہاں اسلام نے ایک اصول بنا دیا ہے کہ جو لوگ "ایمان بالغیب" پر یقین رکھتے ہیں ان کی نجات کے دروازے کھلیں گے ان کے مسئلہ پر غور ہوگا۔
انھوں نے پوچھا۔۔۔ "ایمان بالغیب کیا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا ۔۔۔ " اللہ کو اسکی ذات اور صفات میں ایک ماننا اس کے ذریعہ اتاری گئی کتابوں پر یقین لانا اس کے رسولوں پر ایمان لانا ۔ رسولوں اور خدا کے بیچ رابطہ کی مخلوق فرشتوں کو ماننا اور یوم آخرت یعنی ایک وقت آئے گا جب یہ کائینات فنا ہو جائے گی اور حساب کتاب ہوگا ۔"

جن لوگوں کا ان پانچ باتوں پر ایمان ہے انہیں کی نیکیوں کا شمار ہوگا ۔ جس کو آنا ہے اس راستہ سے آئے دوسرا کوئی راستہ قبول نہیں اور جنہوں نے ان کو نہیں مانا ان سے اولیں مطالبہ انھیں قبول کرنے کا ہے اور یہ معاملہ یعنی نجات خالص اللہ کے ہاتھ میں ہے ہم اسکو چاہیں بھی تو بدل نہیں سکتے ۔

یہ سن کر وہ خاموش ہو گئے اور کہنے لگے " یہ مسئلہ غور طلب ہے ۔"

موصوف سائنس کے پروفیسر ہیں ۔۔ مگر پورے ملک کی ذہنی سطح کو مسلمانوں اور اسلام کے خلاف خراب کرنے والی یہی شخصیتیں تو ہیں ۔

مسیحائی کرے گا کون اب اسحاق عالم میں ؟
در جاناں پہ سنتے ہیں کہ عیسٰی خود سسکتے ہیں

رام کی جگہ..... درگا دیوی

شمالی ہندستان رام، کرشن اور پرہلاد کا علاقہ ہے۔ رام کی زندگی، شرافت، رواداری، عدل و انصاف اور غیرت کا مظہر سمجھی جاتی ہے، کرشنا نے حق و صداقت، ظلم و شر اور بے حیائی کے خلاف جنگ کی۔ پرہلاد کے یہاں خدائے واحد پر کامل یقین اور الوالعزمی کا سبق ملتا ہے۔

لیکن برہمنوں نے ان کی زندگیوں کی صداقت کو کہانیوں میں گم کردیا، گیتا کی تعلیمات سے قوم کو دور کردیا۔ دنیا کی کسی قوم نے اتنی جلیل القدر ہستیوں اور ان کی تعلیمات کو اس طرح پامال نہیں کیا ہے جیسا ہندووں نے اپنے محسنوں کی دی ہوئی علم و یقین کی روشنی کو تاریکی میں بدلنے کا کام کیا ہے۔

آزادی کے بعد ایک نیا رخ ہندو قوم کے لیڈروں نے اختیار کیا ہے رام و کرشنا کی رواداری کی تعلیم کی جگہ "درگا دیوی جو شیر پر سوار ہے" کو آگے لایا گیا ہے۔ اس کے پیچھے تصور یہ ہے کہ "راون" جس کو لنکا کا راجہ بتایا جاتا ہے۔ اس نے اپنے بھائی "یکش" کو ملا کر ایک زبردست حکمران گروپ بنایا تھا اور اپنے نام کی "ر" اور یکش کو ملا کر اسکا نام رکھا تھا "راکشس" اور اس متحدہ طاقت کو مٹنے کے لیے رام کی مدد کی تھی "درگا دیوی" نے۔ چونکہ ہندو اساطیری فلسفہ میں راکشس بدی کی طاقت تھی۔ بعد کو ہر بدی کو راکشس کا نام دے دیا گیا۔ جس میں اہل اسلام نمبر اول پر ہیں۔ اسی لیے سنہ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کو توڑنے اور شکست دینے والی اندرا گاندھی کو پنڈت اٹل بہاری واجپئی نے..."درگا دیوی" کا لقب دیا تھا۔ راون اور یکش اساطیری قصے ہیں۔

اسی کے بعد سے شمالی ہندستان میں رام لیلا کو گھٹا کر درگا کی مورتیوں کو جو طاقت و قوت کا مظہر ہے سامنے لایا گیا اور مسلمانوں کے خلاف ہندو عوام کے جذبات کو ابھارنے

کا کام کیا جا رہا ہے۔ جسکا ثبوت ایک مہینہ کے اندر یو۔ پی کے مشرقی اضلاع میں تین جگہ مسلمانوں کے خلاف یلغار ہے۔ کہیں پولیس کی، کہیں بلوائیوں کی کہیں بلوائیوں اور پولیس دونوں کی۔ بنگالی طریقہ پر یہ پوجا یو۔ پی میں ابھی پچھلے چند برسوں سے شروع کی گئی ہے جس نے رام کو پیچھے ڈھکیل دیا ہے۔ اسی کا مظاہرہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں ہوا۔ پڑوس کے دیہاتوں میں افواہ پھیلائی کہ ٹانڈہ کے اندر مسلمانوں نے سارے ہندوؤں کو مار ڈالا اور مورتیاں توڑ دیں۔ اس پر قرب و جوار میں بھی تشدد شروع ہو گیا۔ موضع پگڑی بھوج پور میں ایک درگاہ مسمار کی گئی۔ گاؤں کو گھیر لیا گیا۔ مسلمان جامع مسجد کے گرد جمع ہو گئے۔ تو ان کے گھروں کو جلانا اور لوٹنا شروع کر دیا گیا اور آیندہ کے لیے خبردار کر دیا گیا کہ اگر عشرہ محرم منایا گیا تو خیر نہ ہوگی۔

عباس نامور کے لہو سے دھلا ہوا　　اب تک حسینیت کا علم ہے کھلا ہوا

درگا کی مورتیاں ریل کی پٹریوں پر رکھ کر ریلوے کی آمد و رفت روک دی گئی لیکن ضلع انتظامیہ ان کو شہ دیکر ضلع ہیڈکوارٹر اصل مقام سے ۵۵ کلومیٹر دور چلی گئی اور وہ سب کچھ ہوا جسکا ذکر پچھلے صفحات میں کیا گیا ہے۔

مئو ضلع میں بھی گذشتہ پانچ برسوں سے ہی درگا پوجا شروع ہوئی ہے۔ پچھلے سال محلہ حسن مالی خاصبانی میں درگا کی مورتی بٹھانے پر جھگڑا شروع ہوا۔ یہ مورتی ایک ایسی جگہ رکھی گئی جس کے لیے ایک مسلمان سے جھگڑا بھی چل رہا تھا۔ اس پر غیرقانونی قبضہ کا ایک ہی راستہ تھا کہ اس کے بیچ مورتی رکھ دی جائے (اس لیے کہ ہندوؤں کے پاس عبادت گاہ کے لیے جایز یا ناجایز کا کوئی تصور سرے سے ہے ہی نہیں۔ اسلئے مسلمانوں کی املاک پر دھڑا دھڑ مورتیاں نکلتی رہتی ہیں اور ان پر مندروں کی تعمیر ہوتی رہتی ہے۔ ہر ندی کے پل کے کنارے ٹھیکہ دار ناجایز رقم سے مندر بنوا دیتا ہے)

پھر اس درگا کی مورتی کو لے جانے کیلئے ایسے راستے کی مانگ کی گئی جو سیدھا جامع مسجد کے سامنے سے گذرتا تھا۔ جس کی اجازت پچھلے سال نہیں ملی تھی لیکن اس سال ہندوؤں نے اعلان کر دیا کہ اگر مسجد کے سامنے سے جانے کی اجازت نہ ملی تو کوئی مورتی

بھی دریا میں سیرائی نہیں جائے گی۔ اور مالی پورہ میں محرم کا جلوس روک دیا گیا تو مسلمانوں نے اپنا جلوس واپس لوٹا لیا صبروسکون کے ساتھ۔ حسن مالی خاصانی کا معاملہ بھی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ مسلمانوں نے سلجھا لیا اور دسہرہ خیریت سے گذر گیا لیکن دیوالی میں فساد برپا کر دیا گیا۔ مئو میں درگا کے ساتھ ہی لکشمی (دولت کی دیوی) کی بھی مورتیاں نکالی جاتی ہیں۔ ۵/ نومبر سنہ ۱۹۸۳ء کو اس مورتی پر کہا جاتا ہے کہ عیدگاہ سے پتھر مارا گیا۔ اس جھگڑے میں ایک مسلمان محمد ابراہیم صاحب جو جھگڑا ختم کرانا چاہتے تھے پتھر مار کر ہلاک کر دیئے گئے۔ اس کے بعد فساد میں تشدد برپا ہو گیا اور مسلمانوں نے بھی حملہ کر کے دو ہندوؤں کو زخمی کر دیا۔

اسوقت پورے ملک پر ایک جنونی کیفیت طاری ہے۔ لیکن یہ بے وقوف چھیالیس برس سے ایسے درخت کی آبیاری کر رہے ہیں جسکا پھل ابھی تک نہیں مل سکا ہے۔ مسلمانوں کو مٹنے کی کوششیں کرتے ہیں مگر ایسا اینٹ گارا لگاتے ہیں کہ دیوار پھس پھسی رہ جاتی ہے اور زمین پر آرہتی ہے۔ اسکا سبب یہ ہے کہ یہ سب کچھ حالت خوف میں ہو رہا ہے۔ اسلئے ڈرتے ڈرتے وار کرتے ہیں، مسلمان کتنا سخت جان ہے اسکا اندازہ ابھی انھیں اسلئے نہیں ہے کہ وہ ہندستان کے اندر اور باہر ہر جگہ حالت انتشار میں ہے۔

یہ ساغر ، شیشے لعل و گہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط
چبھتے ہیں ، لہو رلواتے ہیں

پولیس، انتظامیہ اور ذرائع ابلاغ

تمام غیرجانبدارانہ تحقیقاتی کمیشنوں، پارلیمانی رپورٹوں کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ پولیس، انتظامیہ اور نیشنل پریس کا رویہ جانبدارانہ رہا ہے۔ اس سلسلہ کی سب اہم رپورٹ جبل پور کے فساد ۱۹۶۱ء سے متعلق پی۔ سی۔ جوشی کمیونسٹ رہنما کی ہے۔ جس کے بعض اقتباسات سے پورے ملک کا سیاسی اور انتظامی رجحان آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

انھوں نے کہا۔۔۔ "اس بار بھی فسادات کی اس لہر کے اصل سازشی دراصل منظم سیاسی عناصر اور خصوصاً جن سنگھی تھے۔ اور انھوں نے "بے یارومددگار" مسلمانوں کو اپنا شکار بنایا۔

دوسرے یہ کہ پولیس اور سرکاری اہلکاران نے یا تو اس سازش میں جن سنگھ سے ملکر کام کیا یا اس قدر جانبداری اور وحشیانہ پن سے کام کیا کہ جن سنگھ نے اس کی تعریف کی اور ایک ہی بار میں یہ اچھی طرح ظاہر ہو گیا کہ ہماری انتظامی مشنری کو رجعت پسند عناصر نقصان پہونچا رہے ہیں اور اسے اپنے گندے کھیل کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

تیسرے یہ کہ جن سنگھ کے ہندو روزنامہ اور جان بوجھ کر پھیلائی گئی افواہوں نے پی۔ ٹی۔ آئی اور سرکاری پبلسٹی کو اس قدر متاثر کیا کہ فسادات اسکی وجہ اور اس کے پھیلنے کے اسباب کی ایک بالکل غلط تصویر سامنے آئی۔

ان فسادات میں بے گناہ قتل کر دیئے گئے۔ غریبوں کے مکانات ذریعہ معاش تباہ ہو گیا۔ عورتوں کی بے عزتی کی گئی اور بچے یتیم ہو گئے۔

جن سنگھ نے اپنے ہندو روزنامہ "یگ دھرم" میں (ایک) لڑکی سے بدسلوکی کی کہانی کو خوب اچھالا۔ اس واقعہ کی سنسنی خیز پبلسٹی کا مقصد جن سنگھی ودیا پریشد کے طلباء کو (انتظامیہ کی طرف سے) جلوس نکالنے اور شہر میں گشت کرنے اور جن سنگھ کو اس بات کا

موقع دینا تھا کہ سماج دشمن عناصر سے ملکر لوٹ مار اور آتش زنی شروع کرسکے۔ فساد شروع ہونے اور پھیلنے کے وقت پولیس خاموش تماشائی بنی رہی اور فوج کے آنے کے بعد صورت حال کچھ بہتر ہوئی۔

اس (بلوہ) میں مسلمان عورتوں کی انتقاماً بے حرمتی کی گئی۔ پی۔ ٹی۔ آئی اور سرکاری بیانوں میں مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کی خبر نہیں دی گئی۔ اور نہ اس صورت حال کو روکنے کی کوشش کی گئی (جو ایک ہندو) لڑکی کے ساتھ شرم ناک بدسلوکی کی کہانی کو بدلہ لو کے نعروں کو پھیلانے کے لیے استعمال کئے گئے۔

جن سنگھ نے فرقہ واریت سے متاثر ہندوؤں کے نچلے جذبات کو ابھارنے، فسادات کرانے اور غیر فرقہ پرست عناصر کو خاموش کرنے کے لیے عصمت دری کی کہانی کو استعمال کیا اور اسکا بہت برا اثر ہوا۔ ۴/ فروری ۱۹۷۲ء کے فساد سے کہیں بڑا فساد تین روز بعد ۷/ فروری ۱۹۷۲ کو ہوا۔ جس کے بعد کمشنر کے پریس نوٹ میں بتایا گیا۔ ایک فرقہ کے منظم شرارت پسند لوگ جو لاٹھیوں، بھالوں، آتشیں اسلحہ، ایسڈ بلبوں اور اینٹوں پتھروں سے مسلح تھے ایک ساتھ چھوٹے چھوٹے گروپوں میں جمع ہوگئے (اس میں جن محلوں کے نام لئے گئے ان میں مسلمانوں کی اکثریت ہے) انھوں نے دوسرے فرقوں کے لوگوں کے مکانات پر حملہ کیا، گولی چلائی، لوٹ مار کی اور ان مکانوں کے مکینوں پر مجرمانہ حملہ کیا، اس سرکاری رپورٹ سے اس بات میں شبہہ نہیں رہ جاتا کہ حملہ آور مسلمان تھے اور دفاع کرنے والے ہندو۔ اس سے بڑا جھوٹ ممکن نہیں!

تین بجے رات تک (اس بھیانک رات کو) اخبار نویس سرکاری بیان کے لیے بھیک مانگتے رہے۔ لیکن بیان نہیں دیا۔ اگلے دن ۸/ فروری کو صبح "یگ دھرم" نے پہلی بار لکھا کہ مسلمان ہجوموں نے ٦ مکانات پر حملہ کیا اور بہت سی رونگٹے کھڑے کر دینے والی سو فیصد جھوٹی کہانیاں شائع کیں۔ دوسرے دن شام کو سرکاری بیان جاری کیا گیا (اس کے بعد پی۔ ٹی۔ آئی کی رپورٹ) اور اس میں "یگ دھرم" میں بیان کئے گئے واقعات دہرائے گئے۔ اگلے دن پولیس عملہ اور پی۔ آر۔ یو نے کھل کر کہنا شروع کر دیا کہ فسادات اور

لوٹ مار مسلمانوں نے شروع کئے تھے۔

سرکای کمیونیکیو نے "یگ دھرم" میں شائع ہونے والی ایک بھی جھوٹی کہانی کی تردید نہیں کی۔ سرکاری کمیونیکیو میں کہا گیا تھا کہ ۸/ فروری کو پولیس فائرنگ میں چھ ادمی مارے گئے۔ لیکن بعد میں یہ تعداد گھٹا کر تین کردی گئی۔

۱۰/ فروری کو سرکاری اطلاعات کے مطابق جبل پور میں بیس افراد مارے گئے۔ اگلے وز مدھیہ پردیش اسمبلی میں سرکاری ترجمان نے یہ تعداد گھٹا کر سترہ کردی۔ ۱۳/ فروری کو سرکاری اطلاع تھی کہ ۱٦۴ ۔ مکانات نذر آتش کئے گئے ہیں جبکہ بعد میں کمشنر کو تسلیم کرنا پڑا ۲۹۳ (مکانات) تھے۔
جو جلائے گئے۔ سرکاری بیانات کے داخلی تضاد کے ان گنت واقعات گنائے جاسکتے ہیں۔

پولیس کا جھوٹ:- کوئی شخص بھی جو اپنی آنکھوں سے کام لے سکتا ہو خود یہ دیکھ سکتا ہے کہ مسلمان اقلیت حملہ آور نہیں تھی بلکہ فسادات کا شکار تھی۔ ا۔ہمارا ندارانہ نتیجہ کی شہادتیں زندہ حقیقتیں ہیں جن کو نہ چھپایا جاسکتا ہے نہ کسی طرح تردید کی جاسکتی ہے شہر میں تقریباً تین لاکھ ہندو ہیں اور چالیس ہزار مسلمان۔ فساد گھنٹیوں کے بجنے اور سنکھ پھونکنے سے شروع ہوا جو ہندوؤں کی علامات ہیں نا کہ مسلمانوں کی۔

- جن علاقوں میں فساد برپا ہوا وہ سب کے سب مسلم اکثریت کے علاقے تھے جس سے صرف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمان مدافعت میں مصروف تھے حملہ آور نہ تھے۔ میں نے خود اپنی آنکھ سے سڑک کے اسی کنارے سے جہاں سے ہندو علاقہ شروع ہوتا ہے ایک بڑے مندر پر ایک بڑا بانس لگا دیکھا ہے جس پر ایک بلب لگادیا گیا تھا جسکو جلا بجھا کر بلوائیوں کی رہنمائی کی جاتی تھی۔
- مسلم اکثریت کے علاقہ میں ہندوؤں کے مکان نہیں جلائے گئے۔ میں نے مسلمانوں کے مکانوں کی قطاروں کی قطاریں جلی ہوئی دیکھیں۔ ۲۹۳ جلائے جانے والے مکانوں میں صرف ٦ مکان ہندوؤں کے تھے جو مسلمانوں کے جلائے جانے والے مکانوں کی

لپیٹ میں آکر تھوڑے تھوڑے جل گئے تھے۔

○ ہندوؤں کے نہیں مسلمانوں کے بڑے پیمانہ پر مکانات لوٹے گئے۔ درجنوں بوڑھی مسلم عورتوں نے مجھے اپنی اپنی پتا سنائی جو ایک ہی جیسی تھی۔

پہلے پولیس کے دستے محلوں میں آگئے۔ اور انھوں نے محلے گھیر لئے۔ اس کے بعد جن سنگھی گروہ ہاتھ میں مشعلیں اور مٹی کے تیل میں ڈوبے ہوئے کپڑے کے گولے لئے آئے اور انھوں نے مکانات میں آگ لگا دی۔ پولیس نے لوٹ مار میں حصہ لیا۔ جب جلتے ہوئے مکانوں سے لوگ باہر نکلے تو ان کو مارا پیٹا گیا اور گرفتار کرلیا گیا اور خوفزدہ عورتوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے زیورات حوالہ کر دیں اور اس موقع پر مسلم عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ میں نے مسلم محلوں میں ہندوؤں کے ایسے مکانات دیکھے جن کے مکیں ہندو محلوں میں بھاگ گئے تھے اور ان کے مسلمان پڑوسیوں نے ان کی املاک اور مکانوں کی حفاظت کی تھی۔

بعض مکانوں پر چاک سے لکھا تھا یہ "ہندو کا مکان ہے" ظاہر ہے اسکا مقصد ہندو فسادیوں کو یہ بتانا تھا کہ اسے نہ تو لوٹا جائے نہ جلایا جائے۔

○ مارے جانے والے ۱۴۱۔ افراد میں صرف دو ہندو تھے جو اس بات کو غلط ثابت کرتی ہے کہ حملہ آور مسلمان تھے۔ ۷/ (فروری) کو ایک یادو[1] شارع عام پر مارا گیا جو کسی مسلمان کی گولی بھی ہوسکتی ہے اور پولیس کی بھی۔

اس سے قبل ۴/ فروری کو ایک کنجر نامی ہندو مارا گیا جو ہجوم کے ساتھ ایک مسلمان کے مکان میں آگ لگا رہا تھا۔ اور اس مسلمان نے اپنی لائی سنس شدہ بندوق سے گولی چلا دی جس سے کنجر نامی شخص مر گیا۔

مقامی افسروں کا رویہ ایسا تھا کہ خود وزیراعظم نہرو نے بھی اس کی سخت نکتہ چینی کی۔ مقامی سرکاری ملازم مدھیہ پردیش کے پس ماندہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں یا فرقہ پرستی سے متاثر۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا کہ پولیس اور شہری نظم و نسق کے اہم لوگ

---

[1] ہندوؤں کی اک ذات۔

فرقہ وارانہ زہر سے متاثر تھے۔ اور انھوں نے جن سنگھ سے ملکر کام کیا۔

مقامی جن سنگھ نے ایک بیان جاری کیا جس میں پولیس کی تعریف کی گئی تھی اور عوام سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ غنڈوں اور پاکستان کے پانچویں کالم کو ختم کرنے کے لیے پولیس سے پوری طرح تعاون کریں۔

وزیر اعظم نہرو کے بیان کے بعد پولیس اور دوسرے افسران نے عوام کو خوفزدہ کرنا شروع کر دیا تاکہ وہ تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے گواہی نہ دیں۔

جن سنگھی وکیلوں نے اپنے ساتھیوں (ہندوؤں) کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ مسلمانوں کی پیروی نہ کریں۔

جبل پور میں جو کچھ ہوا وہ ہندستان میں کہیں بھی ہو سکتا ہے۔

پی۔ سی۔ جوشی جو برہمن خاندان کے ایک فرد ہیں اور کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر ہیں انھوں نے یہ رپورٹ جبل پور کے فساد سے متعلق تیار کی جس کو "جبل پور، جمہوری عناصر کے لیے لمحہ فکر" کے عنوان سے چھاپا گیا اسکا خلاصہ اس لیے پیش کیا گیا کہ یہ بات سمجھنے میں آسانی ہو کہ خود پنڈت نہرو جب انتظامیہ، پولیس اور بلوائیوں کے سامنے بے بس تھے تو محترمہ اندرا گاندھی کی کیا حیثیت ہے۔ اسلئے اس طرح کے واقعات کو سوائے طاقت کے کسی اور طریقہ سے روکا نہیں جاسکتا اسلئے کہ اس ملک کے قومی مزاج میں طاقت کی پرستش رچ بس گئی ہے۔ اس رپورٹ کے ذریعہ، پولیس، انتظامیہ، نیشنل پریس اور ملک کی سیاسی پارٹیوں اور سرکار، سب کا رویہ کھل کر سامنے آچکا ہے۔ تحقیقاتی رپورٹوں کو نہ تو کوئی دیکھتا ہے نہ عمل ہوتا ہے اور نہ ہی اسکی کوئی اہمیت ہے اسلئے کہ اس مسئلہ پر کوئی سنجیدہ رُخ ملکی قیادت نے اپنانے کی ضرورت پر غور ہی نہیں کیا۔

وحشت روا، عناد روا، دشمنی روا — ہل چل روا، خروش روا، سنسنی روا
رشوت روا، فساد روا، رہزنی روا — القصہ ہر وہ شے کہ ہے ناکردنی روا

اب بوئے گل نہ باد صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

(الف) تصوراتی دستور ہند

اس وقت ملک کی اکثریت کے اکثر لیڈر فرقہ پرستی کی زبردست طاقت کے مالک بن چکے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف ان کی نفرت آمیز ذہنیت اور تکبّر نے جس جارحیت کا رخ اختیار کرلیا ہے اس کا اندازہ دور سے نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ذہنیت صرف ہندستان کے اندر ہی مسلمانوں کو میٹ دینے کے منصوبے نہیں بنا رہی ہے بلکہ اس کے عزائم عالم اسلام کو نیست و نابود کر دینے کے ہیں۔ جس کے سامنے اسرائیلی جارحیت بھی ماند پڑ جائے گی ...... یا اگر اسرائیل کے پاس اتنی طاقت آجائے اور اس لیڈر شپ کی مدد کے بعد عالم اسلام جانبر نہ ہوسکے تو یہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر عالم اسلام کو میٹ دینے کے لیے اسرائیل کی ہمنوا بن جائے گی...... اس کا اصل سبب، ہندوؤں کا اونچ- نیچ کا مزاج ہے اور عظمت و بزرگی اور بڑائی، برہمن کے لیے ہے اور یہی تصور یہودیت کا ہے اس طرح تصوراتی طور پر ہندو لیڈر شپ جو برہمنوں کے ہاتھ میں ہے اس کے اور یہودیت کے درمیان کوئی دوری نہیں ہے جبکہ اسلام اس تصور کا شدید مخالف ہے اور وہاں عظمت و بڑائی کا پیمانہ اعمال حسنہ ہیں نسل و قوم نہیں اور یہی بنیادی اختلاف نظریاتی طور پر ایک ہزار برس سے ہندستان میں ہندو فکر اور اسلامی فکر کے درمیان موجود ہے۔ مسلمانوں کے عہد حکمرانی میں یہ اختلاف ابھر نہیں پایا لیکن آزادی کے بعد شور انگیز طوفان بن کر امڈتا رہا ہے اور پچھلے ۴۶ برسوں سے ہندستانی مسلمان اس طوفان کی ہیبت ناک لہروں کا شکار بنتے رہے ہیں۔

59

○ مسلمان آہستہ آہستہ پست ہمتی کی ایسی منزل کی طرف جا رہے ہیں، جہاں دستوری حیثیت سے ملنے والے برابری کے شہری حقوق کی بے اثری کی وجہ سے گر کر تیسرے درجہ کے شہری بنتے جا رہے ہیں۔

○ ملک کے سیکولر لیڈر اور صاف ذہن رکھنے والے افراد بھی ہندو فرقہ پرستوں کے

دباؤ کے آگے جھک کر یہ سوچنے لگے ہیں کہ مسلمانوں کو اکثریت کی خواہشات کا تابع بن کر رہنا ہے اور اساطیری تمدن کے روایتی تصورات کے آئینہ میں اپنے کو ڈھالنا پڑے گا، اس کے بغیر قومی یکجہتی کے لیے مسلمان خطرہ بنے رہیں گے۔

ان حالات میں ملت اسلامیہ کے جو عناصر جہاں سے بھی مسلمانان ہند کو ان خطرات سے بچانے کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں اس میں تساہلی کو ایک ناقابل معافی گناہ سمجھتے ہوئے اپنا سب کچھ اس راہ میں جھونک دینے کے لیے تیار رہیں ورنہ ہمارے ساتھ پوری ملت اسلامیہ کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔

ہمارے پاس اپنے درد و کرب کے آزادانہ اظہار کا دوسرا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

عالم اسلام کے لیے یہ سوچنے کا وقت آگیا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کا وجود کس طرح باقی رہ سکتا ہے؟ ہندستان کی ہندو ٹائپ آف سیکولر حکومت اگر ہماری طرف سے غافل ہو کر ہمیں میٹ دینے کی در پے ہے، تو اسلامی حکومتیں کیوں غافل ہیں؟

سوچنے کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کو موجودہ مرعوبیت اور احساس بے چارگی سے کیسے نکالا جائے؟ حقائق کا احساس و ادراک نہ کرنے والی اقوام صفحہ ہستی سے نابود ہو جایا کرتی ہیں۔ ہندستان کے مسلمان بحیثیت مسلمان عالم اسلام کے لیے کیا قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ ہمارے مٹنے کے بعد ہو سکے گا (اگر عالم اسلام اس حادثہ کے بعد بقید حیات رہا) کہ یہ مجبور و بیکس ہی اس کی طاقت و قوت کا سرچشمہ تھے۔ یہ بات پچھلے دو سو برس کی تاریخ سے روشن آفتاب کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ مشرق وسطیٰ کی سیاست پر کتنا گہرا اثر برصغیر کا پڑتا رہا ہے ـــــ ہندستان سے انگریز کے نکلے بغیر مشرق وسطیٰ میں بھی آزادی کا آفتاب اپنی شعائیں نہ پھیلا سکا۔ اور ہندستان کے انگریزی غلامی میں جاتے ہیں عالم اسلام بھی انگریز کا غلام ہو گیا۔

کوئی تبدیلی نہیں:- ٹکراؤ کی کوئی تبدیلی ایک ہزار برس میں ہندستان کے حکمراں طبقہ نے قبول نہیں کی۔ وہ ٹکراؤ ہر سطح پر آج بھی جاری ہے۔ رئیس الدین

فریدی"اخبار نویس کی کہانی" قسط ۹ ہفتہ وار اجالا کلکتہ ٦/ نومبر سنہ ۱۹۸۳ء میں ۱۵/ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کے بمبئی میں جشن آزادی کی تقریب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔۔۔۔" بی۔جی۔ کھیر اور مرارجی ڈیسائی، ایک انتہائی فراخ دل، دوسرا انتہائی تنگ نظر "رئیس الدین فریدی صاحب نے فورٹ بمبئی کے علاقہ میں کانگریس کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے تقریر کی جس میں سنہ ۱۸۵۷ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک مسلمانوں کی قربانیوں کا ذکر کیا۔ بی۔جی۔ کھیر نے اس کی تائید کی لیکن جب مرارجی کھڑے ہوئے (جو بقول فریدی صاحب ان کی اور کھیر صاحب کی تقریر پر طنزیہ طور پر مسکراتے رہے تھے) تو انھوں نے کہا۔۔۔۔" مسلمانوں کو کافی بدلنا پڑے گا۔ ہندو زمانہ قدیم سے ہی فراخ دل ہے اور ہم آج بس اس کے لیے تیار ہیں کہ اگر مسلمان چاہیں تو ہم ان کے مذہب کو بھی ہندو مت کا ایک انگ (حصہ) بنا سکتے ہیں۔ جس طرح ہمارے ہزاروں دیوی دیوتا ہیں اسی طرح مسلمان بزرگوں کو بھی ان میں شامل کر سکتے ہیں۔ اور مسلمان ہندوؤں کی ایک ذات کی طرح یہاں رہ سکتے ہیں۔"

سنہ ۱۹٦۳ء میں یو۔پی کے مسلم کش فسادات کے بارے میں مرکزی وزیر داخلہ لال بہادر شاستری نے نے کہا۔۔۔" ہمارے لیے یہ فیصلہ کا وقت آگیا ہے کہ ہندستان میں اقلیتوں کا وجود باقی رہنے دیا جائے گا یا نہیں؟"

یو۔پی کے وزیر داخلہ چودھری چرن سنگھ نے ان فسادات کے بارے میں ۱۰/ اکتوبر سنہ ۱۹٦۳ء کو فرمایا۔۔۔"یو۔پی کے ہنگاموں میں تمامتر جارحیت اکثریت نے کی، اول سے آخر تک اسی کی زیادتی رہی اور مسلمان تمامتر بے خطا، مظلوم ہوئے۔"

لیکن آگے کہا۔۔۔۔"اس مسلم کشی کا کوئی پائیدار اور مستقل علاج اس وقت تک نہیں ہوسکتا، جب تک مسلمان سماجی اور تمدنی اعتبار سے اپنے جداگانہ وجود پر اصرار کرتے رہیں گے۔" مسلمانوں کے الگ تھلگ رہنے کے رویہ کو ان آدھے درجن سے زیادہ جماعتوں کی وجہ سے تقویت ملتی ہے، جو سماجی مذہبی یا تمدنی میدانوں میں کام کرتی

ہیں، یہ جماعتیں ہندستانی قوم کی وسیع تر وحدت کے ساتھ مسلمانوں کی مطابقت میں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔"

۱۹/ اکتوبر سنہ ۱۹۶۳ء کو انھوں نے بھارتی سنسکرت سمیلن بنارس کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا ..... "ہندستان میں صرف ایک سماج اور ایک کلچر ممکن ہے۔"

گفتگو کا دوسرا رُخ:- راشٹریہ سیوک سنگھ کے رہنما گرو گولوالکر جی انھیں دنوں ناگپور میں (مہاراشٹرا) "شاستر پوجن" کے موقع پر کہہ رہے تھے .... "قومی یکجہتی کے لیے ضروری ہے کہ اقلیت اکثریت کا کلچر اور روایات کو تسلیم کرے، اکثریت سے یہ مطالبہ کرنا انتہائی غیرمناسب ہے کہ وہ اپنے کو اقلیتوں کی سہولتوں اور ضروریات کے مطابق بنائے۔"

بظاہر یہ الفاظ شاندار ہیں مگر فتنہ پیدا کرنے والے ہیں۔ قومی یکجہتی کے تصور سے ہی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف قوموں کو ان کے طریق زندگی کے ساتھ گوارا کر کے ملک کو ایک سمت میں لے چلا جائے تاکہ مسلمانوں کی فکر و نظر کو میٹ کر ایک قوم بنا دیا جائے۔

اسی بیچ کرپلانی کمیٹی کی سفارشات آئیں جس میں اردو کی جڑ کاٹ دی گئی۔ لیکن اس کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس کمیٹی کے پانچ ارکان جو اردو کے تھے، جن میں دو جمعیتہ العلماء ہند کے لیڈر، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے وائس چانسلر مسٹر بشیر حسین زیدی، الہ آباد یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اعجاز حسین، پنڈت نہرو کے اردو ترجمان قومی آواز لکھنؤ کے ایڈیٹر حیات اللہ انصاری تھے اس رپورٹ میں اردو کے رسم الخط کے خاتمہ کی سفارش کی گئی تھی جس کی حمایت میں ایڈیٹر قومی آواز نے بحث بھی شروع کر دی اور اپنی کتاب "دس دن میں اردو" میں اردو کو "الف" کی برادری سے نکالکر لالہ کی برادری میں کھڑا کر دیا اور اللہ کے بجائے لالہ سے اپنی کتاب شروع کی ..... !

اردو کے رسم الخط کے خاتمہ کی بازگشت "لسانی اقلیتوں کے حقوق" سے متعلق

ریاستی وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس منعقدہ ۱۰/ تا ۱۲/ اگست سنہ ۱۹۶۱ء میں بھی سنائی دی جس کی تفصیل اسی عنوان کے تحت جمعیتہ علماء ہند بہادر شاہ ظفر مارگ (روڈ) نئی دہلی نے شائع کی ہے۔ اس کتابچہ کے صفحہ ۹ پر نمبر ۸ پر ... "میٹنگ کی رائے تھی کہ ہندستان کی سب ہی زبانوں کے لیے ایک ہی رسم الخط نہ صرف پسندیدہ ہوگا بلکہ ہندستان کی مختلف زبانوں کے درمیان مضبوط رابطہ بھی ہوگا۔ اور بنا بریں یکجہتی کے قیام میں ایک بہت بڑا معاون عنصر بھی، ہندستان میں ایسا مشترک رسم الخط موجودہ حالات میں صرف دیوناگری ہی ہوسکتا ہے۔"

اسی کتابچہ کے صفحہ ۱۰، ۱۱ پر ... "اگرچہ ریاست میں اس کے سرکاری کام کاج کے لیے کئی بازاری زبانیں ہوسکتی ہیں۔ تاہم اس امر کو تسلیم کرنا چاہئے کہ بحیثیت مجموعی ریاست واحد لسانی ہے۔"

یہاں دوسری زبانوں کو بازاری زبان کہہ کر تذلیل کی گئی ہے۔ جسکا اشارہ صرف اردو کی طرف ہے۔ اسلئے کہ دوسری ریاستوں نے اپنے یہاں ہندی کو داخل نہیں ہونے دیا۔ جن میں جنوبی ہند، بنگال، آسام اور دوسری ریاستیں شامل ہیں۔ ان تجاویز کا بنیادی مقصد صرف اردو پر چوٹ کرنا رہا تھا اور ہے۔

انھیں دنوں کرپلانی کمیٹی کے بعد اشوک مہتا سوشلسٹ لیڈر کی رہنمائی میں قومی یکجہتی کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ انھوں نے درمیانی راہ نکال کر بقائے باہم کے اصول کی بنیاد پر مفاہمت کے بجائے مسئلہ کو الجھا کر مسلمانوں سے لڑائی چھیڑ دی اور جمعیتہ العلماء ہند کے وفد سے اس راہ کے پہاڑوں کو گرانے کے لیے مسلم و کافر کا فرق، دارالاسلام، اور دارالحرب کے مسائل کھڑے کردیئے۔

ان علماء کے پاس وہ دینی بصارت اور جرات ایمانی کہاں تھی جسکا مظاہرہ نجاشی شاہ حبش کے دربار میں عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مسلمان کرچکے تھے، لہٰذا انھوں نے کہدیا کہ یہ مسائل اس کمیٹی کے دائرہ اختیار سے باہر کے ہیں۔ حالانکہ ان کی ذمہ داری تھی کہ ان اسلامی اصطلاحات کی اصل حقیقت کھول کر سامنے رکھ دیتے۔

یہ بحث چل ہی رہی تھی کہ چین نے آدبوچا تو اوسان خطا ہوگئے اور ان مباحث کو پس پشت ڈالکر ملکی دفاع کی اولیت کا مسئلہ سب کچھ بھلا کر سامنے رکھدیا گیا۔

لیکن دوسرے محاذ سے پھر حملہ بھی کردیا گیا۔ کہاں چینی حملہ کی بات تھی، کہاں مسلم حکمرانوں سے، ملک کے موجودہ مسلم عوام تک ملک کے اعلیٰ دماغ۔۔۔ میر مہانک، جا پہونچے اور کہنا شروع کردیا کہ اگر چینی لشکر بیرونی خطرہ ہیں تو ملک کے اندر مسلمانوں کا وجود اندرونی خطرہ ہے۔"

اور تو اور یو۔ پی کے سابق وزیر اعلیٰ اور اس وقت کے راجستھان کے گورنر مسلم تہذیب کے دامن میں پرورش پانے والے سمپورنانند نے "پنچ جنیہ" میں جو آر۔ ایس۔ ایس کا ترجمان ہے ایک مضمون لکھا جس میں کشمیر کی تاریخی حیثیت سے بحث کرتے ہوئے بھارت کا انوٹ انگ (ناقابل تقسیم حصہ) کا ذکر کرنے کے بعد کہا۔۔۔ "نہایت درد و کرب کا پہلو وہاں سے نکلتا ہے، جب وہاں کا ایک شاہی خاندان مسلمان ہو گیا اور پھر وہاں مسلمان ہی مسلمان نظر آنے لگے۔ دوسری بری بات یہ ہوئی کہ سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۲ء پنجاب کے مسلمانوں کی ایک تعداد کشمیر میں جا بسی۔"

نہ تبدیل ہونے والے ذہن کی نفرت اور خوف کی یہ مہم دھیرے دھیرے تناور درخت بنتی چلی گئی۔ یہ سب پنڈت نہرو کے وزرائے اعلیٰ اور صوبوں کے گورنر ان کی موجودگی میں کہہ رہے تھے۔ خود پنڈت نہرو بھی ایک بار شیخ عبداللہ مرحوم کو دھمکا چکے تھے کہ اگر کشمیر پاکستان میں چلا گیا تو ہندستان کے مسلمانوں کا کیا ہوگا۔ گویا کشمیر کے عوض ہندستانی مسلمان یرغمال ہیں۔

یہ ۴۶ سالہ عہد آزادی مسلمانوں کے لیے بھی مسرت آگیں ہونا تھا، ہندستان کی قومی ترقی کی شاہراہ زندگی پر دستور ہند میں دی گئی ضمانتوں کے سہارے انھیں بھی دوڑنا تھا لیکن ان کی زندگی یکسر یاس و نامرادی، شکستگی اور پژمردگی کا ہمالہ بنتی چلی گئی۔ یتیمی کی زندگی ان کا مقدر بنادی گئی اور یہ احساس بڑھتا چلا گیا کہ بھارت کی زمین ان کے لیے سخت اور آسمان دور ہے، نہ ملک کے اندر ان کے لیے باعزت جگہ ہے نہ ملک کے باہر۔

مسلمانوں پر اس وقت مایوسی اور جمود کا عالم طاری ہے اور عالم اسلام کو اس خطرہ کا احساس نہیں کہ سنہ ۱۶۱۰ میں اسپین میں مسلمانوں کے قتل و غارت گری اور بے دخلی سے عالم اسلام کے بے تعلق رہنے کے نتیجہ میں ایک صدی کے اندر عالم اسلام کے ہاتھ سے عالمی قیادت نکل گئی۔ عالمی سطح پر مسلمانوں کی خبرگیری اور باہمی ربط ہی انھیں زندہ رکھ سکتا ہے۔ اسلئے کہ کوئی بھی بحیثیت مسلمان ہمیں گوارا کرنے کو تیار نہیں ہے نہ مسلم عوام کو نہ عالم اسلام کو!

(ب) دستور ہند، اقلیت و اکثریت کے درمیان معاہدہ!

دستور، دراصل کسی ملک میں بسنے والی مختلف قومیتوں اور قوموں کے درمیان ایک ایسا معاہدہ ہے جس کی پابندی دوطرفہ ہونا ضروری ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اکثریت اپنی طاقت اور قوت کے بل پر اس کے تقدس کو پامال کرتی رہے اور اقلیت کے گلے میں اسکا قانونی طوق ڈالکر دوڑنے کو کہا جائے۔

ہندستان کے حکمرانوں اور لیڈروں نے اس دستوری معاہدہ کی پابندی نہیں کی اور ہر موقع پر اسے پامال کرتے رہے، جس کی مثالیں باب الف میں دی جاچکی ہیں۔ اس قوم کے حاکموں کی معاہدہ شکنی کی داستانیں سبکتگین و محمود غزنوی سے لیکر اسوقت تک تاریخ کی کتابوں اور اخبارات کے صفحات پر بکھری پڑی ہیں۔ یہاں انھیں نقل کرنا مقصود نہیں لیکن اس دور میں بھی بین الاقوامی معاہدہ کو بھی اس ملک نے بے شرمی سے ہمیشہ توڑا ہے۔ پنڈت نہرو کے زمانہ میں جمال عبدالناصر صدر متحدہ عرب جمہوریہ (مصر) اور ہندستان کے درمیان ایک جہاز سازی کا معاہدہ ہوا تھا جسکو ہندستان نے غالبًا روسی مگوں کی فراہمی کے بعد توڑ دیا تھا۔

ابھی قریب میں پاکستان سے بمبئی میں قونصل خانہ کھولنے کو کہا اور اس کے لیے بمبئی کے جناح ہال کی پاکستان کو پیش کش کی۔ پھر کچھ دنوں کے بعد کہدیا کہ پاکستان کو بمبئی میں قونصل خانہ کھولنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

لیکن ۲/ ستمبر سنہ ۱۹۸۳ کو پارلیمنٹ میں وزیرخارجہ پی-وی- نرسمہاراؤ نے (راجیہ سبھا میں) کہا ..... "بمبئی میں جناح ہاؤس کو حکومت پاکستان کو اس کے کاؤنسلر جنرل کی رہائش گاہ کے لیے پٹے پر دیئے جانے کا حکومت پاکستان سے حتمی وعدہ نہیں کیا گیا تھا۔"

حتمی وعدہ اور نرسمہائی وعدہ کا فرق سامنے آگیا۔

وزیرخارجہ کے اس بیان کو سردار خشونت سنگھ نے اعتماد شکنی سے تعبیر کیا اور دو برس قبل لوک سبھا میں وزیرخارجہ نرسمہاراؤ کی اس یقین دہانی کا ذکر کیا کہ جناح ہاؤس حکومت پاکستان کو پٹے پر دینے کے لیے شرائط وضوابط طے کئے جارہے ہیں۔ آگے سردار خشونت سنگھ نے یاد دلایا کہ اس سال جنوری (سنہ ۱۹۸۳) میں وزارت خارجہ کے ایک سکریٹری نے بھی اس یقین دہانی کا اعادہ کیا تھا۔ اور آخر میں انھوں نے سوال کیا کہ آخر حکومت اپنی یقین دہانی سے اب پیچھے کیوں ہٹ رہی ہے؟

اس پر وزیرخارجہ نے کہا ..... "پاکستان کو پٹہ پر نہ دینے کا فیصلہ کرنے سے قبل معاملہ کے متلعقہ پہلوؤں پر غور کیا گیا؟"

جو سمجھدار آدمی کرتا ہے وہی بیوقوف مگر تمامتر بربادی کے بعد۔ عقلمند پہلے سوچتا ہے پھر کہتا ہے۔ بےوقوف پہلے کہتا ہے پھر سوچتا ہے۔

یہی کہانی دستور ہند پر صادق آتی ہے اور وقتاً فوقتاً متعلقہ پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اس کی دفعات کو روندا جاتا ہے۔

دستور ہند اور بنیادی حقوق

آزادی کی لڑائی کے زمانہ میں اہل آزادی کو شہری آزادی اور بنیادی حقوق سے محروم ہونا پڑتا تھا۔ اسلئے وہ شہریت کے بنیادی حقوق کے اعلان اور ضمانت کو آزاد سیاسی نظام کیلئے ضروری سمجھتے تھے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ بنیادی حقوق کے منشور کے ذریعہ اقلیتوں کو مطمئن کرنے میں مدد ملے گی اور اکثریتی حکومت کے سیاسی نظام میں ان کے مفادات اور حقوق محفوظ رہیں گے۔

ان بنیادی حقوق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کا تعلق شہریت کے بنیادی حقوق سے ہے اور ان کے متعلق قانونی چارہ جوئی کا حق دیا گیا ہے۔

دوسری قسم کا تعلق ریاستی پالیسی کے رہنما اصول سے ہے۔ ان اصول کا عدالت کے ذریعہ نفاذ نہیں کرایا جاسکتا۔ ہم یہاں پہلی قسم سے بحث کریں گے جو ہم سے متعلق ہے۔

شہریت کے بنیادی حقوق کی ضمانت کا اصل مقصد ہے، حکومت کی من مانی اور تفریق آمیز طریق کار سے فرد کی حفاظت کرنا۔ اس کے متعلق عدالت سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ ایک آزاد، مضبوط اور غیرجانبدار عدلیہ کو ان کا نگراں بنایا گیا ہے۔ ان حقوق میں مساوات، آزادی مذہب، آزادی تقریر اور ثقافتی حقوق شامل ہیں۔

سیکولرازم، ملک میں مختلف مذہبی فرقوں اور جماعتوں کی موجودگی کا تقاضا تھا، چنانچہ دستور سازوں نے اسے ایک سیکولر ریاست بنانے کا فیصلہ کیا۔ سرکار کا کوئی مذہب نہیں ہوگا۔ نہ (دستور کے تعلق سے) کسی مذہب کو دوسرے پر کوئی ترجیح دی جائے گی اور نہ کسی مذہب کے خلاف تعصب برتا جائے گا۔ تمام فرقوں کے درمیان جھگڑوں میں سرکار غیرجانبدار رہے گی۔

بنیادی حقوق کے ذریعہ مذہبی عقیدہ کی مساویانہ آزادی، اور تمام مذہبوں کے شعائر

رسومات تعلیمی اور خدمت خلق کے اداروں کے ضامن قرار دیئے گئے تھے۔ ہندستانی آبادی کی مذہبی، لسانی، تہذیبی اور نسلی رنگارنگی کی دستور نے ضمانت دے دی۔ اس طرح اقلیتوں کے حقوق، تمام فرقوں اور قوموں کو مذہب، عقیدہ اور کلچر کی آزادی کا یقین دلایا گیا۔ ملک کے مختلف فرقے اور مختلف العقیدہ لوگ دستور کی نظر میں برابر رکھے گئے تھے۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دستور کی ان دفعات پر جن کا تعلق اقلیتوں کے تحفظ سے ہے عمل نہیں ہوا نہ ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں میں مایوسی گھر کرتی چلی گئی اور آج ملک اس ناانصافی کی وجہ سے حالت انتشار میں گرفتار ہو گیا۔

ایک سیکولر طرز زندگی اور طریق حکومت کیلئے ضروری ہے کہ ریاست اور قومیت کے تصورات کو ایک دوسرے سے الگ رکھا جائے، یعنی حکومت اور ریاست کو کسی مذہب یا تہذیب کی طرفداری کے لیے استعمال نہ کیا جائے..... لیکن آزادی کے بعد اکثریتی گروہ میں ہندوازم کے احیاء کا جذبہ شدید ہوتا چلا گیا، جسکا منفی پہلو یہ ہے کہ یہاں کے لیڈروں کو یہ گوارا نہیں کہ یہاں اور تہذیبیں بھی زندہ رہ سکتی ہیں، اور انھیں بھی اپنا تہذیبی، مذہبی اور روحانی سرمایہ اکثریت ہی کی طرح عزیز ہے...پھر یہ گروہ اور اس کے لیڈر یہ بھی بھول گئے کہ اپنے عہد حکمرانی میں مسلمانوں نے انھیں ان کی مذہبی، تہذیبی اور لسانی روایات کے ساتھ زندہ رہنے کا حق دیا تھا اور اگر یہ نہ ہوتا تو آج ان کی داستان سنانے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔

مشترکہ شہری تقاضوں کا شعور پیدا کئے بغیر پارلیمانی اداروں کی حیثیت بے روح ڈھانچے سے زیادہ نہ رہ سکے گی... لیکن موجودہ لیڈرشپ اپنی ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے کتراتی ہے۔

جس کی وجہ سے مسلمانوں کی زندگیاں ہمہ وقت بے رحم بگولوں کے داؤں پر لگی ہوئی ہیں۔

سیاسی طاقت اور حکومت ہندوؤں کے اونچے طبقہ کی میراث بن چکی ہے، لیکن آہستہ

آہستہ آہستہ متوسط طبقہ بھی حکمرانی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور دولت بھی انھیں میں سمٹ کر جمع ہو رہی ہے۔ اس طرح سارے وسائل پر انھیں کا قبضہ ہے، اسلئے کہ یہ ایسی ترجیحی پوزیشن میں ہیں کہ سیاسی طاقت و اقتدار کو اپنے ذاتی نفع کے لیے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ تنقید اور اختلاف رائے برداشت کرنے کا مزاج کہیں بھی پایا نہیں جاتا۔ اگرچہ آج دونوں طبقے شدید ترین رقابتوں کا شکار ہیں لیکن دوسروں کو دبانے کے لیے متحد بھی ہو سکتے ہیں۔ دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کا مزاج آج بھی اس قوم کا بدلہ نہیں ہے۔ بظاہر اور بہ زبان خویش بلند دعوؤں کے پیچھے غیر جمہور مزاج کارفرما ہے۔ جس کے مناظر پورے ہندستان کے ذرے ذرے پر بکھرے پڑے ہیں۔ ایسی آزادی گفتار سے فائدہ ہی کیا کہ پورے ملک میں کمزوروں اور مظلوموں کی فریاد سننے والا بھی کوئی نہ ہو.... اس لیے کہ ملک کی فکر کا اندازہ.... گاندھی جی کے تین بندروں سے ہوتا ہے جن میں ایک کانوں پر ہاتھ رکھے ہے، ایک منہ پر اور ایک آنکھوں پر اس طرح ہندستان کا موجودہ سیاسی نظام، اندھا، گونگا اور بہرا بنا ہوا ہے۔

کوئی صاحب نظر اور ہندستان کی اندرونی کیفیت سے واقفیت رکھنے والا نہیں دیکھ سکتا ہے۔

ہندستان کے لیڈروں کے لیے جمہوریت سے زیادہ انسانیت اور انسانی قدروں کے احترام کے جذبہ کا احساس کرنا ضروری ہے تاکہ وہ دوسروں کی فکر و نظر کو بخوشی برداشت کرنے کے عادی بن سکیں، لیکن وہ تو جمہوریت کی راہ سے سیاسی نفرت انگیزی کیا کرتے ہیں۔

ان لیڈروں کا کام تھا کہ وہ اپنے عوام میں سماجی ذمہ داریوں اور دوسروں کو رواداری کے ساتھ گوارا کرنے کا احساس پیدا کرتے.... مگر وہ خود ہی اس احساس سے یکسر عاری ہیں۔

جمہوریت کی کامیابی کے لیے ایک لائق اور دیانت دار انتظامیہ، اور بالغ نظر عدلیہ کی ضرورت ہے۔ فلاحی ریاست کا تصور ایک مستعد، ایماندار، فرض شناس اور قابل

سول سروس کے بغیر کرنا ہی بے معنی بات ہے۔ فرقہ وارانہ تعصب نے ذہنوں کو غلیظ، نگاہوں کو شعلہ جوالا اور زبانوں کو زہرآلود بنا دیا ہے۔

جمہوری حکومت کی اولین شرط ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی عزت، آبرو اور جان و مال کا تحفظ کرے ـــــ اور ہندستان کی حکومت ایسا کرنے میں پوری طرح ناکام رہی ہے!

جب آدمی پہ تنگ ہوا عرصۂ حیات
ویران ہی رہے گا کوئی گھر کہیں بنے
جو ملک آسمان سے وسعت میں کم نہیں
اتنا سمٹ نہ جائے کہ دو گز زمیں بنے

دستور کی ـــ خلاف ورزیاں

ملک کے دستور اور اپنی پارٹیوں کے منشور کی اتنی خلاف ورزی دنیا کی کسی قوم اور جماعت نے نہ کی ہوگی جتنی ہندو قوم کے لیڈروں اور کانگریس کے ذمہ داروں نے کی ہے!

سنہ ۱۹۸۰ء کے پارلیمانی چناؤ میں کانگریس (ا) نے "ہمارا عہد" کے عنوان سے اترپردیش کانگریس آئی کے صدر دھرم ویر کے ہاتھوں اپنا الکشنی منشور شائع کیا۔ اس کے صفحہ ٦ پر "زبان" کے عنوان کے تحت لکھا ہے ـــ "اردو ہمارے پردیش (صوبہ) کی ایک مالامال زبان ہے۔ اس کی ترقی اور اردو پڑھنے والے طلباء کو بڑھاوا دینے کے لیے کارگر قدم اٹھائے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی اس زبان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے پردیش کی دوسری زبان بنانے کے لیے ضروری قدم اٹھائے جائیں گے۔"

اترپردیش میں کانگریس (ا) کی وزارت کے ایک رکن (وزیر غذا و رسد) باسدیو سنگھ نے ۲۲/ اپریل سنہ ۱۹۸۲ء کو لکھنؤ میں کہا ـــ "اردو کو اگر دوسری سرکاری

زبان بنایا گیا تو عوام حکومت کے رویہ کے خلاف تشدد پر اتر آئیں گے۔" (عوام سے ان کی مراد ہندو عوام اور یہ تشدد ہوگا مسلمانوں کے خلاف)

انھوں نے یہ بھی کہا۔۔۔ "اسمبلی میں اس بل کو پاس کروالینا آسان نہ ہوگا۔ یہ دستور ہند اور آئین کے خلاف ہونے کے ساتھ ہی کانگریس (ا) مینی فسٹو کے بھی خلاف ہے۔ جو ایسا کہتے ہیں کانگریس مینی فسٹو میں ریاست کی دوسری زبان اردو بنانے کی بات کہی گئی ہے وہ کانگریس (ا) کے مخالفوں کی بنائی ہوئی ہے۔"

اس کو کہتے ہیں اندھے کے آگے روئے اپنے دیدے کھوئے۔ اب "ہمارا عہد" کا اعلان صحیح ہے یا باسدیو سنگھ کا۔ کس کو کون صحیح مانے گا؟

اس اعلان جنگ کے خلاف وزیر موصوف کے خلاف نہ تو تادیبی کاروائی ہوئی نہ وزیر اعلیٰ وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے کسی رد عمل کا اظہار کیا نہ خود محترمہ اندرا گاندھی نے کچھ کہا اور وہ بدستور اترپردیش وزارت میں کام کر رہے ہیں۔ ہاں اس بیان سے اتنا فائدہ ضرور ہوا ہے کہ کانگریس کے بڑے نیتا اور مسلم ممبران قانون ساز کے چہروں سے باسدیو سنگھ نے وہ پر فریب پردہ اٹھا دیا جسے ڈالکر وہ عوام کے بیچ گھوما کرتے تھے۔

لکھنؤ، دہلی کے مشرق میں ہے اور نوابین "اودھ" (جن کا دارالسلطنت فیض آباد پھر لکھنؤ بنا) نے انگریزوں کے اشارے پر جب مرکز سے گریزاں ہو کر اودھ کی وزارت سے حکمرانی اختیار کرلی تو اس پر مصحفی نے ایک شعر کہا تھا۔

جو کچھ وہ پڑھائیں وہی منہ سے بولیں
بنگالہ کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر

بالکل یہی حالت اسوقت ہندستان کے مسلم ممبران قانون ساز اور سربر آوردہ مسلمانوں کی ہے کہ وہ حکمران طبقہ اور اپنی پارٹی کے لیڈروں کے اشاروں پر جھوٹ بولا کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی انھیں لیڈروں میں سے کسی کی زبان پر اندرونی کیفیت ظاہر ہو کر ان بنگالہ کی میناؤں کے لیے شرمندگی کا سبب بن جاتی ہے۔

دستور کے شیڈول ۸ میں دوسری بہت سے زبانوں کے ساتھ اردو کو بھی ہندستان کی

زبانوں میں ایک زبان مانا گیا ہے ...... لیکن اس کے بعد بھی دستور کی روح کے خلاف اردو کی مخالفت میں بیانات دیکھیں۔

"ہندی ساہتیہ سمیلن" (ہندی ادبیات کی ترقی و ترویج کا ادارہ) جس کی صدارت کا دوبار شرف مہاتما گاندھی کو بھی حاصل ہوا۔ اس کی رائے یہ ہے کہ اردو کے لیے کوشش کرنا غداری اور فرقہ وارانہ عمل ہے۔

پرشوتم داس ٹنڈن انڈین نیشنل کانگریس کے صدر پنڈت نہرو کے زمانہ میں رہے۔ ہندی ساہتیہ سمیلن نے ان کی موجودگی میں یہ تجاویز پاس کیں ..... "یو- پی میں اردو کے علاقائی زبان بنانے کے سلسلہ میں بیس لاکھ دستخطوں پر مشتمل میمورنڈم صدر جمہوریہ کو پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں صدر جمہوریہ اور یو- پی سرکار کو، یو- پی کے اتحاد کو خطرہ میں ڈالنا نہیں چاہئے۔ اسلئے کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی تحریک غداری اور تنگ نظری پر مبنی ہے۔" ..... جو لوگ یہ مطالبہ کر رہے ہیں وہ بدیشی (غیر ملکی) کلچر سے تعلق رکھتے ہوئے اپنے کو ہندو کلچر کے مطابق نہیں بدل رہے ہیں۔ اور اسٹیٹ کے اتحاد کو خطرہ میں ڈال رہے ہیں۔ ایسے لوگوں پر کڑی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ سمیلن کے نزدیک انجمن ترقی اردو کی شاخیں فرقہ وارانہ اور غدارانہ ہیں۔

(لیڈر ۱۵ / جنوری سنہ ۱۹۵۴ء)

انجمن ترقی اردو کو بھی کانگریسی مسلمان سرکاری امداد سے چلاتے ہیں اور سمیلن بھی سرکاری امداد سے چلتا ہے۔

آل انڈیا ہندو مہا سبھا کے صدر نے سبھا کے چوالیسویں اجلاس منعقدہ بنارس ۲۰ / فروری سنہ ۱۹۵۹ء کو کہا..... "ہندی، ہندو، ہندستان"۔

اسکا مطلب یہ ہوا کہ نہ تو یہاں دوسری زبان چلے گی، نہ مذہب۔

"اردو کو لیکر مسلم لیگ نے اکھنڈ بھارت (متحدہ ہندستان) کو تقسیم کرنے کے لیے جیسا ماحول تیار کیا تھا۔ اسی کی دوبارہ ترقی آج بھی ہو رہی ہے۔ اردو میں مسلم پلیٹ فارم سے بھڑکانے والے بیانات نکلتے رہے ہیں۔

(آریہ سماج کا ترجمان آریہ متر ۱۶ / ستمبر سنہ ۱۹۷۳ء)

پرکاش ویر شاستری نے اردو کے خلاف اترپردیش کے عاقلوں، ادیبوں، استادوں (ٹیچرز)، طلباء، سیاسی لیڈروں اور سوشل ورکروں سے اپیل کی کہ وہ جم کر اردو کی سرکاری پالیسی کی مخالفت کریں۔ جس کے نتیجہ میں سنہ ۱۹۶۷ء میں رانچی (بہار) میں فرقہ وارانہ فسادات میں بے قصور مسلمانوں کا خون بہایا گیا اور کانگریسی سرکار دیکھتی رہی۔

یہ فساد ۲۲ / اگست سنہ ۱۹۶۷ء کو اردو دشمن مظاہرین کی طرف سے ڈھیلہ باری کے سبب ہوا۔ اندرا سرکار ان فسادیوں کے خلاف کاروائی سے قاصر رہی اور پرکاش ویر شاستری جیسے لوگوں پر پابندی نہ لگا سکی۔"

(سامپردائکتا ورودھی کمیٹی (فرقہ وارانہ مخالف کمیٹی) صفحہ ۵، ۱۰ - بی - داس مارگ، راجیندر نگر نئی دلی-۵)

سرکار کی اردو پالیسی یہ ہے کہ کہو سب کچھ اردو کے بارے میں مگر مسئلہ کو الجھائے رہو۔۔۔ لیکن کچھ لوگ طفل تسلی کے بھی خلاف ہیں۔

بھارت کے سابق نائب صدر جمہوریہ مسٹر جتی کو دیکھیں۔۔۔۔۔ "ناگری رسم الخط سے ایکتا (اتحاد) اور یکسانیت کے عناصر مضبوط ہوں گے، اس سے نہ صرف زبانیں زیادہ مالدار ہوں گی بلکہ مختلف زبانوں میں آپسی تعلقات بڑھیں گے۔"

(امر اجالا ۱۷ / اپریل سنہ ۱۹۷۳ء)

مہاشے کرشن ایڈیٹر ویر ارجن نے اردو کے بارے میں کہتے ہیں۔۔۔ "اردو پر میرا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ اب زبان نہیں ہے بلکہ اسلامی تعلیم اور اسلامی تہذیب کی تبلیغ کا ذریعہ ہے اس کے محاورے اور مثالیں سب کے سب اسلامی ہیں۔ اگر آپ اردو قبول کرتے ہیں تو آپ کو اسلامی عقیدوں کا اثر قبول کرنا ہوگا۔"

(ویر ارجن ۱۷ / اکتوبر سنہ ۱۹۵۹ء)

یاد رہے مہاشے کرشن ایڈیٹر ویر ارجن نے سنہ ۱۹۱۰ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے گریجویٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔

جامعہ ملیہ دہلی، جس کے بانی اسیر مالٹا مولانا محمود الحسن اور انڈین نیشنل کانگریس کے صدر مولانا محمد علی جوہر تھے۔ جس کے پہلے چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین تھے۔ جہاں سے ہندستان کی جنگ آزادی کے سیکڑوں مجاہد پیدا ہوئے اس تعلیمی ادارہ کے بارہ میں آر یہ متر اپنی یکم اگست سنہ ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں لکھتا ہے۔۔۔ "یہ ایک مسلمانوں کا اپنا ادارہ ہے جو اردو زبان کی اشاعت اور اسلام کی ترقی کے لیے منتظم ہے جس میں سوائے انگریزی کے سارے مضامین کو اردو میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ادارہ قومی ادارہ نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اس کے مقصد کے بارے میں کہتے ہیں کہ جامعہ ملیہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایسا نقشہ تیار کرے جسکا مقصد مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے، ڈاکٹر ذاکر حسین مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا نقشہ تیار کرنے میں محو ہیں (تو) انھیں یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام دھرم (مذہب) کے پھیلاؤ کو روکنے والے بھی اس دیش (ملک) میں ابھی زندہ ہیں۔"

آج یہی ادارہ بس نام کے لحاظ سے جامعہ ملیہ اسلامیہ رہ گیا ہے اور ادارہ پر ہندی کا غلبہ ہے۔

دستور ہند اور اقلیتی تعلیمی ادارے:- ہندستان کی مرکزی سرکار نے مورخہ ۱۴/ جولائی سنہ ۱۹۶۴ء کو ایک اعلیٰ طاقتی ایجوکیشن کمیشن، جس کے چیرمین پروفیسر ڈی۔ ایس۔ کوٹھاری تھے اس مقصد کے تحت مقرر کیا تھا کہ کمیشن موجودہ تعلیمی نظام کا جائزہ لیکر پورے ملک میں تعلیم کے مختلف مدارج کے لیے موثر تعلیمی نظام اور پروگرام تجویز کرے تاکہ کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں قومی تعلیمی پالیسی کی راہ متعین کی جاسکے۔ کمیشن نے یہ رپورٹ ۲۰/ جون سنہ ۱۹۶۶ء کو مرکزی وزیر تعلیم کی خدمت میں پیش کردی۔ مجموعی طور پر یہ رپورٹ بڑی اہم کہی جاسکتی ہے، مگر اقلیتی تعلیمی اداروں اور اقلیت کے تعلیمی مسائل سے متعلق اس رپورٹ میں بھی وہی

ذہن کار فرمار ہا جو آزادی کے بعد سے برسراقتدار طبقہ کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

یہ جاننے کے لیے کہ کوٹھاری کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اقلیتی تعلیمی اداروں کے بنیادی حقوق پر کیسی ضرب کاری لگائی ہے، اقلیتی تعلیمی اداروں کی قانونی اور دستوری حیثیت کو سمجھ لیا جائے۔

ہندستان میں کسی بھی سیاسی پارٹی کی حکومت ہو، غلبہ اکثریت ہی کا رہے گا۔ لہٰذا اکثریتی فرقہ کے مذہبی عقاید، اسکی تہذیب وتمدن اور زبان کے لیے کوئی خطرہ نہیں اور وہ ہر زمانہ اور ہر حال میں محفوظ رہے گی۔

ہاں! اقلیتوں کے مذہبی عقاید، تہذیب وتمدن اور زبان کی بقا و حفاظت اور ترقی کے لیے ان کے نجی ادارے ضروری ہیں۔ اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر دستور ہند کے آرٹیکل ۳۰ (۱) میں تمام اقلیتوں کو خواہ وہ مذہبی ہوں یا لسانی یہ بنیادی حق دیا گیا کہ وہ اپنے تعلیمی ادارے قائم کریں اور ان کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ آرٹیکل ۳۰ (۲) میں یہ بھی کہا گیا کہ امداد دینے کے معاملہ میں حکومت اقلیتی تعلیمی اداروں کے خلاف ترجیحی سلوک نہ کرے گی۔

اس سلسلہ میں کیرالا ایجوکیشن بل سنہ ۱۹۵۷ء کے خلاف، مشہور مقدمہ اسپیشل ریفرنس (۱) آف سنہ ۱۹۵۸ء سپریم کورٹ شائع شدہ اے۔ آئی۔ آر سنہ ۱۹۵۸ء سپریم کورٹ صفحہ ۹۵۶ (خصوصی صفحہ ۹۵۹) میں جج صاحبان نے اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں حکم صادر کیا۔۔۔ "کھلی ہوئی بات ہے کہ اقلیتیں چاہتی ہیں کہ ان کے فرقہ کے بچوں کو تعلیم ایسے ماحول میں دی جائے جو ان کی اپنی مخصوص تہذیب کی ترقی کے لیے سازگار ہو۔ دستور بنانے والوں نے اقلیتوں کے اس حق کو تسلیم کیا اور اس کے خطرات کو دور کرنے کے لیے آرٹیکل ۲۹، اور ۳۰ میں ان کو بنیادی حقوق دیئے۔"

آخرکار سپریم کورٹ کی بنچ نے اپنے فیصلہ شائع شدہ اے۔ آئی۔ آر۔ سنہ ۱۹۶۳ء صفحہ ۵۴۰ (خصوصی صفحہ ۵۴۷) میں فیصلہ کا اختتام کرتے ہوئے کہا۔۔۔ "آرٹیکل ۳۰ (۱) میں جو بنیادی حق دیا گیا ہے وہ قطعی ہے آرٹیکل ۱۹ میں حق آزادی کے بنیادی حق کے

برخلاف آرٹیکل ۳۰(۱) میں دیئے ہوئے حق پر معقول پابندیاں نہیں عاید کی جاسکتیں۔ اس بنیادی حق کا مطلب یہ ہے کہ درحقیقت اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کا حق ہے۔ یہ حق موثر ہونا چاہئے۔ اور کسی ایسے قانون یا ضابطہ کے ذریعہ جو اقلیتوں کے تعلیمی اداروں کے مفاد میں نہیں بلکہ عوام اور ملک کے مفاد کے لیے بنایا گیا ہو، ختم ہونا چاہئے۔"

خود مسٹر اے۔کے۔چھاگلا نے جو صدقہ میں وزارت تعلیم پانے کے بعد مسلم پرسنل لا (قانون شریعت) اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اقلیتی کردار کے سب سے بڑے مخالف اور دشمن ثابت ہوئے۔ ایک مقدمہ "بمبئی تعلیمی سوسائٹی بنام اسٹیٹ بمبئی" میں آرٹیکل ۳۰(۱) میں دیئے ہوئے بنیادی حق کی وضاحت اس طرح کی تھی.... " آرٹیکل ۳۰(۱) میں ایک اقلیتوں کو صرف تعلیمی ادارے قائم کرنے ہی کا حق نہیں بلکہ ان کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کا بھی حق ہے۔ حکومت کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی اقلیت کو مجبور کرے کہ اس کے تعلیمی ادارے کس نوعیت کے ہوں۔"

(شائع شدہ اے۔آئی۔آر سنہ ۱۹۵۴ء بمبئی صفحہ ۴۶۸)

لیکن دس ہی برس کے بعد سنہ ۱۹۶۵ء میں سید چھاگلا کو مسلم یونیورسٹی غنڈوں کا اڈا دکھائی دینے لگی اور اس کے ساتھ "مسلم" کا لفظ انھیں فرقہ وارانہ دکھائی دینے لگا لیکن وہ ایک مسلمان ماں کے دودھ سے بنا ہوا خون اپنی رگوں سے نکلوا کر سیکولر خون داخل نہ کرواسکے۔ سید صاحب مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر غیر مسلم دیکھنا چاہتے تھے آخر موت کے بعد ہندو رسم کے مطابق آگ کے شعلوں کی نذر کر دیئے گئے اپنی ایک وصیت کے مطابق۔

ممبران کوٹھاری کمیشن نے کہا تھا.... "ہندستان میں مختلف مذاہب کے ماننے والے مختلف زبانوں کے بولنے والے، مختلف نسلوں، برادریوں، طبقات اور فرقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ رہتے ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر جمہوریت قیمتی خدمت انجام دے سکتی ہے۔ جمہوری اصول کی صحیح ترقی سے سماجی، اقتصادی اور تمدنی گروپوں کے اختلاف

کو نرم کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ قومی یکجہتی کا مطلب ہے ان اختلافات میں اتحاد پیدا کیا جائے تاکہ مختلف نظریات کے حامل لوگ سکون اور اتفاق کے ساتھ رہ کر اپنی گوناں گوں صلاحیتوں سے ملک کو مالامال کر سکیں۔"

پیراگراف ۱۵ میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ذریعہ تعلیم طلباء کی مادری زبان میں ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں رپورٹ میں رابندر ناتھ ٹیگور کے اس بیان کا حوالہ بھی دیا گیا ہے جس میں انھوں نے کہا تھا۔۔۔ "پوری دنیا میں صرف ہندستان ہی ایسا ملک ہے جہاں ذریعہ تعلیم طلباء کی مادری زبان میں نہیں ہے۔"

اس مندرجہ بالا احساس اور بیان کی روشنی میں امید کی جاسکتی تھی کہ کمیشن اقلیتوں کی ضرورت اور دشواریوں کا احساس کرتے ہوئے اقلیتوں کے ساتھ فراخدلانہ رویہ اختیار کرے گا۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آخر میں جب مثبت سفارش اور فیصلہ کا وقت آیا تو مادری زبان کے بجائے علاقائی زبان کے الفاظ استعمال کئے گئے۔ اور کہا گیا کہ اعلیٰ سطحوں تک ذریعہ تعلیم علاقائی زبانوں میں ہو۔ اگر مادری زبان کے الفاظ کہے گئے ہوتے تو بہت سے اسکولوں میں اردو ذریعہ تعلیم ہو جاتی۔ لیکن علاقائی زبانوں میں اردو کہیں نہیں آتی۔ اسلئے کہ یو۔ پی، بہار اور روہیل کھنڈ تک میں اردو کو علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ اس طرح بڑی خوبصورتی سے اردو کو کاٹ دیا گیا۔

اس کے بعد صفحہ ۲۵۷ پر پڑوسی اسکولوں سے متعلق سفارش اس طرح کی گئی۔۔۔

"ہر پڑوسی اسکول میں اس حلقہ کے تمام طلباء کا داخلہ ضروری ہوگا۔ خواہ ان کا تعلق کسی مذہب نسل، برادری یا فرقہ سے ہو۔"

اس پر عمل درآمد کے بعد تمام پرائیویٹ تعلیمی ادارے جن میں اقلیتی تعلیمی اداروں کی بیشتر تعداد ہوگی اپنا تشخص کھو دیں گے۔

دستور نے اقلیتوں کو اپنے ادارے قائم کرنے کا جو حق دیا ہے۔ اسکو ختم کرنے کا قانون بنایا نہیں جاسکتا۔ اس طرح پڑوسی اسکول کی اسکیم کے ذریعہ اقلیتی تعلیمی اداروں کو ختم کرنے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے۔

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کا اصل مسئلہ اسوقت یہی ہے۔ جس کی بنا پر سید حامد موجودہ وائس چانسلر کی حمایت اکثریتی طبقہ بھی کر رہا ہے اور اکا برین ملت بھی،

اکا برین ملت اپنی بد اندیشی سے کتنے ہی سفینوں کو ڈبو چکے ہیں۔ وہ اس بات کو سمجھ ہی نہیں پائے کہ داخلے میرٹ (لیاقتی نمبروں) کی بنیاد پر ہوں گے، اگر یہ مقابلہ صرف مسلم طلباء کے درمیان ہوتا تو بھی قابل اعتراض بات نہ تھی لیکن مشترکہ بنیاد پر ایک وقت آئے گا کہ یونیورسٹی پر غیر مسلم طلباء کا غلبہ ہو جائے گا۔۔۔ مسلم یونیورسٹی کا مقصد تھا کہ مسلمان طلباء جو کسی طرح، غریبی، پریشانی، افلاس کی ماری زندگی کے تحت یونیورسٹی کی منزل تک پہونچے ہیں۔ اِن دھول اور کیچڑ میں اٹے جواہر پاروں کو دھو، مانج کر ہم ایسا بنائیں گے کہ ان کی چمک دمک سے ملک کے لوگوں کی نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی۔ میرٹ کی بنیاد ہی پر داخلے ہوں تو لکھنؤ، بنارس، بہار اور ملک کے طول و عرض سے مسلمان لڑکے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کیوں جائیں گے؟ اس وقت یونیورسٹی جس راہ پر چل رہی ہے یا چلائی جا رہی ہے اسکا نتیجہ یہی ہوگا کہ چند برسوں میں خود بخود اسکا مسلم کردار ختم ہو جائے گا۔ اور اس کی حیثیت جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی جیسی ہو کر رہ جائے گی جو طلباء کی تعداد کے اعتبار سے مسلم ادارہ نہیں رہ گیا ہے۔

اسی کمیشن نے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے رجسٹریشن کی سفارش کی۔ جس میں عمارت، درجات، طلباء کی تعداد، مناسب اور معقول تعلیم کے بندوبست کے علاوہ ایک نہایت ہی مضحکہ خیز بات یہ کہی گئی کہ اسکول کا مالک یا اسکا کوئی ایک استاد ایک آزاد اسکول کے لیے اگر پسندیدہ نہیں ہے، تو اسلئے بھی اسکا رجسٹریشن منسوخ کیا جاسکتا ہے یا سرے سے اسکی اجازت ہی نہیں مل سکے گی کہ اس ادارہ کو چلایا جاسکے۔

ان وسیع اختیارات کی موجودگی میں جن میں اسکول کے مالک یا کسی استاد کا مناسب ہونے کی قید ہو، ریاستی حکومت سے کسی اقلیتی ادارے کا منظور کرالینا کتنا دشوار مسئلہ ہے۔ بے شمار ایسے اقلیتی تعلیمی ادارے ہیں جن کی منظوری یو۔ پی سرکار سے نہیں مل سکی ہے۔

مندرجہ بالا سفارشات کی روشنی میں ان کے دور رس نتائج کا اندازہ لگانا آسان کام نہیں ہے۔ جن اقوام کو اس طرح کی کتر، بیونت کے حالات سے سابقہ ہی نہیں پڑا ہے وہ اس کی پیچیدگی کو سمجھ ہی نہیں سکتیں۔ یہ ساری سفارشات دستور ہند کی ضمانتوں کے خلاف اور سپریم کورٹ کے فیصلوں کے سراسر منافی ہیں۔

ان سفارشات کے وقت، سفارش کرنے والوں میں سے بہتوں کے سامنے مسلم تعلیمی ادارے اور اردو زبان بھیانک سایہ کی طرح کھڑے تھے۔ اور یہ ساری سفارشات مسلم کشی کے جذبات کے تحت بروئے کار لائی گئی ہیں۔

دنیا کو دکھانے کے لیے بھارت سرکار نے قومی یکجہتی کا سوانگ رچا، لیکن اس کے ارادوں میں مسلم تہذیب وتمدن کو میٹ دینے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ کے پہلے جملے سے اندازہ لگائیں۔۔۔ "ملک کی قسمت کا خاکہ کلاس کے کمروں میں بنتا ہے۔"

اس نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر اگر ہندستان کے تعلیمی نظام اور درسی کتابوں کا جائزہ لیں تو قومی یکجہتی کے خوشنما الفاظ کے پردے میں ہندستان میں خالص ہندو مذہب کے عقاید، رسم و رواج، دیومالائی کہانیوں کی تبلیغ، تاریخ اور ادبیات کی کتابوں میں ایسے مضامین کی بھرمار ملے گی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ نفرت پیدا کرنے والے ہیں۔ تاریخی واقعات کو اس ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے جس میں مسلم سلاطین کی خصوصیات اور کارناموں پر پردہ ڈالکر ان کی نہایت خوفناک تصویر پیش کی گئی ہے جس سے ایک ہی تاثر ابھرتا ہے کہ مسلمان ظالم، وحشی، تنگ نظر اور عیاش ہوتے ہیں۔ اور ان کے عہد حکمرانی میں ہندو قوم ظلم و جبر کی چکی میں پستی رہی۔ اس غلط تعلیم کے نتیجہ میں چھیالیس برسوں کے اندر کروڑوں نوجوان مسلم دشمنی کے جذبات سے لیس ہو کر سامنے کھڑے ہوئے ہیں اور پورا ملک نفرت کی آگ میں جل رہا ہے۔

سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں کو ایسے حالات سے سابقہ پڑا، جن کی وجہ سے وہ دینی اعتبار سے عجیب کشمکش میں گرفتار ہو گئے جو بحیثیت ایک ملت موت و زندگی کے

مسئلہ سے دوچار ہیں۔ اگر اس صورت حال کی طرف توجہ نہ دی گئی تو ان کی آئندہ نسلیں اسلام سے بیگانہ ہو کر رہ جائیں گی۔

حکومت کی طرف سے جو نصاب تعلیم مقرر کیا گیا ہے اس میں بیشتر مضامین مسلمانوں کے بنیادی اعتقادات کے خلاف ہیں۔ جن کے کسی حصہ کو قبول کرنے کے بعد مسلمان بچہ موحد نہیں رہ سکتا۔

انگریزوں کے زمانہ میں ان کے اپنے نجی اسکولوں کو چھوڑ کر سرکاری اسکولوں میں کسی خاص مذہب (عیسائیت) کے عقائد و تصورات بچوں کے دماغوں میں ٹھونسے نہیں جاتے تھے۔ لیکن آزادی کے بعد سرکاری اسکولوں میں تعلیم کی راہ سے مسلمان بچوں کو اسلام سے منحرف کرنے کے طریقے اپنائے جارہے ہیں۔

دستور کی رو سے حکومت سیکولر ہے اور وہ کسی مخصوص فرقہ کی مذہبی تعلیم کو پروان نہیں چڑھا سکتی نا ہی اس کے اسکولوں میں کسی دوسرے مذہب کے اعتقادات کے خلاف تعلیم دی جائے گی۔ لیکن جو تعلیم دی جارہی ہے اسکی وجہ سے توحید کی جگہ شرک، رسالت کے بجائے "اوتار" (یعنی اللہ انسانی شکل میں ظاہر ہوا) اور آخرت کی جگہ پر "آواگون" پر مسلمان بچے یقین و ایمان لے آئیں گے۔ لہٰذا بحیثیت مسلمان کے ہم ہندستانی معاشرہ میں کیسے زندہ رہ سکتے ہیں ایک اہم مسئلہ ہے؟ ہندستان میں اسلام کے تحفظ کا مسئلہ ہے اسلئے کہ سارے مسائل پر اولیت رکھنے والا یہی مسئلہ ہے کہ ہم مسلمان کی حیثیت سے ہندوستان میں زندہ رہیں........ اس کے لیے ہم اقوام متحدہ سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ وہ ہندستان کو ان کے اپنے وعدے یاد دلائے۔

سنہ ۱۹۵۴ء میں ادارہ اقوام متحدہ نے اقلیتوں کے ساتھ امتیاز کے تدارک کے لیے اور ان کے تحفظ کے لیے جو کمیشن مقرر کیا تھا۔ ہندستان بھی اسکا باقاعدہ ممبر بنا۔ جس کے صدر بی۔ آر۔ بھگت تھے۔ اس نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا.... "متعدد ممالک میں ایسے ممتاز آبادی کے گروپ ہیں جو اپنی نسلی، مذہبی یا لسانی روایات و خصوصیات رکھتے ہیں جو باقی آبادی سے مختلف ہیں اور ان میں ایسے گروہ ہیں جن کا تحفظ قومی اور بین الاقوامی

پیمانے پر خصوصی اقدامات کے ذریعہ ہونا چاہئے۔ تاکہ وہ اپنی روایات اور خصوصیات کو محفوظ رکھ سکیں اور انھیں فروغ دے سکیں۔"

ہندستان ہر معاہدہ میں شریک مگر معاہدہ کی پابندی اور عمل سے کوسوں دور اس مسئلہ پر اگر اقوام متحدہ اس سے بات کرے گا تو وہ کہے گا اسکا اطلاق اس پر نہیں ہوسکتا اسلئے کہ ہندستان میں ایک قوم آباد ہے۔ اور یہ اسکا اندرونی معاملہ ہے۔ جبکہ انڈین نیشنل کانگریس کے لیڈر سنہ ۱۹۴۷ء میں یہ بات تسلیم کرچکے ہیں کہ یہاں ہندو اور مسلمان دو قومیں رہتی ہیں اور اسی کے نتیجہ میں بنگال اور پنجاب کی تقسیم ہوئی اگر ۱۴/ اگست سنہ ۱۹۴۷ء تک ہندو اور مسلمان دو قومیں تھیں تو آج ایک کیسے ہوگئیں اور اگر ملک کثیر القومی نہیں ہے تو قومی یکجہتی کے نعروں کا کیا مطلب ہے؟

دستور ہند میں بنیادی حقوق اور آزادی رائے کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن فسادات کے دوران اور اس کے بعد اس بنیادی حق کو بری طرح کچلا اور روندا گیا ہے۔ ہر فساد کے بعد اس علاقہ کے مسلمانوں کو گرفتار و پریشان کیا گیا اس کے پیچھے حکومت اور انتظامیہ کا ایک ہی مقصد رہا ہے کہ اس طرح مسلمانوں کی ہمت، جرأت اور ہوش و حواس کو ختم کرکے ان کو من حیثیت القوم احساس کمتری میں مبتلا کردیا جائے۔ ہر فساد میں مسلمانوں کی دوکانوں کو لوٹا جاتا ان کے گھروں کو جلایا جاتا ان کا کاروبار برباد کیا جاتا پھر انھیں کو گرفتار کیا جاتا۔

۱۶/ اگست سنہ ۱۹۶۷ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آرڈیننس کے خلاف پورے ملک میں بطور احتجاج بعد نماز جمعہ مساجد میں اللہ سے دعا کی گئی کہ یہ مسئلہ بخیر و خوبی حل ہوجائے تو بہار میں ہزاری باغ میں بعض مسلمانوں کو گرفتار کرکے اکیس دنوں تک جیل میں رکھا گیا۔ کہیں یہی مسلمان پاکستانی جاسوس دکھائی دیتے ہیں کہیں ملک و قوم دشمن، اور اس طرح مسلمانوں کے حساس افراد کو نشانہ بنا کر دوسروں کو خوفزدہ کرنے کی پالیسی بدستور دستور ہند کے خلاف جاری و ساری ہے۔

رانچی (بہار) کے فسادات میں مقتولوں کے ورثاء اور مظلومین کی باز آباد کاری کا مسئلہ

سامنے آیا تو مسلمانوں نے جان و مال کے تحفظ کی نظر سے ایک جگہ رہنے کی درخواست دی جس پر مسز اندرا گاندھی، فخرالدین علی احمد اور وائی۔ بی۔چوان کی یقین دہانیوں کے بعد بھی اس پر عمل نہ ہوسکا۔

مسلمان سنہ ۱۹۴۷ء میں جہاں تھے اسی عالم میں آج بھی سانس لے رہے ہیں مگر کیرالا سے دہلی تک، حیدر آباد سے دہلی تک، کلکتہ سے دہلی تک بمبئی سے دہلی تک ان مظلوموں کی دادرسی کرنے اور ظالموں سے یہ پوچھنے والا کوئی نہیں کہ مسلمانوں کے خلاف یہ ظلم کا بازار کیوں کھولا گیا ہے؟

جہاں کوئی مسلم محلہ کسی شہر میں ہے وہ ہر شخص کو چھوٹا پاکستان دکھائی دے رہا ہے دستور ہند کی ساری ضمانتیں پامال کی جاچکی ہیں۔

دستور ہند میں کہا گیا تھا کہ مذہب، ذات اور فرقہ کی بنیاد پر تفریق نہ برتی جائے گی، لیکن پاکستان سے آنے والے رفیوجیوں کے ساتھ فراخدلی اور دریادلی کا مظاہرہ کیا گیا۔ ان کی بحالی اور آبادکاری کے لیے اس وقت کے مرکزی وزیر بحالیات مسٹر مہرچند کھنہ نے لوک سبھا میں کہا تھا:

(۱) مشرقی پاکستان کے شرنارتھوں (رفیوجیوں) کے لیے ۸۰ کروڑ روپیہ کے قرضے منظور کئے گئے ہیں۔

(۲) ان کا زیادہ حصہ یعنی ۵۰ کروڑ روپیہ معاف کردیا جائے گا۔

(۳) کسی بھی رفیوجی کو دو ہزار روپیہ سے زیادہ بقایا نہیں دینا ہوگا۔

(۴) قرضوں پر سے سود بھی معاف کردیا جائے گا۔

(۵) قرضوں کی وصولی میں جو نقصان ریاستوں کو ہوگا اسکا بار مرکز برداشت کرے گا۔

(٦) صرف اڑیسہ میں رفیوجیوں کے لیے صنعتیں قائم کرنے کے لیے ۳۳ کروڑ روپیہ کی رقم کا منصوبہ تیار کیا گیا۔

ان مظلوموں کے ساتھ اس سے زیادہ بھی ہوتا تو ہمیں شکایت نہ تھی لیکن مسلمان مظلوموں اور مقتولین کے ورثاء کو پانچ ہزار روپیہ کی حقیر رقم دیکر جس طرح دستور ہند کا

مذاق اڑایا گیا ہے اس کی نظیر تاریخ عالم میں ملنا مشکل ہے۔

دستور ہند نے مسلمانوں کو برابر کا شہری بنایا تھا لیکن عملاً ان کو تیسرے درجہ کا شہری بنا دیا گیا ہے۔ مذہبی اعتبار سے وہ برابر کے شہری اور اقلیتی اعتبار سے دستور ہند کی دفعہ ۳۰ کی رو سے انھیں دینی اور تہذیبی خصوصیات برقرار رکھنے کا حق ملا تھا، ہم ملک کا حصہ (یعنی قوانین کی پابندی، ٹیکسوں کی ادائیگی کی شکل میں) ملک کو دیتے ہیں، لیکن ہمیں ان پر امن معاہدوں میں باندھنے والے اپنے فرائض کی انجام دہی سے بھاگ کر ہمارے صبر کا امتحان لینے کا کام کرتے رہے ہیں، اور دستور ہند کی شکل میں جو ذمہ داری انھوں نے ہمارے تئیں لی تھی اس سے چشم پوشی کر کے ایک سنگین جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ جس کے نتائج بھی انھیں کو بھگتنا پڑیں گے۔

صحافی، سیاسی لیڈر اور علماء

کلدیپ نیر جو انگریزی صحافت کے امام ہیں مسلمانوں کے خلاف ہونے والی دستوری ناانصافیوں کے بارے میں کہتے ہیں۔۔۔ "مسلمانوں پر خوف و ہراس طاری ہے۔ وہ اپنے کو غیر محفوظ تصور کرتے ہیں۔ ہر شعبہ میں ان کے ساتھ فرق و امتیاز برتا جاتا ہے ان کے ساتھ وہ برتاؤ نہیں کیا جاتا جو ہندوؤں کے ساتھ ہے۔ (پبلک سکٹر) نجی زمرے کے کارخانوں میں پرانے تعصبات کی وجہ سے جگہ نہیں ملتی۔ پلیٹ فارم سے ان کو تلقین کی جاتی ہے کہ انھیں (مسلمانوں کو) قومی دھارے میں شامل ہونا چاہئے۔ اس کے معنی وہ (مسلمان) یہ لیتے ہیں کہ انھیں ہندو بنانے کا نعرہ دیا جا رہا ہے۔ انھوں نے مختلف سیاسی جماعتوں جن سنگھ تک میں شرکت کی۔ ان سے آزادی کی چھبیس سال کے بعد بھی وفاداری کا ثبوت مانگا جاتا ہے۔ (یہ سنہ ۱۹۷۵ کا مسٹر نیر کا بیان ہے) تقسیم کے بعد انھیں بری طرح مصائب و آلام کا نشانہ بننا پڑا۔ اور ابھی تک انھیں اپنی پوزیشن کے بارہ میں کوئی یقین حاصل نہ ہو سکا۔

۲۰۰۶ء

ندائے ملت لکھنو، ۶/اپریل سنہ ۱۹۷۵ء (آج سنہ ۱۹۹۳ء میں بھی یہی ہو رہا ہے)۔

سوشلسٹ لیڈر جارج فرنانڈیز کا بیان :- انھوں نے ۲/ جون سنہ ۱۹۷۵ء کو احمد آباد (گجرات) میں ایک جلسۂ عام میں کہا کہ سنہ ۱۹۶۵ء اور سنہ ۱۹۷۱ء میں پاکستان سے ہونے والی جنگ کے دوران وزارت داخلہ نے تمام ریاستوں کو ایک خفیہ سرکلر بھیجا تھا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ اہم عہدوں پر کسی مسلمان کی تقرری نہ کی جائے انھوں نے کہا میں حکومت کو چیلنج دیتا ہوں کہ وہ میری بات کو غلط ثابت کرے۔ آگے انھوں نے کہا کہ سنہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے وقت بمبئی الیکٹرک سپلائی اور ٹرانسپورٹ کمپنی کے ۲۵ مسلمان کنٹرولروں اور پانی کی تقسیم کے محکمہ کے ۱۵ مسلمان انچارج ہٹا دیئے گئے تھے اور افسران سے بات کرنے پر جواب ملا تھا کہ مرکزی وزارت داخلہ کے احکامات پر یہ کاروائی ہوئی ہے اور ان دنوں مسز گاندھی وزیر داخلہ تھیں۔

۳۰/ ستمبر سنہ ۱۹۸۴ء کو رانچی (بہار) تقریر کرتے ہوئے افسوس کے ساتھ کہا کہ جب ہم نے ان مسلمانوں کیلئے لڑائی چھیڑنے کی بات کی تو یہ زہر مزدوروں میں بھی دلی دربار سے نکل کر پھیل چکا تھا اور مزدوروں نے کہا کہ صاحب سرکار کے پاس ان مسلمانوں کے خلاف ضرور کوئی خفیہ رپورٹ ہوگی۔ لیکن پھر بھی مسلمانوں کو مزدور اتحاد کے بے معنی نعروں میں الجھایا جاتا ہے۔ خفیہ سرکلر جو جواہر لال نہرو کے عہد میں جاری ہوا۔

۱۴/ مارچ سنہ ۱۹۸۳ء کو سنہ ۱۹۴۸ء کے اس خفیہ سرکلر کا ذکر آیا جو مرکزی وزارت داخلہ نے جاری کیا تھا۔ اتنا اہم مسئلہ وزیر اعظم کی منظوری کے بغیر جاری نہیں کیا جاسکتا اسوقت ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔

۱۴/ مارچ سنہ ۱۹۸۳ء کو راجیہ سبھا میں مسٹر اندر دیپ سنہا نے (جو کہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہیں) کہا کہ جب میں بہار سرکار میں وزیر تھا اسوقت رانچی میں فساد ہوا تھا۔ اس فساد کو روکنے کے لیے رانچی میں جتنے پولیس افسر تھے ان میں ایک بھی مسلمان یا عیسائی نہیں تھا۔ یہ بہار ملیٹری پولیس کا دستہ تھا (B.M.P) واپسی پر میں نے

چیف سکریٹری سے اسکی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ سنہ ۱۹۴۸ء میں مرکزی وزارت داخلہ نے ایک خفیہ سرکلر جاری کیا تھا کہ مسلح فورس میں اقلیتی فرقہ کے لوگوں کو بھرتی نہ کیا جائے۔

اس کے بعد انھوں نے سوال کیا کہ کیا وہ سرکلر اب بھی باقی ہے؟ (اور) کیا اس سرکلر کو (سرکار) نے واپس لے لیا ہے؟ اگر واپس لیا ہے تو کب؟ پارلیمنٹ کے ذریعہ پورے ملک کو اِس کی جانکاری دیں!

وزیر داخلہ نے اس کے جواب میں کہا۔۔۔ "پچھلے ماہ مرکزی وزارت داخلہ نے ریاستی سرکاروں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اسے لاگو نہ کریں!

وزارت داخلہ کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ فروری سنہ ۱۹۸۳ء تک اس پر عمل جاری تھا۔ لیکن اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس پر عمل در آمد روکا گیا ہے اس سرکلر کو واپس نہیں لیا گیا۔

دستور ہند کی اس طرح بیباکانہ خلاف ورزیوں کے بعد اب مسلمان کہاں جائیں اور کس سے فریاد کریں۔ اللہ کی وسیع زمین کو دنیا کے سارے ممالک نے اللہ کے بندوں کے لیے تنگ کر رکھا ہے اس کی وسعتوں کو ویزا، اور پاسپورٹ کی بندشوں سے جکڑ رکھا ہے لہٰذا آج مسلمان اللہ کے اس حکم پر کہ جس زمین کے حکمران ظالم تھے، ظلم کے خلاف کیا تم ہجرت بھی نہیں کر سکتے؟

پھر زلزلے ہیں راکب تمکین زندگی — بے آئینی ہے ناظم آئین زندگی
پھر جرم بن چکے ہیں قوانین زندگی — پھر موت ہے پیام بر دین زندگی
پھر شکل زندگی سے ڈرے جا رہے ہیں لوگ
بس اے حیات بس کہ مرے جا رہے ہیں لوگ

ایک طرف ایک گروہ ہمیں اس لیے میٹ دینا چاہتا ہے کہ ہم لاالٰہ الااللہ پر یقین رکھتے ہیں دوسری طرف ہم زندہ رہنے کا آئینی حق چاہتے ہیں۔ یہ گروہ اپنے مال و دولت اور غرور کی خاطر لڑ رہا ہے اور ہم کلمۂ حق و توحید اور زندگی کی بقا و تحفظ کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔۔۔ لیکن

جب ہم آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنے پڑوس میں ایسے گروہوں کی بھیڑ دکھائی دیتی ہے، جنھوں نے شاید سزا سے بچ نکلنے کا خدا سے کوئی معاہدہ کرلیا ہو، جو آخرت صرف اپنے لیے سمجھتے ہوں موت سے اس درجہ خائف ہو کر مصلحتوں کا شکار ہو جائیں کہ حق بات بھی نہ کہہ سکیں، ظالموں کی دلجوئی کی خاطر، جن سے موت خود گھبراتی ہو۔۔۔۔ ہائے، وہ زندگی کے کتنے حریص بن گئے!

اہل اسلام سوچیں کہ عہد جاہلیت میں جب ہم متفرق تھے تو کیا اسلام نے ہمیں یکجا نہیں کیا؟ ہم ذلیل تھے کیا اسلام نے ہمیں سربلند نہیں کیا؟ پھر کیا ہم یکجا ہو کر اپنے کھوئے ہوئے مقام کو حاصل کرنے کی کوئی کوشش کر رہے ہیں؟

ابھی اے اہل اسلام تمھیں بے چینی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے ہیں، لیکن یہ سناٹا طوفان سے پہلے سمندر کی لہروں کے سکون جیسا ہے؟ مگر، اے لوگو! جان لو کہ طوفان سر پر کھڑا ہے! اور اگر یہ طوفان اٹھ کھڑا ہوا، تو خس و خاشاک کی طرح تمھیں بہا لے جائے گا۔ اس سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہم متحد عزم سے سد سکندری تعمیر کریں، باہمی جنگ سے گرتی ہوئی دیوار نہ بنیں، اپنے ہی سر پر چلنے والی تلوار نہ بنیں، اغیار کو خوش کرنے کے لیے، اپنوں کو ستانے، رلانے، اور چھیڑنے کا کام بند کردیں۔ سیاسی نفسیات سے واقفیت رکھنے والی نگاہیں، آنے والے طوفان کو دیکھ لے سکتی ہیں۔ جو ہماری باہمی جنگ اور کوتاہ بینی سے یقینی بنتا جارہا ہے۔

ہندستان میں اہل اسلام کو شرک و الحاد کی طاقتیں مجبور کرنے پر لگی ہوئی ہیں کہ وہ ان کی آنکھ سے دیکھیں، ان کے دماغ سے سوچیں، ان کے کان سے سنیں، اور انھی کی زبان سے بولیں۔

حقوق اجتماعی کو پامال کردیا گیا ہے۔ حقوق اجتماعی کے لیے عدل، انصاف، اور مساوات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندستانی معاشرہ میں یہ جنس عنقا بن چکی ہے۔ پورے ملک میں شر و فساد زور و شور سے جاری ہے۔ ہر طرح کی انارکی کا دروازہ مسلمانوں کو برباد کر دینے کے لیے کھلا رکھا گیا ہے۔ مزاحمت اور مقابلہ کی طاقت اہل اسلام میں گھٹتی جارہی ہے

تنظیم قائم کرنے کی بھی ہمت نہیں جو ان حالات کا لازمی نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

ہندستان کے اندر مسلمانوں کا نظم اجتماعی ختم نہیں ہوا ہے مر چکا ہے۔ وہ بکھر گئے ہیں۔ ان کی ہزار سالہ شان و شوکت اور قوت ختم کر دی گئی ہے۔ وہ خود ہی کفر سے بیعت اور مسلمانوں کو کفر کے خانوں میں بانٹنے کا کام کرتے رہے ہیں۔ بریلوی دیوبندی، ندوی، شیعہ، سنّی، اہل حدیث یہ سب ایک دوسرے کے لیے بھائی ہیں؟ علماء خود ہی اپنی ساری صلاحیتیں انہی مسائل پر صرف کر رہے ہیں۔ ندوہ اور دیوبند اپنی ذاتی راحت و آسایش اور خود پرستی کے سوا کچھ نہیں رہ گئے ہیں۔ مسلمانوں پر ہونے والے مظالم سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ یہ خود اللہ کی رسی چھوڑ کر تفرقوں کے امام بن چکے ہیں۔ یہ علماء و اکابرین ملت ایک دوسرے کے وجود کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہر گروہ اپنے کو جنتی سمجھ کر دوسرے کو میٹ دینے کے در پے ہے تاکہ کفر کا خاتمہ ہو جائے، لیکن اصل کفر کے سامنے سر بسجود اور اس کے معاون اور مددگار اپنے گلوں میں کہنے کو اللہ کی رسی ڈال رکھی ہے..... مگر اسے باندھ رکھا ہے غیروں کے کھونٹوں سے! یہ پوری طرح حالت افتراق میں ہیں، تو عام مسلمان کیا کریں؟ ان کا تعلق اس آپسی محبت و یگانگت سے نہیں رہ گیا، جس کی دعوت اسلام نے انھیں دی تھی۔ آج ہندستان کے ذمہ دار مسلمان اور علمائے اسلام اس ذمہ داری سے بھاگ رہے ہیں۔ جو اللہ نے ان پر ڈالی ہے۔ یہ حکم خداوندی سے منحرف ہو چکے ہیں۔ لیکن اس انحراف کے بعد اسکی زمین سے کہاں نکل جائیں گے؟ باعزت زندگی کے لیے اسلام کی دعوت کی طرف آئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

اس وقت ساری دنیا میں مسلمان منافع کے چکر میں پڑ چکا ہے۔ جس کے نتیجہ میں یہ بات اس کے دل سے نکل چکی ہے کہ وہ اعمال ظاہری کو دیکھتا اور دلوں کا حال جانتا ہے۔ ٹیلی ویژن کی موجودگی میں بھی قرآن کریم کے اس ابدی اعلان پر یقین نہیں لاتا کہ کوئی عمل ضائع نہ ہوگا اور بروز قیامت اعضاء و جوارح گواہی دیں گے۔ دلوں کی ہر بات کھل کر سامنے آجائے گی۔۔ لیکن اس کے بعد بھی آج ان کے طریق کار اور حصول محکومیت کی بنیاد محدود نفع عاجل کے سوا کچھ نہیں۔ جس کے ذریعہ وہ صرف اپنی ذاتی خواہشوں کی تکمیل

کر سکیں اور عام مسلمان برباد ہوتے رہیں۔ یہ بات ان کے ذہن کے کسی گوشہ میں نہیں رہ گئی کہ اس ملت محبوس الم کیلئے ان کی بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ ان کے لیے آج "ملت مرحومہ ہند" ایک ذریعہ ہے، وسیلہ ہے، اپنی خواہشوں اور حرص و طمع کی تکمیل کا۔

اپنوں کا یہ طریق کار اور اجنبی حکمرانوں کی خون آشامیاں، کیا کریں عام مسلمان؟ کہاں جائیں؟ کس سے فریاد کریں؟ اس شر سے کیسے نجات ملے گی ہندی مسلمانوں کو؟

خود مسلم حکومتوں میں اگر حکمراں دین سے غافل ہو جائیں تو اکثر علماء ہاتھ پیر ڈال دیتے ہیں۔ اسلام کی پوری تاریخ اسکی گواہ ہے، تا کہ ایسی حکومت جسکی بنیاد ہی اسلام دشمنی پر ہو۔ وہاں علماء حکمرانوں کو تلقین حق نہیں کر سکتے اور جب یہ نہیں کر سکتے تو عام مسلمانوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف آوازۂ حق بھی بلند نہیں کر سکتے۔ اس طرح آہستہ آہستہ ان کے دلوں پر کثیف غلاف چڑھتے چلے جاتے ہیں اور یہ احساس ان کے اندر سے ختم ہو جاتا ہے کہ مخلوق خدا ان کے بارہ میں کیا رائے رکھتی ہے۔ وہ تو خداوند قدوس کے بجائے حاکمان وقت سے اپنی خدمات کا صلہ چاہنے لگتے ہیں...... اور ہندستان میں اس وقت ان کی یہی حالت بن چکی ہے۔

دوسری صدی ہجری میں جس طرح مسلمانوں کی تین خلافتیں باہم اتحاد سے قاصر تھیں اسی طرح اس وقت کوئی تین مسلم رہنما یا علماء باہم متحد نہیں۔ غیر اہل اسلام کی بربادی پر متحد اور یہ بدبخت اپنی گردن بچانے پر متحد نہیں۔

پوری دنیائے اسلام میں نہ صلاح الدین ایوبی، نہ محمود غزنوی، نہ محمد غوری نہ شیرشاہ سوری، اور نہ عبدالقادر جیلانی، نہ معین الدین چشتی نہ نظام الدین اولیاء، نہ سید جمال الدین افغانی نہ قائداعظم محمد علی جناح، نہ شاہ فیصل اور نہ امام خمینی۔ نتیجہ میں پورا مسلم معاشرہ سیاسی، علمی اور روحانی طور پر دیوالیہ ہو کر رہ گیا ہے۔

اجنبی سرکاریں مسلمانوں کے ماضی سے نفرت کرتی ہیں، حال سے بے پروا، اور مستقبل کو تاریک بنانے پر لگی ہوئی ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی مسلمان اپنوں کی رہنمائی سے کترا کر دوسروں کی نظریاتی و سیاسی غلامی پر ناز فرماتے رہے ہیں۔ اسلئے کہ وہ

اپنے کو بھول گئے۔ خود اپنے شاندار ماضی کو فراموش کر بیٹھے اور جو خود ہی گم کردہ راہ ہو اسے اس کے مخالف کیوں راستہ دکھانے لگے۔

کشمیر سے راميشورم تک، نفرت، عداوت، تعصب اور فرقہ واریت کی تیز ہوائیں چل رہی ہیں جمہوریت، سیکولرازم، اور آئین ہند کے چہرہ پر آمریت اور لاقانونیت کی خراشیں موجود ہیں۔ ہر طرف سنسناتی گولیاں، تڑپتی ہوئی لاشیں، عزت مآب دوشیزاؤں کی سسکیاں ہیں، خود امن و امان کے محافظوں نے انھیں بے آبرو کردیا ہے۔ آگ اور خون کا سیلاب، قید و بند کی زندگی، ملک و قوم کے رہنما ہاتھوں میں نفرت کے دیئے لیے دلوں کو بجھاتے پھر رہے ہیں، اصول و قانون کا درس دینے والے، خود ہی اپنے قدموں سے انھیں پامال کر رہے ہیں، کرسیوں، وزارتوں، اور حکومتوں کی لڑائی میں تان ٹوٹتی ہے تو مسلمانوں کی پامالی پر، حیدر آباد میں جہاں راما راؤ اور بھاسکر راؤ کے بیچ زور آزمائی ہو رہی تھی وہاں گھر جلائے جا رہے تھے مسلمانوں کے دکانیں لوٹی جا رہی تھیں مسلمانوں کی، ہر جگہ اقتدار کی لڑائی میں نشانہ بنتا ہے غریب مسلمان۔

ہندستانی حکمرانوں کے اقتدار کی کشمکش کے شور انگیز طوفانوں میں مسلمانوں کی شمع زندگی پچھلے چھیالیس برسوں سے بجھائی جانے کی کوششیں جاری ہیں۔ دینی فکر کو مٹنے کی تدبیریں ہو رہی ہیں..... مگر کسی طرح عام مسلمان ذکر حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو فانوس بنا کر اپنی شمع زندگی اور فکر اسمانی کو کفر و شرک و الحاد کے طوفانوں سے بچانے کا کام کرتے رہے ہیں۔

وہ دنیا تھی جہاں تم روک لیتے تھے زباں میری
یہ محشر ہے یہاں سننا پڑے گی داستاں میری

ہم عالم اسلام اور مظلوم قوموں کی آزادی کی علمبردار اقوام کے سامنے اپنی بات رکھ رہے ہیں۔ فریاد کر رہے ہیں ہندستان کے عام مسلمانوں کی طرف سے، تو کیا کوئی ہے جو فلاح کی طرف، خیر کی طرف دوڑے؟ اور ہندستان کے کروڑوں مظلوم مسلمانوں کی مدد کے لیے کھڑا ہو؟ ان کی آواز پر آواز دے اور اپنے سیاسی و دوستانہ اثرات ڈالکر مسلمانوں کے

خلاف ہونے والی ناانصافیوں کو روکے، اشتراکی ممالک کی جگہ روس، امریکہ، یورپ اور غیرجانبدار ممالک کی ذمہ داریاں خالص انسانی بنیادوں پر بنتی ہیں! لیکن عالم اسلام کو حکم خداوندی کی تعمیل سے کون سی مصلحتیں روک رہی ہیں؟

ادارہ اقوام متحدہ سے بھی ہماری درخواست ہے کہ وہ ایک کمیٹی کے ذریعہ یا عالمی عدالت انصاف کے ذریعہ یہ تحقیقات کروائے کہ اقوام متحدہ کے چارٹر اور دیگر بین الاقوامی معاہدوں پر دستخط کرنے والا ہندستان ان کی پابندی بھی کر رہا ہے یا نہیں؟ تاکہ ہندستان کی اقلیتیں، مسلمان جو ثانوی اکثریت کی حیثیت رکھتے ہیں اور دیگر مظلوم طبقات اپنے ملک میں ایک باعزت زندگی گزار سکیں۔ اس وقت جن کی حیثیت اس شعر کی مصداق بن کر رہ گئی ہے۔"

محفل ان کی، ساقی ان کا   آنکھیں میری، باقی ان کا

آج ہم، کل تمہاری باری ہے

شہری، معاشرتی اور سیاسی اصول پر اسی وقت عمل در آمد ممکن ہے جب زندگی کی ضمانت کے ساتھ تہذیبی و دینی اقدار کے تحفظ کی بھی ضمانت ہو۔ مختلف معاشرتی نظاموں اور مذہبی و لسانی اقلیتوں کو اپنی زندگی کے طریق کار کے انتخاب کی کوششوں کو بین الاقوامی قوانین کی روشنی میں جانچا اور پرکھا جائے ــــ ہندستان میں مسلمانوں کو اپنی دینی اقدار کی برتری پر یقین ہے اور مخالفین کی طرف سے بنیاد پرستی کا طعنہ ایک تحفۂ عظیم ہے ــــ اس لیے کہ مسلم گروہ کی اپنی بنیاد ہے جبکہ کفرو شکر والحاد کی کوئی بنیاد نہیں۔

ہندستان کا اصل مسئلہ بھوک اور بیکاری ہے، ناخواندگی ہے، بھوک، بیکاری، ناخواندگی اور غربت کے خلاف جنگ کو پس پشت ڈالکر ملک کی ساری توانائی اور صلاحتوں کو مسلمانوں کے خلاف بے روک ٹوک استعمال کیا جارہا ہے، جسکو سرکار کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔

بین الاقوامی قانون کی رو سے یہ سارے مسائل انسانی حقوق کے زمرے میں آتے ہیں۔ اسلئے کہ بین الاقوامی سلامتی کے ضابطوں میں بنیادی حقوق کی کلیدی حیثیت ہے، جس کے بغیر امن عالم کا مسئلہ نہایت سنگین بن سکتا ہے۔ ہمارے سامنے فلپائن، جنوبی افریقہ، اسرائیل اور دیگر ممالک میں مقامی جبر کے خلاف پائے جانے والے سنگین مسائل موجود ہیں جن سے سبق لینے کی ضرورت ہے۔ انہی بنیادی مسائل پر غور کرنے کی ان صفحات میں دعوت دی گئی ہے۔

آج انسان دوستی اور بنیادی حقوق، گروہوں اور فرد کی آزادی سے متعلق عمل در آمد کا انحصار اس بات پر ہے کہ ان ملکوں میں بسنے والی قوموں، مذہبوں، گروہوں اور لسانی اقلیتوں کے مابین حکمراں گروہ کا طریق کار کیا رہا ہے۔ اس طریق کار کو بروئے کار لانے

کے لیے بین الاقوامی قوانین کی بالادستی ضروری ہے، اسلئے کہ موجودہ بین الاقوامی قوانین ہر طرح کے تشدد پر روک لگاتے ہیں۔ اقوام متحدہ کا منشور دھمکی، طاقت کے استعمال اور جبر و تشدد کی ہر شکل کو ممنوع قرار دے چکا ہے (دفعہ ۲ پیرا گراف ۴)۔ اسی طرح کے اعلانات ہلسنکی کانفرنس میں بھی کیے جا چکے ہیں۔

دنیا کے ملکوں میں اگر ایسے حالات موجود ہیں جن میں انسان کو انسان کے شایان شان جینے کا حق نہ ہو، بھوک ہو، بیماری ہو، روزگار کے مواقع محدود کر دیئے گئے ہوں اور ساتھ ہی مذہبی اور تہذیبی اختلاف کی بنا پر قتل و غارت گری کا سلسلہ بھی جاری ہو تو امن عالم کی گفتگو اور عدم تشدد کی رٹ بے معنی سی بات ہے ...... اور یہ اس وقت ہو جبکہ بین الاقوامی سلامتی کے لیے انسانی حقوق کے تحفظ کو ضروری قرار دے دیا گیا ہو۔ جن میں قوموں کے درمیان باہمی اعتماد، دہشت پسندی کی روک تھام اور باہمی سلامتی کے لیے انسانی حقوق کی سلامتی کو بنیاد بنایا گیا ہو۔ اقوام متحدہ کے منشور کی (دفعہ ۵۵) میں انسانی حقوق اور بنیادی آزادی کو تمام قوموں کے درمیان تعلقات کا زینہ قرار دیکر عالمگیر حیثیت عطا کر دی گئی ہے۔ جس کی توثیق، شہری اور سیاسی حقوق کے لیے بین الاقوامی معاہدات کی دفعہ ۱، اور ۲ میں صاف کر دی گئی ہے۔ جب اقوام متحدہ کا منشور ملکوں کی آزادی پر زور دیتا ہے تو ان ملکوں میں آباد مختلف تہذیبی اکائیوں کے تحفظ کی ضمانت بھی فراہم کرتا ہے، جس کے مطابق نو آبادیاتی یا کوئی اور طریقہ جو مخصوص افراد کو ان کے حقوق سے محروم کرتا ہو یہ منشور روک لگاتا ہے اور ہر اس طریقہ کو ناجائز اور غیرقانونی قرار دیتا ہے، جس کے تحت دوسروں پر ظلم و جبر کا سلسلہ جاری ہو۔

اسلئے بین الاقوامی دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے سیاسی ناانصافیوں کا خاتمہ ضروری ہے۔ اگر مختلف ملکوں میں آباد تہذیبی اکائیوں کو معاشی، سیاسی اور سب سے بڑھ کر معاشرتی عدل و مساوات نہ ملا تو انسانی حقوق کی بات جس کے ذریعہ سب کو زندہ رہنے کا حق دیا گیا ہے بے معنی ہوگی، ساتھ ہی اقوام عالم کے درمیان امن و سلامتی کا ماحول پیدا ہونا مشکل ہو جائے گا۔ اسلئے کہ اپنی آزادی، فرد سے لیکر جماعت تک سب کو عزیز ہے۔ اس کے

لیے حکمراں گروہوں کو دوسروں پر اپنی مرضی تھوپنے کا طریقہ ترک کر کے سب کو گوارہ کرنے کی عادت ڈالنا ہوگی۔ تب ہی ہم پائیدار امن کی بات سوچ سکیں گے۔ انسانی حقوق کے عملی احترام سے ہی کسی ملک کے حقیقی نظریہ کو سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ کس حد تک عدل مساوی پر عمل در آمد کرتا ہے۔ لیکن اگر کوئی ملک عالمی پلیٹ فارم پر عدم تشدد کا اعلان کرتا پھرے لیکن عملی طور پر نسل پرستی، نسلی تفریق، نسل کشی اور مذہبی تعصب کا شکار ہو کر اپنی اندرونی قوموں اور تہذیبی اکائیوں کے ساتھ مندرجہ بالا پالیسوں پر عامل ہو تو اس ملک میں امن تلاش کرنا بالکل بے سود ہوگا۔ اور بد قسمتی سے ہمارے یہاں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ جس کے نتیجہ میں دہشت گردی بھی اپنے شباب پر ہے۔

لیگ آف نیشنز نے قومی اقلیتوں کے تحفظ اور انسانی حقوق کی پابندی کی دفعات شامل کی تھیں لیکن ان پر عمل در آمد نہ ہوسکا۔ اقوام متحدہ نے اپنے منشور میں بنیادی حقوق، آزادی کی حفاظت اور ان حقوق پر عمل در آمد کو یقینی بنانے کے لیے ریاستوں کے درمیان تعاون پر زور دیا۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں سان فرانسسکو کانفرنس میں جہاں اقوام متحدہ کا منشور پاس ہوا تھا۔ منشور کی دفعہ ۱ کے پیراگراف ۳ میں تمام قوموں کے لیے لازمی قرار دیا گیا تھا کہ وہ انسانی حقوق اور انسانی آزادی کا احترام کریں گی نہ صرف احترام کریں گی بلکہ بنیادی آزادی اور انسانی حقوق کے تحفظ پر عمل در آمد کو یقینی بنانے کے لیے بین الاقوامی تعاون میں مددگار ہوں گی۔

ہندستان میں، اقتصادی، معاشرتی اور تہذیبی حقوق کی خلاف ورزیوں کا سلسلہ جاری ہے اسلئے کہ وہ دنیا کے معاملہ میں خود دخیل ہونے کے باوجود اپنے یہاں ہونے والی ناانصافیوں کو اپنا اندرونی معاملہ کہہ کر اقوام متحدہ کے منشور پر عمل کرنے سے راہ فرار اختیار کرتا رہا ہے۔ ہندستان کی یہ ڈینگ کہ اس نے اظہار رائے اور تقریر کی سب کو آزادی دی ہے پروپیگنڈہ سے زیادہ نہیں ہے۔ کتنے ہی مسلمان لیڈروں کو بعض علاقوں میں داخل ہونے اور تقریر کرنے سے لگاتار روکا جاتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ مخالفوں پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔ ٹیلی فون ٹیپ کئے جاتے ہیں۔ جس کے لیے سنہ ۱۹۸۸ء میں کرناٹک

کے وزیر اعلی کو استعفا دینا پڑا۔

اقوام متحدہ نے تمام ریاستوں کے شہریوں کی شہری و سیاسی آزادی کو لازمی بنانے کا پابند کیا ہے۔ ہلسنکی کانفرنس کی آخری دستاویز اسکا واضح ثبوت ہے۔ ان اصول و ضابطوں پر عمل در آمد کی نگرانی کے لیے ۱۸ آدمیوں کی ایک کمیٹی بھی موجود ہے۔

انسداد اذیت کمیٹی بھی اقوام متحدہ کے کنونشن کے ذریعہ بنائی گئی جو غیر انسانی بے رحمانہ اور ذلت آمیز سلوک کی تحقیق کر کے ریاستوں کو باخبر کرتی رہتی ہے۔ یہ کمیٹی کسی بھی سرکاری رپورٹ کی محتاج نہیں بلکہ اپنے وسائل سے واقعات کی جانچ کرتی ہے۔

انسانی حقوق کی نگرانی کے لیے ایک عرب کمیشن بھی قائم ہے جو صرف اسرائیلی علاقہ میں عربوں کے خلاف ہونے والے مظالم اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے آگاہ کرتا ہے۔

اقوام متحدہ کا مقصد ہے کہ ہر طرح کی نسلی برتری، تعصب، قومی یا مذہبی علاحدگی پسندی کی نشرواشاعت کے خلاف روک لگائی جائے مگر آج ہندستان میں مسلمانوں کے خلاف نعرے لگ رہے ہیں، بھارت میں رہنا ہے تو گئو ماتا کہنا ہے۔ تم دیو گے اذان، ہم کاٹ لیں گے زبان۔۔۔ کٹوؤں کے دو استھان، پاکستان یا قبرستان۔۔۔ ترشول لگے گا مسجد کے میناروں پر، بندے ماترم بولو ورنہ بھارت چھوڑو۔۔۔ کٹی سپاری بنگلا پان، کٹوے بھیجو پاکستان۔۔۔ ان نعروں کو نہ بھارت کا سیکولر قانون روکتا ہے نہ ہی اقوام متحدہ کا منشور ان خلاف ورزیوں پر کوئی نوٹس لیتا ہے۔

شہریوں کی قتل و غارت گری بھی جاری ہے۔ نازیبا سلوک بھی اور مسلم نوجوانوں کو یرغمال بنا کر میرٹھ اور ملیانہ میں قتل بھی کیا گیا۔ اقوام متحدہ نے ان مظالم کو، جن کی پشت پناہی وہاں کی ریاستیں کرتی ہوں یا عدالتیں، انھیں ظلم قرار دیا ہے۔ جیسے بابری مسجد پر ایک نچلی عدالت کے ذریعہ قبضہ کیا گیا۔ اقوام متحدہ کے قانون کی رو سے شہری

کٹوا حقارت سے ختنوں کو کہتے ہیں یعنی مسلمان۔

آبادیوں کا قتل، بد سلوکی، عوامی اور نجی املاک کی بربادی، شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں شہریوں کی بربادی، ان کی بیخ کنی جیسے معاملات اور عدم رواداری کو بین الاقوامی قانون جرم قرار دیتا ہے۔ اور یہ سب کچھ تو ہو رہا ہے ہمارے یہاں امن وسکون کے ساتھ مسلمانوں کے رہنے کے حق کو چھینا جا چکا ہے۔ سنہ ۱۹۸۴ء میں جنرل اسمبلی نے اعلان کیا تھا کہ ہماری زمین کی قوموں کو امن کا مقدس حق حاصل ہے۔ (۱۲/ نومبر سنہ ۱۹۸۴ء کی قرارداد نمبر ۱۱/۴۹)۔

انسانی حقوق سے متعلق کمیشن نے ۱۱/ فروری سنہ ۱۹۸۲ء کی قرارداد نمبر ۱ سنہ ۱۹۸۲ء میں کہا کہ جارحیت ایک ایسی چیز ہے جو انسانی حقوق کی تعظیم کی نفی کرتی ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ وہ ان تمام حقوق کو جھٹلاتی ہے جو انسانی حقوق کے معاہدوں اور بین الاقوامی دستاویزوں میں دیئے گئے ہیں۔ تشدد اور قتل وغارت گری کے طریقے، آزادی اور شخصی بربادی اور کسی کی حرمت کی پامالی اور دوسروں کے حقوق کی راہ میں رکاوٹ ڈالنا جیسے عمل سے جنگ و بدامنی کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ اور بدقسمتی سے یہ حالات یہاں موجود ہیں۔ یہ ایسے مسائل ہیں جو کسی ملک کا اندرونی مسئلہ نہیں رہ گئے ہیں اسلئے کہ دہشت گردی اور بدامنی کسی علاقہ میں، ہو پوری دنیا اس سے متاثر ہوتی ہے۔ نسل کشی اور نسلی تفریق بین الاقوامی جرائم ہیں اور بھارت ان جرائم کا سب سے زیادہ شکار ہے اسی لیے بدامنی کا بھی شکار ہے۔ آج مسلمانوں کو پوری طرح سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی طور پر ختم کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔

جنوبی افریقہ نے تو خیر اس چارٹر پر دستخط ہی نہ کئے اسلئے وہ ان قوانین کو ماننے سے گریزاں ہے۔ لیکن بھارت ـــــ چہ دلاورست دزدی کہ بکف چراغ دارد، کی مانند دستخط کرنے کے بعد بھی اس منشور کے احترام کو پامال کرتا رہا ہے۔

مسلمانوں کی زندگی کا دارومدار ان کے طرز فکر، عقیدہ اور دینی روایات پر ہے۔ ملت اسلامیہ افراد کی بھیڑ کا نام نہیں ہے۔ نا ہی کسی اتفاقی حادثہ کی بنا پر یہ ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔ ان کے سامنے ایک تصور حیات ایک طرز زندگی ایک دینی فکر وعقیدہ موجود ہے، جو

انہیں ایک ملت بناتا ہے۔ اگر یہ اجزاء بکھر جائیں، فکر و عقیدہ کی یہ زنجیر ٹوٹ جائے، دیوار کی اینٹیں بکھر جائیں، جسم حیات کے اعضاء ٹوٹ کر الگ ہو جائیں تو یہ مختلف الفکر انسانوں کی بھیڑ ہوگی، ایک میلہ ہوگا امت واحدہ نہ ہوگی۔ فکر و نظر کی اس یکسوئی کو مٹا کر بھی ملت کا شیرازہ بکھیرا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ ان کا رشتہ حیات ہی منقطع کیا جائے، ان کو سیاسی و معاشی میدانوں میں غلام بنا کر، ان کے افکار و تصورات اور دینی و تہذیبی اقدار سے ہٹا کر غیر اسلامی فکر و تہذیب کے سانچے میں ڈھالکر ان کی ملی خصوصیات کو ختم کر کے ان کے ملی وجود کو فنا کیا جاسکتا ہے۔ اور اس طرح کسی ملت اور قوم کو اس کا ملی تشخص ختم کر کے ملت کی حیثیت سے اسے ختم کر دیا جاتا ہے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

ملت اسلامیہ کی تشکیل رنگ و نسل، وطن اور زبان کی بنیاد پر نہیں ہوئی ہے، دوسری اقوام کے اتحاد کی بنیاد بننے والے یہ عوامل ملت اسلامیہ کے انتشار کا سبب بنتے ہیں۔

ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں قائم ہونے والی یہ امت جس میں مختلف نسلوں اور قوموں کے لوگ تھے اس میں قریش سے ابوبکرؓ و عمرؓ تھے روم کے صہیبؓ تھے، حبشہ کے بلالؓ، ایران کے سلمانؓ تھے اور یہ سب ملکر ایک کلمہ اور عقیدہ کی بنیاد پر زبان و نسل و رنگ و وطن کو فراموش کر کے صرف مسلمان بن گئے تھے۔ خلافت راشدہ میں مصر، ترکستان، ایران، شام، عراق اور افغانستان کی ساری قومیں ملت اسلامیہ کا جز بنکر صرف مسلمان بن گئیں تھیں۔ پھر دائرہ وسیع ہوا تو برصغیر ہند و پاک و بنگلہ دیش، انڈونیشیا، اسپین و افریقہ، سوڈان، مراکش، الجزائر تک بیشمار قومیں آئیں تو اسلام نے انھیں ایک جسم و امت واحدہ بنا دیا۔ ان میں صرف اسلام مشترک تھا۔ عقیدہ اور فکر نے انھیں ایک قوم بنایا تھا۔

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائیگا
ترک خر گاہی ہوں یا اعرابی والا گہر

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہ گذر

آج اسی وحدت فکر و نظر کو مٹانے، عقیدہ کی دولت چھین لینے، دین کی بنیاد پر وحدت ملت کو قائم رکھنے، مذہب کو بازار اور معاملات سے ختم کر کے انفرادی مسئلہ بنانے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے اور مسلمان اپنی جانیں قربان کر کے اس فکر و عقیدہ کو بچانے پر لگے ہوئے ہیں اور عالم اسلام کو گوش گزار کرنا چاہتے ہیں کہ......

دنیا میں کہیں مسلمان ان حالات سے دوچار نہیں ہیں، جن سے ان کا سامنا ہندستان میں ہے مسلم ممالک وطنیت اور قومیت سے واقف ہی نہیں ہیں اسلئے کہ ان کے یہاں یہ دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔ ان کی وطنیت قومیت اور امت و ملت تقریبًا ایک ہی ہے۔ لیکن ہمارا معاملہ دوسرا ہے۔ مسلم ملکوں میں لڑائی اور جھگڑوں کا پس منظر دوسرا ہے۔ ان کے اختلافات اور جھگڑوں کی بنیاد اقتدار اعلیٰ پر قبضہ ہے۔ لیکن اس کشمکش میں کوئی بھی آئے اقتدار مسلمان ہی کے ہاتھوں میں رہے گا۔

جبکہ ہندستان میں مسلمان کی لڑائی اقتدار اعلیٰ پر قبضہ کی نہیں ہے، بلکہ اسکی لڑائی یہ ہے کہ اسکا دین کیسے بچے، وہ ایک مسلم قوم اور امت کی شکل میں اپنے کو زندہ کیسے رکھے؟ اسکا اسلامی تشخص کیسے برقرار رہے، کفر و شرک و الحاد کے حملوں سے اپنے کو بچائے کیسے؟

آج خبر کی راہ سے نظر کی راہ سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے مسلمانوں کے خلاف نظریاتی حملے تیز ہو چکے ہیں، مسلمانوں کو بتایا جارہا ہے۔ سب راستے خدا تک جاتے ہیں۔ سب ہی مذہب ایک ہیں۔ لیکن اتحاد و یگانگت کا اصل راستہ مشرکانہ تہذیب و اساطیری کہانیوں میں ملتا ہے۔ سب کے اجداد ایک تھے۔ کچھ لوگ بھٹک کر اسلام مذہب میں کسی لالچ سے چلے گئے تھے اب ان کو اپنے پرانے مذہب کی طرف واپس آجانا چاہیئے۔

ترقی پسندی کے نام پر دین سے ہٹانے کی کوشش کی جارہے ہے بڑی جگھوں پر ابھی اذان سے روکا نہیں گیا ہے لیکن دور دراز علاقوں میں جہاں دو چار گھر مسلمانوں کے ہیں انھیں اذان دینے کی اجازت نہیں ہے۔ مساجد شہید کی جارہی ہیں، بتکدہ بنائی جارہی ہیں۔

ابھی پولیس نے مسلم لڑکیوں کی نقاب نہیں چھینی ہے اسکولوں کے اساتذہ نے نہایت شفقت سے ان کے چہروں کی نقابیں اتروادی ہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری لڑکیاں اسٹیج گرلرز بنتی جارہی ہیں۔ مسلمانوں میں کچھ لوگ غیروں کے اشاروں پر چل رہے ہیں جسکا مقصد اپنی تن پروری ہے، وہ پیٹ کے غلام بن کر کام کر رہے ہیں، پیٹ کی غلامی کے چکر میں پڑ کر وہ یہ بھول چکے ہیں کہ پیٹھ پر کتنا بوجھ ہے؟

قومی ایکتا، گنگا جمنی تہذیب اور مشترکہ روایات کے نام پر اسلامی تہذیب کو مٹا دیا گیا پھر وزارت تعلیم دیگر تعلیمی نظام پر ضرب لگائی گئی، اپنوں کی وفاداری پر بھروسہ نہ کر کے، چند مسلم غداروں کی غداری پر زیادہ بھروسہ کیا گیا۔

تہذیب وزبان وثقافت کو بیتا گیا، مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے اردو اکاڈمیاں بنائی گئیں جن کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی زبان کو سرکاری بھنڈار سے راشن تو ملے گا اور ان کو جبراً قتل نہیں کیا جائے گا لیکن غذا اور رسد کی کمی کی وجہ سے وہ خود تڑپ تڑپ کر مر جائیں تو سرکار اس کی ذمہ دار نہ ہوگی۔

حکومت کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ کوئی شعبہ نہیں جس پر اس کی گرفت نہ ہو، تعلیم میں تبدیلی اور تمدن میں تبدیلی ایسی چیزیں ہیں جو مسلمان نہ رہنے دیں گی۔

کانگریسی سرکار کے زمانہ میں جب مولانا ابوالکلام آزاد، رفیع احمد قدوائی جیسے لوگ سرکار میں تھے اسی وقت ۲۳ / دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء کو بابری مسجد پر قبضہ ہوا تھا۔ لیکن کچھ نہ کر پائے یہ بزرگان ملت وزیر رہ کر بھی۔

مخالف پارٹیوں اور کانگریس کا اختلاف اپنا ہے اس سے مسلم مسائل کا کوئی تعلق نہیں ہے اصل میں مسلمانوں اور ان کے درمیان ایک قومی فرق ہے، تہذیبی فرق ہے، طریق عبادت کا فرق ہے اور اسی لیے کانگریس اور حزب اختلاف دونوں مسلمانوں پر اپنا امپریل ازم قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ امپیریل ازم فکر و نظر کا بھی ہے، اور جبر و طاقت کا بھی، کانگریس اور دوسری پارٹیوں میں پالیسی اختلاف ہے جبکہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان قومی و فکری اور عقیدہ کا اختلاف ہے۔ سبھی سیاسی پارٹیوں کا رخ مسلمانوں کے

خلاف ہے۔ اسلئے کہ وہ مسلمانوں کو مسلمان کی حیثیت سے دیکھنے کو تیار نہیں ہیں۔ یہ سب پارٹیاں جملہ قومیتوں اور تہذیبوں کو مٹا کر ایک تہذیب و قوم کی دعوے دار ہیں۔ ہم کہتے ہیں مسلم قوم، مسلم ملت، مسلم امت الگ ہے، وہ ایک قوم کا نعرہ لگا کر مسلمانوں کے امتیاز اور فرق کو مٹا کر ان کی تہذیب، دینی اقدار، تعلیم، قرآن، اذان سب کو بند کرانے کی کوشش میں ہیں اور مسلمان اس کوشش کو ناکام بنانے کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔

چند پیٹ کے غلام مسلمان ان مشرکانہ نعروں کا شکار ہو کر کہنے لگے ہیں کہ بھارت کے اجتماعی نظام میں مذہب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

ایک دوسرا گروہ مسلمانوں کا مسلمانوں کے اقتصادی مسائل سے تو دلچسپی رکھتا ہے مگر اسلام سے نہیں۔ بعض مسلم مسائل کے بارہ میں سوچتے ہیں مگر اپنی اپنی پارٹیوں کے احکامات کے باہر نہیں جاسکتے۔ ایک گروہ صرف تعلیم لئے بیٹھا ہے۔ مگر علم سے دور، گونگا، بہرا اور خانہ نشین۔

مسلم اوقاف کو بے اثر بنا دیا گیا ہے۔ جبکہ صرف ایک صوبہ اترپردیش میں مسلم اوقاف سے چھ سو کروڑ روپیہ سالانہ کی آمدنی ہے۔ جس سے اترپردیش کے مسلمانوں کی پس ماندگی دور کی جاسکتی تھی۔ مگر انتظامیہ کی مرضی سے اس املاک پر بھی غیر مسلموں کو قبضہ کی چھوٹ دے دی گئی ہے اور بڑے بڑے شہروں کو خوبصورت بنانے کے نام پر اس املاک کو سرکار نے ہڑپ کرلیا ہے۔

اس وقت ہندستان میں مسلمانوں کے دو گروہوں سے مسلمان دھوکہ کھا رہے ہیں ایک تو روشن خیال طبقہ ہے جو "امت واحدہ" کا تصور کھوچکا ہے۔

دوسرا طبقہ علماء کا ہے جو اقتدار سے پیر نہیں لینا چاہتا اور اسکولوں کی مالی امداد کے تماشوں میں چلا گیا۔ یہ امداد دینے دار مسلم ممالک بڑی فراخدلی سے دیتے ہیں۔ اس طرح یہ دونوں گروہ جنگ صفین میں نیزوں پر قرآن دیکھ رہے ہیں اور فتنہ ختم کرنے کے بجائے اس کے ہم رکاب ہیں۔

جمہوریت کے نام پر فرعونیت آگے بڑھ رہی ہے، مسلمانوں کی ملی وحدت کو ہر

سطح پر پامال کیا جا رہا ہے اور ملت کو متحد کرنے کا کوئی پروگرام ان دونوں گروہوں کے پاس نہیں ہے۔

بھارت کے سبھی سیاسی گروپ مسلمانوں کی علاحدہ حیثیت کے مخالف ہیں یہ ایسے جمہوری اصول کو مانتے ہیں جہاں حکم اکثریت کا چلے گا۔ ایک قومی دھارا کہتا ہے۔ ایک مین اسٹریم کہتا ہے۔ ایک گنگا جمنی تہذیب کہتا ہے اور ایک قومی ایکتا کہتا ہے لیکن مطلب سب کا ہے نیشنلائیزیشن، یعنی شکر ملوں کی طرح مسلمانوں کو بھی قومی ملکیت میں لے لیا جائے۔

مسلمان اپنے کو بچانے کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ اسلئے کہ جملہ شیطانی فوجیں مسلمانوں کے دین و ایمان پر حملہ آور ہیں۔ اور جو دین و ایمان کے محافظ ہو سکتے تھے وہی ان طاقتوں کے ہمدم و رفیق بن چکے ہیں، وہ احساس و خودی اور غیرت ایمانی کھو کر، انسانیت، مفاہمت اور خیرسگالی کے نعرے لگاتے پھر رہے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ...

رحم کی درخواست سے پہلے یہ دل میں سوچ لے
خون ہے خادم کا آقا کے گلستاں کی بہار

برطانیہ نے اس اختلاف کا نام اکثریت و اقلیت کا اختلاف دیا تھا، کمیونزم اسے اقتصادی اختلاف قرار دیتا ہے۔ درحقیقت یہ اختلاف دو قوموں کا اختلاف ہے۔ ایک کے یہاں مالی منفعت ہی سب کچھ دوسرے کے یہاں قرض حسنہ کا تصور ہے۔ ایک کے یہاں دولت خدا، دوسرے کے یہاں فقر ہی فخر، ایک اوہام پرستی اور مظاہر فطرت کا پرستار دوسرا قادر مطلق و فاطر السماوات والارض کا بندہ، اب قدر مشترک کہاں جو اتحاد ہو اسلئے اتحاد مذاہب اور متحدہ قومیت کے نعرے نکالے گئے تاکہ مسلمان کے دماغ سے وحدت امت کا نظریہ مٹا دیا جائے اس میں انگریز اور ہندو لیڈر ایک ہو گئے۔ اسی نیشنلزم اور متحدہ قومیت کی گونج آج بھی سنائی دے رہی ہے۔ مسلمان جسے قبول نہیں کر رہا ہے اسی لیے ہر سطح پر اسکو روندا جا رہا ہے۔ ساری دنیا میں وطنی اور علاقائی قومیت کا زہر پھیلایا جا رہا ہے تاکہ اسلامی وحدت کو ختم کر دیا جائے۔ اسلام کے خلاف ہر جگہ کفر کی فکر یکساں ہے اور

کیوں نہ ہو "الکفرو ملۃ واحدۃ" لہٰذا ہندستان میں جہاں حاکموں کی سرپرستی بھی اس نظریہ کو حاصل ہو وہاں اسکا مقصد مسلمانوں کو اسلامی فکر و نظر سے ہٹا کر ہندو اکثریت میں جذب کرنے کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا۔

جب مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے انسانوں کی ملکر ایک قوم بنے گی تو اس قوم کا کوئی مذہب نہ ہوگا۔ اور سرکاری سطح پر جب لامذہبیت کا پروپیگنڈہ ہوگا تو مسلم قوم کی نئی نسل تو مرتد ہو جائے گی اور ہندو مذہب کی اقدار، وطنی اقدار قرار پائیں گی اور ان اساطیری کہانیوں کو سب کے دماغوں میں ٹھونسا جائیگا اس طرح مسلمان بچے اپنی تاریخ و روایات سے دور چلے جائیں گے اس لیے کہ وہ غیر ملکی اقدار قرار پا کر جلاوطن کردی جائیں گی اور یہی کوشش آج ہندستان میں جاری و ساری ہے۔ انگریز دشمنی میں متحدہ قومیت کا بیج بویا گیا تھا، جسکا شکار مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے لوگ ہو گئے تھے انگریز کے جانے کے بعد یہ تناور درخت بن کر اہل اسلام کو اپنی اُچھاہنہ (سایہ) میں پنپنے دینا نہیں چاہتا۔

دو قوموں کا نظریہ حیات اور طریق فکر ہی دونوں کے درمیان خط امتیاز کھینچتا ہے۔ لیکن اگر دونوں کا طریق فکر ایک ہو جائے تو دونوں ایک قوم ہو جائیں گے۔

اسپین میں مسلمانوں کی بربادی عالم اسلام کے نقصان کی تلافی نہیں کر پائی ہے ہندستان کے پچیس کروڑ مسلمانوں کی بربادی اور ان کے خون ناحق کو نہ روکنے کی ذمہ داری عالم اسلام پر ہے اگر عالم اسلام نے اس ذمہ داری کو قبول نہ کیا تو وہ دن دور نہیں کہ آج ہم کل تمہاری باری ہے!

ایک نظر اِدھر بھی

طاقت ملی تو کوئی توانا نہیں رہا

سنہ ۶۰۰ء سے سنہ ۱۲۰۰ء تک ہندستان میں تین مذہب تھے۔ ویدک، جین اور بودھ۔ ہیون سانگ کے سفرنامہ سے یہی پتہ چلتا ہے۔

قدیم مذہب ویدک تھا۔ جس میں جانوروں کی قربانی یگوں میں ہوا کرتی تھی۔ گوشت کا استعمال کثرت سے ہوتا تھا۔

شاک خاندان کے شاہزادے گوتم بدھ نے بودھ مذہب کی تبلیغ شروع کی اور اس کے اثرات بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کے موریہ خاندان کے اشوک نے اسے قومی مذہب کی حیثیت دیکر سلطنت کا مذہب قرار دیدیا۔

اس نے یگوں میں جانوروں کی قربانی بند کردی۔ اور شاہی سرپرستی میں یہ مذہب ہندستان سے نکل کر تبت، چین، منگولیا، جاپان، منچوریا، کوریا، لنکا، برما، سائبیریا، کرغس اور کلموک تک پھیلادیا گیا۔

مگر جب بودھوں میں فرقہ بندی شروع ہوگئی اور چینی سیاح اِتسنگ کے زمانہ تک اٹھارہ فرقوں میں بودھ بٹ گئے تو برہمنوں نے اس سے فائدہ اٹھاکر اور بودھ کو وشنو کا نواں اوتار مان کر بودھ کے ماننے والوں کے جذبہ کی تسکین کردی اور کمارل بھٹ نے ویدک دھرم کی تبلیغ کر کے بودھوں کو پیچھے ڈھکیل دیا۔ اس کے بعد شنکر آچاریہ نے اس تحریک کو طاقت عطا کر کے بودھوں کے خلاف نفرت کا بازار گرم کردیا۔ جیسا آج مسلمانوں کے خلاف کیا جارہا ہے۔

"شنکر دگ وجے" جو شنکر آچاریہ کی سوانح حیات ہے اس میں کمارل بھٹ کی زبان

سے یہ کہلایا گیا ہے..... "ویدوں کے مخالف بودھوں کا خاتمہ کرنے کے لیے آپ نے اوتار لیا ہے، اسے میں مانتا ہوں۔" [اوتار کا مطلب خدا آدمی کی شکل میں آیا]

اس کے بعد اور برہمن بھی نکل کھڑے ہوئے اور بودھ مذہب کی جگہ برہمن ازم نے پھر لے لی اور یہی سرکاری مذہب ہو گیا تو بودھ مذہب غائب ہو گیا۔ اسی طرح اسلام کو میٹ دینے کی کوشش ہو رہی ہے۔

موریہ خاندان کے آخری راجہ برہدرتھ کو قتل کر کے اس کا سپہ سالار حکومت پر قابض ہو گیا اور ویدک دھرم کے مطابق یگ کر کے بودھوں کا صفایا کر دیا۔ اس طرح بارھویں صدی عیسوی تک بودھ مذہب کا خاتمہ کر کے ویدک مذہب رائج کر دیا گیا۔

کمارل بھٹ نے بودھ مذہب کو مٹانے کی پوری کوشش کی اور اس کے زور کو توڑ دیا کمارل کی موت کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد شنکر آچاریہ کیرل کے کالپی نام کے گاؤں میں سنہ ۷۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ کم عمری میں تمام علوم حاصل کر کے بڑے عالم بن گئے اور اپنے علم کے اس زور کو جین اور بودھ مذہب کے خلاف نفرت پھیلانے میں صرف کرنے لگے۔ وہ برہمن مزاج کے صحیح ترجمان تھے کہ یہ بھی ٹھیک وہ بھی ٹھیک۔ انھوں نے ویدوں کی تبلیغ بھی کی اور بودھ کے اصول کو بھی اپنانے کا اعلان کرتے رہے جیسے آج کے ہندو لیڈر مسجدوں کی شہادت خاموشی سے دیکھتے رہتے ہیں اور شہادت کے بعد سیکولرازم کا جھنڈا لیکر اس فعل کی مذمت بھی کرتے ہیں مجرموں کو تحفظ عطا کرتے ہوئے ان کے جرم سے اختلاف کا اظہار کرتے ہیں۔

شنکر آچاریہ نے ملک کے چار کونوں میں مٹھوں یعنی مذہبی مرکزوں کے نام پر بدھ مذہب کو دبانے کے لیے نگراں چوکیاں قائم کیں۔ جنوب میں سونگیری کے مقام پر۔ مشرق میں پُری کو مرکز بنایا۔ مغرب میں دوارکا، اور شمال میں بدر کاشرم۔ اس طرح ویدک مذہب یا برہمن ازم کی یہ نگراں چوکیاں بودھوں کی نگرانی اور پڑوس سے ان کے داخلہ اور بودھ مذہب کے مبلغوں کو روکنے کی ترکیب تھی۔

شنکر آچاریہ کا انتقال صرف بتیس برس کی عمر میں ہو گیا برہمنوں نے ان کی ان

خدمات جلیلہ کے بدلہ جگت گرو یعنی معلم عالم کا لقب دے دیا۔
کل کے ویدک آج کے ہندو کل کی راہ پر جا رہے ہیں اور ہندستان سے اہل اسلام کو مٹا دینے کے سارے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان میں اتر پڑے ہیں۔

اور بابری مسجد شہید کروادی گئی

۲۳ / دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء کی رات کو فیض آباد کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ایما پر بابری مسجد میں بُت نصب کر دیئے گئے جس کے بعد سنہ ۱۹۵۰ء میں عدالت کے حکم سے تالا بندی کر کے یک طرفہ طور پر مسلمانوں کو نماز سے روک دیا گیا اور ہندوؤں کو پوجا کی اجازت دے دی گئی اگر چہ عام اجازت نہ تھی مگر پانچ پانچ کے جتھے جاتے رہتے تھے اور مسلمانوں کیلئے علاقہ ممنوعہ تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی بھی بے اثر رہے۔ ان کی نظر قرآن پر تھی مگر اس کے اس حکم پر شاید نہیں تھی کہ وہ نہایت غور سے دیکھ رہا ہے۔ اسی یقین نے اچھے اعمال پر کاربند کر دیا تھا اور وہی عمل تھا جس نے تیئیس برس میں پورے عرب کا حاکم بنا دیا اور سو برس کے اندر چار ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے اسپین تک پہونچا دیا۔ طارق نے کشتیوں کو اسی کے بے میل ایمان کے سہارے جلا کر سارے دنیاوی اسباب سے رشتہ توڑ کر صرف اللہ کے سہارے میدان جہاد میں گھوڑا ڈال دیا آج کا ہمارا ہندستانی پیشوا اسے حماقت کہے گا۔ ہلاکت سے تعبیر کرے گا۔ مگر طارق کی نظر میں حنین کی جنگ تھی۔ جس قوم کے بزرگوں نے کسریٰ اور فرعون کی قوم کو ختم کر دیا آج وہ کہاں کھڑی ہے۔

آج ہمارے پاس موسموں کے ساتھ بدلنے والا اسلام ہے۔ انگریز کے زمانہ میں کونسلوں کے بائیکاٹ کا حکم تھا۔ جنھوں نے خلافت کے لیے قوم کو بیدار کیا تھا انگریز کی

ملازمت ترک کرنے کا فتویٰ دیا تھا۔ ہجرت کا حکم دیا تھا انھیں لیڈروں کی موجودگی میں مسجدوں پر قبضہ کا عمل شروع ہو گیا تھا اور وہ حکومت میں حصہ دار بھی تھے۔ کل فتویٰ تھا انگریز سے تعاون حرام لین دین حرام آج فتویٰ تھا شرک سے تعاون کے بغیر اسلام نہیں بچے گا۔ مساجد نہیں بچیں گی۔ اب خلافت کا تصور غائب تھا۔ کفروشرک سے مفاہمت طے ہو گئی تھی۔ اتنا فرق قرآن کے احکامات میں۔ اتنی جلدی جلدی تبدیلی زمانہ کے ساتھ چلنے کا اتنا بیہودہ عمل تو کسی جانور کی زندگی میں بھی نہ ملے گا۔ سویرے کا اسلام کچھ شام کا اسلام کچھ۔ یہ دنیا پرستی اور قرآن سے بیزاری اور اس کی آیتوں کو جھٹلانے کا عمل کتنا عبرت انگیز رہا ہے۔

کسی بھی چیز پر قدرت نہ رکھنے والی جماعت مومنوں کی نہیں ہو سکتی اور آج ہمیں اپنے نفس پر بھی قدرت حاصل نہیں ہے۔ مسلمانوں کو بیدار کرنے والی طاقت خود ان کے ضمیر کی آواز ہے جس کو خیرسگالی، مفاہمت اور انسانیت کے گمراہ کن نعروں میں دبا دیا گیا ہے۔

یکم فروری سنہ ۱۹۸۶ء کو فیض آباد کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بابری مسجد کے گیٹ پر لگے تالے کو کھولے جانے کا فیصلہ سنا دیا اور اس مجسٹریٹ نے حکومت کو ہدایت دی کہ بابری مسجد کی حفاظت پر تعینات فورس ہٹا لی جائے تاکہ ہندو وہاں بے روک ٹوک پوجا کر سکیں۔

۵/ فروری کو اس فیصلہ کے بعد لکھنؤ میں مسلمانوں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ جس میں مولانا مظفر حسین کچھوچھوی، میں (ڈاکٹر خان محمد عاطف)، محمد اعظم خاں ممبر اسمبلی، ظفریاب جیلانی ایڈوکیٹ اور مسلم مجلس کے صدر فضل الباری اور دیگر حضرات نے شرکت کی۔ کئی تقریریں ہوئیں۔ میں نے اول مسلم مجلس کے صدر کو مشورہ دیا کہ مسلم مجلس کو بابری مسجد کا مسئلہ اپنے ہاتھ میں لیکر یہ لڑائی لڑنا چاہئے مگر صدر مجلس پر سیکولرازم کا بھوت سوار تھا۔ انھوں نے مجلس کو اس سے الگ رکھنے کی بات کہی۔ تب میں کھڑا ہوا اور میں نے کہا کہ علمائے محترم طے کریں کہ بابری مسجد میں کب نماز پڑھیں گے اور اعلان کر دیں کہ

فلاں تاریخ کو جس کو شوق شہادت ہو وہ چلے، بس کھلبلی مچ گئی اور کچھ لوگوں نے کہا اس طرح مسائل کیسے طے ہوں گے اور کانا پھوسی کرکے یہ طے کردیا گیا کہ کچھ لوگ طے کرکے فیصلہ سنا دیں گے اور دس پندرہ لوگ وہاں سے اٹھ کر دارالشفاء میں اعظم خاں کے کمرہ پر جمع ہوگئے جس میں مسلم مجلس کے صدر فضل الباری نے مظفر حسین کچھوچھوی کا نام پیش کردیا کہ بابری مسجد ایکشن کمیٹی بنا کر ان کو صدر بنا دیا جائے اور اعظم خاں کنوینر رہیں اعظم خاں نے کہا قانونی مشورے کیلئے ظفریاب جیلانی بھی میرے ساتھ کنوینر رہیں گے ایک صدر اور دو کنوینر کی بابری مسجد ایکشن کمیٹی بن گئی۔

دوسرے دن ٦ / فروری سنہ ١٩٨٦ء کو میں ندوہ میں مولانا ابوالحسن علی ندوی سے ملا اور کہا کہ آپ چاہیں تو بابری مسجد کا مسئلہ طے کروا سکتے ہیں جس کے دو طریقے ہیں پہلا اور آسان طریقہ یہ ہے کہ عالم اسلام آپ کی آواز پہچانتا ہے آپ عرب سفیروں سے ملیں اور بتائیں کہ ان کے یہاں سے آنے والے تیل کا ہر قطرہ ہندستان میں مسلمانوں کی املاک کو نذر آتش کرنے پر صرف ہو رہا ہے اور بابری مسجد کو بتکدہ بنا دیا گیا ہے لہذا آپ اپنی حکومتوں سے کہیں کہ وہ مداخلت کرکے اس بربریت کو رکوائیں ورنہ ہندستان کے لیے تیل بند کردیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ اعلان کردیں کہ میں (یعنی ابوالحسن علی ندوی) فلاں تاریخ کو بابری مسجد میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں جسے شوق شہادت ہو وہ چلے اسلئے کہ سیرت سید احمد بریلوی آپ لکھیں گے اس پر عمل کون کرے گا؟

مولانا نے کہا اس کے لیے مشورہ درکار ہے۔

میں نے کہا ــــ آپ اضلاع میں اپنے خلفاء مقرر کردیں جو بیعت جہاد لینے لگیں یہی مشورہ ہو جائے گا۔

مولانا نے کہا ــــ اچھا سوچیں گے۔

پھر بابری مسجد سے متعلق واقعات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ جون سنہ ١٩٨٩ء میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی نیشنل ایکزیکوٹیو نے حکومت سے مانگ کی کہ یہ جگہ ہندؤں کے سپرد کردی جائے۔

سنہ ۱۹۸۹ء کے پارلیمانی انتخاب کے بعد بابری مسجد کے مسئلہ نے نیا رخ اختیار کیا۔ وی۔ پی۔ سنگھ بھارتیہ جنتا پارٹی کے تعاون سے وزیراعظم بنے تھے۔ اسلئے اس کے دوسرے بازو وشوہندو پریشد نے وی۔ پی۔ سنگھ کی سرکار پر مندر کی تعمیر کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ الکشن سے پہلے ہی مغربی بنگال کے وزیراعلیٰ جیوتی باسو نے بھارتیہ جنتا پارٹی سے کسی بھی طرح کے تعاون کے مضمرات سے وی۔ پی۔ سنگھ کو آگاہ کیا تھا مگر وزارت عظمیٰ کی کرسی جو سامنے تھی کچھ ان کی سمجھ میں نہ آیا۔

اگست سنہ ۱۹۹۰ء میں بی۔ جے۔ پی کے لیڈر ایل۔ کے۔ ایڈوانی نے تجویز پیش کی کہ اگر مسلمان بابری مسجد سے دست بردار ہو جائیں تو وہ متھرا اور بنارس کی مسجدوں پر سے اپنا دعویٰ اٹھالیں گے۔ مذہبی بلیک میلنگ کا کتنا بھونڈا طریقہ ہے یہ۔ آگے انھوں نے کہا کہ اس مسئلہ کا حل عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔

۲/ستمبر سنہ ۱۹۹۰ء کو ایڈوانی نے اعلان کیا کہ اپنی رتھ یاترا کے ذریعہ آٹھ ریاستوں سے گزر کر اجودھیا میں ۳۰/اکتوبر سنہ ۱۹۹۰ء کو مندر کی تعمیر کے لیے کارسیوا کریں گے۔ رتھ یاترا شروع ہوتے ہی گجرات، راجستھان اور یو۔ پی میں کئی علاقوں میں فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

۱۹/اکتوبر سنہ ۱۹۹۰ء کو صدر جمہوریہ آر۔ وینکٹ رمن کے ایک آرڈی ننس کے ذریعہ اس جگہ کو اکوائر کرلیا گیا جہاں بابری مسجد تھی۔ مسلمانوں کی طرف سے اس پر بے چینی کا اظہار کیا گیا اور اس حکم کو واپس لینے کے مطالبہ نے زور پکڑا۔

۲۳/اکتوبر سنہ ۱۹۹۰ء کو بہار میں سمستی پور کے علاقہ میں لالو پرساد یادو کی سرکار نے لال کرشن ایڈوانی کو گرفتار کرلیا۔ ۲۴/اکتوبر کو بھارتیہ جنتا پارٹی نے صدر جمہوریہ کو مطلع کر دیا کہ اس نے نیشنل فرنٹ کی سرکار سے اپنی مدد واپس لے لی ہے۔

۵/نومبر سنہ ۱۹۹۱ء کو سپریم کورٹ نے متنازعہ احاطہ کے اندر کسی بھی طرح کی تعمیر کے خلاف حکم امتناعی جاری کر دیا۔

۶/جنوری سنہ ۱۹۹۲ء کو وشوہندو پریشد کے جنرل سکریٹری اشوک سنگھل نے

وارانسی (بنارس) میں اعلان کیا کہ بابری مسجد کا ڈھانچہ منہدم کر کے مندر کی تعمیر جلد شروع کر دی جائے گی۔

۱۲/ جولائی سنہ ۱۹۹۲ء کو سپریم کورٹ نے فیصلہ سنایا کہ اسکی ہدایت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اگر کوئی تعمیر عمل میں آئی تو وہ گرائی جاسکتی ہے [یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ تعمیر گرائی جاسکتی مگر تخریب کی تعمیر بھی کرائی جاسکتی ہے اس قانونی نکتہ پر بھی برسوں بحث چلائی جاسکتی ہے جبکہ عدالت عالیہ کی نیت صاف ہے]

۸/ جولائی سنہ ۱۹۹۲ء کو اجودھیا میں وشو ہندو پریشد نے کار سیوا شروع کر دی۔

۱۶/ جولائی سنہ ۱۹۹۲ء کو اتر پردیش کی بی۔ جے۔ پی سرکار کے ذریعہ اکوائر کی گئی ۲٫۷۷ ایکڑ زمین پر کسی بھی طرح کی تعمیری سرگرمی پر ہائی کورٹ نے روک لگادی۔

۱۷/ جولائی کو کار سیکوں نے تعمیراتی کام روکنے سے ہائی کورٹ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

۲۵/ جولائی سنہ ۱۹۹۲ء کو وزیر اعظم کی اس یقین دہانی پر کہ اس مسئلہ کا حل تین ماہ کے اندر نکال لیا جائے گا۔ متنازعہ جگہ پر تعمیراتی کام روک دیا گیا۔

۴/ اگست سنہ ۱۹۹۲ء کو سپریم کورٹ نے یہ پتہ لگانے کے لیے اجودھیا کے بابری مسجد کے علاقہ میں کی گئی تعمیر کس نوعیت کی ہے۔ رجسٹرار جنرل کی سرکردگی میں ایک تین نفری پینل مقرر کیا۔

۳/ اکتوبر سنہ ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور وشو ہندو پریشد کے لیڈروں میں بات چیت شروع ہوئی۔

۳۰/ اکتوبر کو وشو ہندو پریشد کے مذہبی لیڈروں نے ۶/ دسمبر سنہ ۱۹۹۲ء کو اجودھیا میں کار سیوا شروع کرنے کا اعلان کیا۔

۲۳/ نومبر سنہ ۱۹۹۲ء کو قومی یکجہتی کونسل نے متفقہ طور پر قرارداد پاس کر کے وزیر اعظم کو آئین کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے ہر قدم اٹھانے کا اختیار دے دیا۔

۲۷/ نومبر سنہ ۱۹۹۲ءکومرکزی فورس اجودھیا بھیجی گئی۔

۲۸/ نومبر کو یو- پی کی بی- جے- پی سرکار کی اس یقین دہانی کو سپریم کورٹ نے مان لیا کہ وہاں کوئی تعمیراتی کام نہیں ہوگا[یو- پی سرکار نے تعمیر نہ کرانے کا حلف نامہ دیا تھا بابری مسجد مسمار نہیں ہوگی اسکا نہیں]

نئی دہلی یکم دسمبر سنہ ۱۹۹۲ءکو آر-ایس-ایس کے جنرل سکریٹری راجیندر سنگھ نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ کارسیوا کو صرف بھجن کیرتن تک محدود نہیں رکھا جائے گا بلکہ اس موقع پر وہاں صفائی کے ساتھ پوجا پاٹ کی جائے گی۔ صفائی کا مطلب صاف ہے کہ بابری مسجد کو صاف کر دیا جائے گا۔

۴/ دسمبر سنہ ۱۹۹۲ءتک تقریباً دولاکھ آر-ایس-ایس کے تربیت یافتہ افراد کارسیوکوں کی شکل میں پہونچ گئے اس تنظیم کے پاس لگ بھگ ۶۵ لاکھ افراد ہیں۔

۵/ دسمبر سنہ ۱۹۹۲ءکو وشوہندو پریشد نے مزید کارسیوک بھیجنے کی اپیل کی (اشوک سنگھل نے) اور ۶/ دسمبر سنہ ۱۹۹۲ءکو ۴:۴۵ بجکر پینتالیس منٹ پر بابری مسجد شہید کر دی گئی۔

ہندو لیڈروں کے ان اعلانات کے باوجود مسلمانوں کی طرف سے کسی نے بابری مسجد بچانے کی کوئی سنجیدہ نہ تو کوشش کی اور نا ہی کوئی منصوبہ بندی۔ دینی لیڈروں اور سیاسی لیڈروں کی لاگ ڈانٹ چلتی رہی علماء کہتے رہے جب ہم سے مسئلہ پوچھا جائے گا بتا دیں گے۔

سیاسی افراد مختلف سیاسی پارٹیوں میں اپنی گوٹیں فٹ کرتے رہے۔

اور اس طرح مسجد کہانی اور مندر کو حقیقی روپ دینے کے نعرے لگا کر سب کو مغالطہ دیا جانے لگا۔۔۔۔ پہلی اطلاعی رپورٹ جسے F.I.R. کہتے ہیں۔ ۲۳/ دسمبر سنہ ۱۹۴۹ءکو اجودھیا تھانہ میں لکھی گئی۔ ماتادین نام کے کانسٹبل نے اسے لکھایا اور سب انسپکٹر رام پرشاد دوبے نے لکھا۔ ماتادین نے بتایا کہ صبح ۸ بجے جب وہ جائے واردات پر پہونچا تو اسے پتہ چلا کہ رات کو پچاس ساٹھ لوگ مسجد کا تالا توڑ کر اور کچھ سیڑھی کے ذریعہ دیوار

پھاند کر اندر گھسے اور بھگوان رام کی مورتی مسجد کے اندر نصب کر دی۔

جس کے بعد چار دیوانی مقدمے دائر کئے گئے۔ سب میں یہی کہا گیا کہ ہائی کورٹ کے فیصلہ تک موجودہ حالت برقرار رہے۔ یعنی مورتی نہ ہٹائی جائے۔ غاصبانہ قبضہ قائم رکھا جائے۔ حالانکہ عدالت کا ذہن اگر عدل و انصاف کی طرف ہوتا تو ۲۳ / دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء سے پہلے والی پوزیشن کو بحال رکھا جاتا۔

۱۴ / اگست سنہ ۱۹۸۹ء کو ہائی کورٹ نے حکم دیا کہ عدالت کے مزید احکامات آنے تک عمارت کی موجودہ صورت کو بدلا نہ جائے۔ شلانیاس (سنگ بنیاد) سے پہلے اترپردیش کی کانگریس سرکار نے ہائی کورٹ سے وضاحت طلب کی تو اس نے ۷ / نومبر سنہ ۱۹۸۹ء کو صاف الفاظ میں کہا کہ ۱۴ / اگست والے آڈر کا مطلب دراصل یہ تھا کہ نہ تو بابری مسجد کی عمارت میں کوئی تبدیلی کی جائے اور نہ مسجد کے آس پاس کے ۲۳ قطعات آراضی کو ہاتھ لگایا جائے۔ جس کی فہرست کورٹ کے فیصلہ میں موجود ہے۔

جون سنہ ۱۹۹۱ء میں بی۔جے۔پی کی سرکار آ گئی تو اس نے ۷ / اکتوبر سنہ ۱۹۹۱ء کو ۲٫۷۷ ایکڑ مسجد سے متصل زمین اپنی تحویل میں یہ کہہ کر لے لی کہ یہ نزول کی زمین ہے اس لیے اس پر حکومت کا حق ہے جہاں وہ سیاحت کو فروغ دے گی۔

اترپردیش سرکار کے اس فیصلہ کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا گیا۔ ۲۵ / اکتوبر سنہ ۱۹۹۱ء کو ہائی کورٹ نے حکم صادر کیا کہ وہاں کوئی تعمیر نہیں کی جائے گی۔

اس کے بعد بی۔جے۔پی والوں کا نعرہ بدلا۔ مندر کہاں بنانا ہے؟ مندر بنا بنایا ہے۔ یعنی یہ مغالطہ کہ بابری مسجد نہیں بلکہ وہ مندر ہے۔

۱۹ / جولائی سنہ ۱۹۹۱ء کلیان سنگھ اترپردیش کے وزیراعلیٰ نے کہا اگر مسلمان چاہیں بھی تو مسجد کی مرمت اور اسے بنانے سنوارنے کا کام نہیں کر سکتے اسلئے کہ یہاں سنہ ۱۹۴۹ء سے نماز ہی نہیں ہوئی..... یہ بیان بتا رہا ہے کہ سنہ ۱۹۴۹ء سے پہلے نماز ہوتی رہی ہے۔

اڈوانی نے کہا مسجد کو توڑنے کا سوال اس وقت اٹھتا جب یہاں کوئی مسجد ہوتی

یہاں تو کوئی مسجد ہی نہیں ہے۔

پوری کے شنکر آچاریہ نرہندر دیو تیرتھ ۱۵ / دسمبر ۱۹۹۲ کو بھی اپنے اور ملک کو گمراہ کرنے کے لیے یہی نعرہ بلند کر رہے ہیں کہ ہندوؤں نے اپنا ہی مندر گرایا ہے مسجد نہیں۔

لیکن ان لوگوں کے گانجا نصیب دماغوں کیلئے اس وقت کے وزیراعلیٰ پنڈت گووند بلبھ پنت کا وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے نام خط اور وزیر داخلہ سردار پٹیل کا ۹ / جنوری سنہ ۱۹۵۰ کا خط جو اتر پردیش کے وزیراعلیٰ کے نام لکھا گیا ہے جس میں لکھے الفاظ میں کہا تھا کہ اس طرح کی زبردستی اور یک طرفہ جارحانہ کاروائی برداشت نہیں کی جا سکتی۔ سردار پٹیل سے پہلے پنڈت نہرو نے بھی ۲۶ / دسمبر سنہ ۱۹۴۹ کو وزیراعلیٰ پنڈت گووند بلبھ پنت کو ایک خط لکھا تھا جس میں بابری مسجد میں مورتی رکھنے پر سخت تشویش کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ اس طرح کی خطرناک مثال قائم کرنے کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ اور ۷ / جنوری سنہ ۱۹۵۰ کو پنڈت جواہر لال نہرو نے آزاد ہندستان کے پہلے گورنر جنرل راج گوپال آچاریہ کو بھی ایک خط لکھا تھا اس خط میں بھی پنڈت نہرو نے بابری مسجد کے واقعہ پر سخت تشویش کا اظہار کیا تھا۔ جس پر راج گوپال آچاریہ نے بھی اپنی سخت ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔

سپریم کورٹ کے ممتاز قانون داں جناب اے۔ جی۔ نورانی نے پنڈت نہرو کے کاغذات سے پنڈت گووند بلبھ پنت کے اس خط کو بھی حاصل کر لیا جو لکھنؤ سے ۹ / فروری سنہ ۱۹۵۰ کو مسٹر پنت نے جواہر لال نہرو کو لکھا تھا۔ سرکاری ریکارڈ کے مطابق اس کا پس منظر مندرجہ بالا ماتا پرشاد کی رپورٹ ہے۔

یہاں ہم اتر پردیش کے وزیراعلیٰ پنڈت گووند بلبھ پنت کے اس خط کو نقل کر رہے ہیں جو نورانی صاحب نے دریافت کیا ہے۔

پنڈت نہرو کے نام پنڈت گووند بلبھ پنت کا خط

لکھنو ۹ / فروری ۱۹۵۰ء

مائی ڈیئر جواہر لال جی

آپ کے ۵ / فروری کے خط کا شکریہ۔ گزشتہ موقع پر جب میں نے آپ کے ساتھ اجودھیا کی صورت حال پر بات چیت کی تھی اس کے بعد سے ابتک وہاں کے حالات میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں ہوئی ہے اگر کچھ پیش رفت ہوئی بھی ہے تو وہ قابل ذکر نہیں ہے۔ چوں کہ مسلمان ضلع عدالت سے مقدمہ ہائی کورٹ میں منتقل کرنا چاہتے ہیں اسلئے دفعہ ۱۴۵ کے تحت کاروائی ملتوی کردی گئی ہے۔ سول کورٹ نے جو عارضی حکم امتناعی نافذ کیا ہے اس پر ایک ہفتہ میں سماعت ہوگی اور حکومت کی طرف سے اس کی مخالفت کی جائے گی رام پور کے چیف کمشنر مسٹر جے کیرت سنگھ کو ایڈیشنل کمشنر کی حیثیت سے فیض آباد اور اجودھیا کا خصوصی چارج دے دیا گیا ہے۔ وہ ایک تجربہ کار، باصلاحیت اور قابل اعتماد افسر ہیں۔ اور ان کو جو ہدایت دی جائے گی اس پر وہ ایمانداری کے ساتھ عمل کریں گے۔ اجودھیا کے سٹی مجسٹریٹ کو منتقل کر کے ایک دوسرے افسر کو مقرر کردیا گیا ہے۔

ضلع مجسٹریٹ نائر کا بھی جلد ہی تبادلہ کردیا جائے گا۔ اس تبادلہ سے پہلے احتیاط سے کام لینا پڑے گا وہ جھکی اور ضدی ہے۔ جئے کیرت سنگھ اب تمام امور کا ذمہ دار ہے اور نائر کے اختیارات محدود کر دیئے گئے ہیں۔ اب ایک افسر کی حیثیت سے نائر کا اجودھیا سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا ہے۔ اس کی جگہ پر ہم جلد ہی دوسرا کلکٹر مقرر کر رہے ہیں۔ اگرچہ اس واقعہ پر مقامی طور پر کشیدگی نہیں ہے تاہم صورت حال بہت ہی نازک اور پیچیدہ ہے۔ جئے کیرت سنگھ مطلوبہ طریقہ پر کام کر رہا ہے۔ اس کو امید ہے کہ اطمینان بخش حل نکل آئے گا اور پرامن طور پر مورتیاں ہٹا دی جائیں گی۔ آپ کو اس واقعہ پر جس تشویش اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اسکا اور اس معاملہ کی اہمیت کا مجھے احساس ہے۔ اگر حالات سازگار ہوتے تو میں خود ہی آپ سے اجودھیا کے دورہ کی درخواست کرتا۔ اگر

ضرورت ہوئی تو مناسب وقت پر میں ایسا کروں گا۔ فی الحال میں آپ کے قیمتی وقت کو اس مقصد کیلئے استعمال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا ہوں۔ خاص کر ایسی حالت جبکہ دوسری مصروفیتوں کے علاوہ پارلیمنٹ میں آپ کی موجودگی ناگزیر ہے اور آسانی سے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔

آپکا مخلص

دستخط (جی۔ بی۔ پنت)

روزنامۂ آزاد ہند کلکتہ ۹ / نومبر سنہ ۱۹۹۲ء

یہ خط پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ بابری مسجد میں مورتیاں رکھی گئیں جس پر وزیر داخلہ سردار پٹیل تک نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اسے زبردستی اور جارحانہ کاروائی قرار دیا تھا مگر آج کے گانجا نصیب ہندو لیڈر جن میں مسٹر اڈوانی اور پوری کے شنکر آچاریہ تک شامل ہیں اسے مندر بتا رہے ہیں اور اپنی جارحانہ کاروائی کو مندر توڑنے کی بیہودہ حرکت کہہ کر حرام کھانے کو ہلال بنانے کی مضحکہ خیز حرکت سے تعبیر کر رہے ہیں اور اگر ہندو لیڈروں کے یہاں مندر توڑنا جائز ہے تو پھر بنگلہ دیش اور پاکستان میں مندر توڑے جانے کی حرکت پر واویلا کیوں مچا رہے ہیں۔

ہر ظلم ہے ظالم کیلئے ایک آزار
ہر قہر ہے قاہر کے لیے ایک شرار
جو توڑ رہے ہیں دل، انھیں کیا معلوم
ٹوٹے ہوئے شیشوں میں چھپی ہے تلوار

غیرت مرد مومن

بابری مسجد کی لڑائی کے لیے مسلمانوں کی دو کمیٹیوں نے بابری مسجد بچانے کی ذمہ داری لی تھی۔ ایک تو ایکشن کمیٹی اور دوسری رابطہ کمیٹی۔ ایکشن کمیٹی کے صدر سید مظفر حسین کچھوچھوی تھے اور دو کنوینر ظفریاب جیلانی اور محمد اعظم خاں جو ملائم سنگھ یادو کی پارٹی کے باقاعدہ ممبر اور یو۔ پی اسمبلی میں رام پور سے اسی پارٹی کی نمائندگی بھی کرتے تھے۔ پھر اسے آل انڈیا بنا کر بابری مسجد ایکشن کمیٹی میں امام بخاری اور ان کے بیٹے نائب امام احمد بخاری اور حیدر آباد سے اتحاد المسلمین کے ممبر پارلیمنٹ سلطان صلاح الدین اویسی کو بھی شامل کیا گیا۔ سید شہاب الدین نے رابطہ کمیٹی کے نام سے اپنے کو الگ کر لیا اور انہی دونوں کمیٹیوں کو مسلمانوں نے بابری مسجد کی تحریک کیلئے مجاز کردیا۔

اترپردیش بابری مسجد ایکشن کمیٹی نے سنہ ۱۹۹۰ کے الکشن میں اترپردیش میں ملائم سنگھ کی مدد کی اور سید عبداللہ بخاری نے وی۔ پی۔ سنگھ کے لیے اپیل کی۔ شہاب الدین بھی وی۔ پی۔ سنگھ کی جنتا دل میں شامل ہو گئے اس طرح ایکشن کمیٹی کا ایک گروپ اترپردیش میں ملائم سنگھ کے احسان کا بدلہ چکا رہا تھا تو دوسرا گروپ وی۔ پی۔ سنگھ کی اپنی سرکار قربان کردینے کی دہائی دے رہا تھا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اترپردیش میں مسلم ووٹ یو۔ پی اسمبلی کے لیے ملائم سنگھ اور لوک سبھا کے لیے وی۔ پی۔ سنگھ میں بٹ گیا اور اس طرح لاکھوں مسلم ووٹ اوپر نیچے کے چکر میں اِن ویلڈ ہو گیا اور اترپردیش میں بی۔ جے۔ پی کی سرکار بن گئی۔

مسلمان مردم شماری اور ووٹ شماری کے فرق سے واقف ہی نہیں ہے وہ ووٹ ووٹر لسٹ میں لکھانے نکلتا نہیں ہے۔ جانچ بھی نہیں کرتا کہ لسٹ میں اسکا نام ہے یا

نہیں۔ مسلم دشمن منظم طاقتیں اس کے ووٹ کو ووٹر لسٹ سے بڑی ہوشیاری سے غائب بھی کرواتی رہتی ہیں۔ پھر ہندی میں مسلمانوں کے نام صحیح لکھے بھی نہیں جاسکتے اس طرح ملک میں کروڑوں مسلم ووٹ رد کردیا جاتا ہے۔

اترپردیش میں چالیس پیالیس سیٹیں ایسی ہیں جہاں مسلمان اپنے بل پر جیت سکتا ہے۔ اور ڈیڑھ سو سیٹوں پر جسکو چاہے ہرا جاسکتا ہے۔ پچانوے (۹۵) سیٹیں ایسی ہیں جو شیڈیول کاسٹ کے نام سے صرف ہندؤں کے لیے محفوظ کردی گئی ہیں جن پر کوئی مسلمان نہیں کھڑا ہوسکتا۔ اس طرح ۴۲۶ کے اترپردیش اسمبلی ہال میں ۹۵ سیٹوں پر مسلمانوں کو بیدخل کردیا گیا ہے۔ شیڈیول کاسٹ میں مہتر بھی آتے ہیں اور مسلمانوں میں بھی مہتر ہوتے ہیں لیکن ہندو مہتر ان سیٹوں پر کھڑا ہوسکتا ہے مسلم مہتر نہیں۔ ساتھ ہی انتخابی حلقوں کی حد بندی اس طرح کی گئی ہے کہ مسلم اکثریت کا کوئی حلقہ نہ بننے پائے۔

راجیوگاندھی کے زمانہ میں دل بدلی قانون پاس ہوا جس میں اگر کوئی ممبر پارٹی کے وہپ کے خلاف کام کرتا ہے تو قانون ساز ادارہ سے اسکی ممبری بھی ختم کردی جائے گی اب اگر کوئی بل ایسا آجائے جو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہو تو کوئی مسلم ممبر اس کے خلاف نہیں جاسکتا جائے گا تو قانون کی روسے اسکی ممبری ختم ہوجائے گی۔ اسلئے سبھی کو پارٹی ضابطوں کے مطابق ہی چلنا ہے۔

اس لیے بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور رابطہ کمیٹی میں بھی ملائم سنگھ اور وی۔ پی۔ سنگھ کے وفادار تھے اور انہی کے حکم کے مطابق عمل کررہے تھے۔

ملک کے پورے سیکولر حزب اختلاف نے کارسیوا کے اعلان کے ساتھ ہی یہ اعلان کیا کہ بابری مسجد کی لڑائی سیکولر فورسیز لڑیں گی مسلمان نہ نکلیں ورنہ فرقہ پرست طاقتیں اور مضبوط ہوں گی۔ ان لیڈروں نے یہ اعلان بھی کیا کہ ان کے ورکر جگہ جگہ کارسیوکوں کو روکیں گے اور دولاکھ پارٹی ورکروں کو کارسیوکوں کے مقابلہ پر کھڑا کریں گے۔ مگر ہوا کیا؟ کیا قول کیا فعل؟

مرکزی سرکار نے مرکزی فورسز کو فیض آباد روانہ کرنا شروع کردیا اور کہا کہ

ایسی ٹکنیک استعمال کی جائے گی کہ چند منٹ تک لوگ ہنستے رہیں گے، ہیلی کاپٹر سے جال ڈالکر لوگوں کو بے بس کردیا جائے گا۔ اچانک یہ فورس لوگوں کو دبوچ لے گی اور ہر قیمت پر ڈھانچہ کی حفاظت کی جائے گی۔ اس طرح مرکزی فورسز کے ریہرسل کے سب دعوے جھوٹے ثابت ہوئے اور مرکز نے بابری مسجد کی شہادت کے بعد اترپردیش کی بی۔جے۔پی سرکار کو برطرف کرکے فارسی کی اس مثل کے مطابق کام کیا۔۔۔ "ہر چہ دانا کند، کند نادان مگر بعد از خرابئ بسیار۔"

ملک کے سیکولر حزب اختلاف نے بابری مسجد کے مسئلہ کو سیکولر بتاکر اور یہ کہہ کر کر مسلمان اسکو مسلم مسئلہ نہ بنائیں وہ خود بابری مسجد کی حفاظت کریں گی عملاً مسلمانوں کو گھروں میں قید کردیا اور خود اجودھیا سے ۵۰ کلومیٹر دور رام سنیہی گھاٹ پر علامتی گرفتاری دی۔ پی۔سنگھ کی قیادت میں دی اور ملائم سنگھ اٹاوہ میں جا بیٹھے اور اس طرح بی۔جے۔پی، وشوہندو پریشد، بجرنگ دل، بال ٹھاکرے کی شیوسینا اور ان سب کی ماں آر۔ایس۔ایس کے سامنے میدان صاف تھا۔

رابطہ کمیٹی اور ایکشن کمیٹی کے لوگ میدان سے غائب ہوگئے۔ علمائے محترم اپنے اپنے مدرسوں میں گوشہ نشین رہے اور جب مسلمان ہی تمام دعوؤں کے باوجود مسجد کی حفاظت کے لیے نہ نکلے تو سیکولر ہندو کو کیا پڑی تھی کہ وہ آگے قدم بڑھاتا۔

اور پھر اس بزدلانہ حرکت پر جہاں پولیس بھی اپنی، سرکار بھی اپنی، انتظامیہ بھی اپنی اور گرانے والے بھی آپ خود ہی بال ٹھاکرے کا فخر کرنا تاریخ کے صفحات پر ہیجائی کا عالمی ریکارڈ ہوگا جس کے لیے گینز بک میں بھی نام آسکتا ہے۔

بی۔جے۔پی کے لوک سبھا کے ایک ممبر شری چندر دکشت جو اترپردیش کے انسپکٹر جنرل پولیس رہ چکے ہیں انھوں نے بابری مسجد کی شہادت کے بعد ۔۔۔۔ اترپردیش اور مرکزی فورسز کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا ۔۔۔۔ کارسیوکوں سے ان کا کیا گیا تعاون قطعی غیرقانونی نہیں۔ بھارت کی نئی تاریخ میں ان کا نام سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔

سیکولر سیاسی لیڈر مگرمچھ کے آنسو بہارہے ہیں اور انہی آنسوؤں میں مسلمانوں کو

بے وقوف بنا کر ان کے کاندھوں پر سوار ہو کر آنے والے الکشن میں ایوان حکومت میں پہونچ جائیں گے اور مسلمان بھی اس حادثہ عظیم کو بھول کر اپنی اپنی پارٹیوں کے خداؤں کو اپنے کاندھوں پر بٹھا کر نکل کھڑے ہوں گے۔ بابری مسجد پس پشت چلی جائے گی۔ اور الکشن کی گھما گھمی میں غیرت مرد مومن نیلام ہو جائے گی۔ لیکن اگر مسلمانوں میں غیرت ہوتی تو ان کی غیرت کی آگ ساری زمین کو کھا چکی ہوتی۔

اور لاشیں بولنے لگیں

دوسرے دن سے مسلمانوں نے پھر وہی بولنے کا پرانا طریقہ اپنانا شروع کر دیا کوئی وزیر اعظم کی تعریف کرنے لگا کسی نے وی۔ پی۔ سنگھ اور ملائم سنگھ کے موقف کی حمایت شروع کر دی اور کسی نے امن قائم رکھنے اور مندروں کے تحفظ کے نعرے بلند کرنا شروع کر دیئے۔

۶ / دسمبر کو ہندستان میں مغرب کے وقت تک بابری مسجد کی شہادت کی خبر عام ہوئی تو مسلمان اپنے گھروں سے نکل کھڑا ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ جان کا بدلہ جان، ناک کا بدلہ ناک اور عبادت گاہ کے بدلہ عبادت گاہ یہی پاکستان و بنگلہ دیش میں ہوا۔ مصلحت پسند علماء، اسلام دشمن اور انسانیت دوست مسلم نیتا کہاں تھے جو بتاتے کہ امن، صبر و مصلحت کا تقاضہ ہے شہادت ہلاکت ہے لہٰذا کوئی خودکشی کر کے حرام موت نہ مرے...... جب تک لاشوں کی اپیل زندوں تک پہونچی وہ آگ و خون کی نذر ہو چکے تھے۔

خون مٹ جانے کی شے ہے مگر اسکی سرخی
جب بھی مٹی میں ملی سارے جہاں تک پہونچی

اصل میں سی۔ آئی۔ اے اور اسرائیلی ایجنٹ اپنے ہندو ایجنٹوں کے ذریعہ بابری مسجد کو منہدم کروا کر عالم اسلام کے رد عمل کو دیکھنا چاہتے تھے کہ اگر اسرائیل میں مسجد اقصیٰ کو شہید کر دیا جائے تو مسلمانان عالم کتنا اور کس پیمانہ کا احتجاج کریں گے اور ان کی غیرت اسلامی کا پیمانہ کیا ہوگا۔ اس طرح انھوں نے بابری مسجد کی شہادت سے کیا نتیجہ نکالا

یہ آنے والا کل ہی بتائے گا۔

اجودھیا میں کیا ہوا؟

اجودھیا میں ۶/ دسمبر کے بعد بھی قتل و غارت گری کا سلسلہ جاری رہا۔ ایسے مظالم جن کو سناتے شرم معلوم ہوتی ہو۔ بے آبروئی زنا بالجبر اور وہم و گمان سے بالاتر داستان مظالم جس پر حیوانیت بھی شرم سار ہو عمل میں آئے عورتوں کے خلاف ہونے والی بدکاریوں کو چھوڑتے ہوئے ۷۵ سالہ طاہر صاحب جو محکمۂ جنگلات میں رینجر کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے تھے قصبہ اجودھیا جو ان کا آبائی وطن تھا مقیم تھے۔ ۷/ دسمبر کو آتش زنی اور لوٹ مار کے بعد ان کو قتل کر دیا گیا۔ مسول انٹر کالج کے لکچرار ماسٹر رشید جو ان کے رشتہ دار تھے ایک ہفتہ بعد ان کے گھر گئے تو مکان میں جلی ہوئی ہڈیاں ملیں۔ ۷/ دسمبر کو جو کچھ اجودھیا میں ہوا اسکو سنانے والے چند بد نصیب مسلمان ہیں جو کسی طرح زندہ رہ گئے ہیں۔ طاہر صاحب کے مکان پر حملہ سے پہلے گھر کے دس افراد جن میں عورتیں اور بچے تھے پچھلے دروازے سے نکل جا چکے تھے۔ ان کا مکان بابری مسجد سے تین کلومیٹر کے فاصلہ پر محلہ شیخ خانہ میں تھا جس کے ارد گرد ملاحوں یعنی ناؤ چلانے والوں اور یادووں کی آبادی ہے۔ چار سو بیگھہ زمین کے مالک تھے اور اب بڑے کاشتکار۔ ٹریکٹر جلا دیا۔ گھر سے نکل جانے کی کوشش میں تھے کہ حملہ آور آ گئے۔ مار کر، سامان لوٹ کر مکان میں آگ لگا دی۔ سارا سامان زیورات، برتن، بہوؤں کا جہیز سب کچھ کارسیوکوں کی مدد سے محلہ والوں نے لوٹ لیا۔

اجودھیا ہی کے جابر صاحب آرا مشین کے مالک تھے۔ ان کے والد نے چالیس سال تک بابری مسجد میں امامت کی تھی۔ انھیں آرا مشین پر رکھ کر کاٹ دیا اور پھر جسم کے دونوں حصوں کو جلا دیا۔

اجودھیا کی تمام مسجدیں، قبریں وغیرہ سب کھود دی گئیں۔ کارسیوک اور مقامی غنڈے اجودھیا سے اسلامی آثار ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مٹانے پر لگے ہوئے تھے۔

۶/ دسمبر تک بارہ لاشیں مل چکی تھیں۔ سو سے زیادہ مسلمان لاپتہ ہیں۔ جن کے بارہ

میں زندہ رہنے کا گمان ہی کیا جاسکتا ہے۔ ورنہ جام شہادت پی چکنے کے زیادہ آثار ہیں۔ جن لوگوں کو دفن کیا جاچکا ہے ان کے نام ہیں۔ سلمان، شوکت اللہ، محمد اظہار، صادق اور صابر عرف گڈو۔

جب کارسیوک مقامی ہندو غنڈوں کی مدد سے مسلمانوں کے گھروں میں آگ لگا رہے تھے تو اومابھارتی پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ مسلمان اپنے گھروں میں آگ لگا کر بھاگ رہے ہیں کارسیوک اس کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔

انگریزی اخبار کے نمائندہ دیواشیش مکھرجی نے اس بات کا ذکر کیا ہے۔

لکھنؤ گورکھپور روڈ جو اجودھیا سے گزرتی ہے اس پر موجود ایک مسجد منہدم کر کے اس میں بھی ہنومان کی مورتی رکھدی گئی تھی۔

مسجد کے پیچھے رام نگر کالونی میں چند مکان جل رہے تھے۔ ایک صحافی کے پوچھنے پر ایک ہندو نے کہا بارہ مکان مسلمانوں کے تھے سب آگ لگا کر بھاگ گئے اومابھارتی مقامی ہندوؤں کو جھوٹ بولنے کی ترغیب دے رہی تھی۔ اس سے تھوڑی دور پر محمد ہاشم کا مکان تھا جو پہلے ہی دن کارسیوکوں کے حملہ سے بچ کر نکل گئے تھے۔ سنہ ۱۹۴۹ء سے وہی بابری مسجد کا مقدمہ لڑتے رہے تھے باقی لوگ تو بعد کو میدان میں آئے مگر محمد ہاشم انصاری کی غریبی ایمانداری اور سادگی نے انھیں لیڈر کا مرتبہ عطا نہیں کیا لیڈر بن گئے کنٹریبونٹ کرنے والے لکھنؤ اور دہلی میں محلوں کی سیاست کرنے والے اور حکمرانوں کے دسترخوان پر چوہوں اور چیونٹیوں کی طرح رینگنے والے۔

لکھنؤ گورکھپور روڈ پر مسلمانوں کے شاندار مکانوں سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ مسجدیں مسمار پڑی تھیں۔

سڑک پر چلنے والی گاڑیوں سے پٹرول نکال کر مسلمانوں کے مکانوں کو مسلم ملکوں سے آنے والے پٹرول سے جلایا جا رہا تھا۔ مکانوں کے پنکھے توڑ دیئے گئے تھے یا اتار لیے گئے تھے۔ فرنیچر لوٹ لیا گیا تھا۔ پورے شہر کو آتش نمرود میں بدل کر دسمبر کے جاڑے کو جون کے گرم موسم میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ انتظامیہ خاموش تماشائی تھی یا لٹیروں کی

معاون ومددگار۔

[عبرتناک منظر...... ایک لمبی لاش سائیکل کے ٹھیلے پر بانسوں کے اوپر رکھ کر ظالم لیے جارہے تھے۔ جسم سے خون جاری تھا شاید ابھی دم نہیں نکلا تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے یہ حسن حیدر ہیں۔]

یہ وہی شخص ہے جو اجودھیا سے کچھ مسلمانوں کو کلیان سنگھ اترپردیش کے وزیراعلیٰ کے پاس لے گیا تھا اور ان سے کہا تھا کہ ہندو بابری مسجد لے لیں مسلمانوں کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اجودھیا میں بھارتی جنتا پارٹی کی مقامی یونٹ کے صدر بھی تھے اور آر۔ایس۔ایس، وشوہندو پریشد والوں سے قریبی تعلقات بھی تھے مگر کارسیوکوں نے ان کے گھر میں گھس کر ان کی یہ حالت بنادی۔ اسپتال لے جانے کے لیے امبولنس بھی نہیں تھی امبولنس گاڑیاں بابری مسجد کے ملبے میں زخمی ہونے والے کارسیوکوں کو اسپتال لے جانے پر مامور تھیں۔ اسی لیے رکشا گاڑی پر بانس رکھ کر لے جائے جارہے تھے اور واقعہ کے پندرہ دنوں بعد ان کی لاش لاوارث کے طور پر برآمد ہوئی۔

حاجی محبوب علی کا مکان رام جنم بھومی پولیس اسٹیشن [اس قضیہ کے بعد ہی نیا پولیس اسٹیشن بنا کر دیا گیا۔] کے سامنے ہی ہے۔ وہ بھی آتش زنی کا شکار ہوا۔ محبوب علی نے وہاں سے بھاگ کر پولیس اسٹیشن میں پناہ لی۔ محبوب علی صاحب نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ اجودھیا میں مسلمانوں کے چار سو مکانات تھے۔ جن میں پانچ ہزار مسلمان رہتے تھے۔ ایک مکان بھی بچا نہیں ہے۔ اجودھیا کے مسلم محلے قضیانہ، کٹرہ، اور ٹیڑھی بازار جل کر راکھ ہوچکے تھے۔ ۷/دسمبر کو بھی بچی ہوئی دوکانیں اور مکان جلائے جارہے تھے۔

نیوز ٹریک، ریڈیو میگزین کی ٹیم کی گاڑی توڑ دی گئی۔ ویڈیو کیمرہ بھی توڑا گیا۔ اجودھیا میں تیس مسجدوں میں باقاعدہ نماز ہوتی تھی جن میں چوبیس تو بالکل منہدم کردی گئیں باقی چھ کو بھی نقصان پہونچا۔

رام جنم بھومی کے تھانہ انچارج ٹی۔ بی۔ شکلا نے تھانہ میں ڈیڑھ سو مسلمانوں کو چھپا رکھا تھا اللہ تعالیٰ اس کی نیکی کو دیکھ رہا ہے اور اسکا بہتر اجر اسے ملے گا۔ کچھ مقامی

لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ اس کے لیے ایک لاکھ روپیہ وصول کیا گیا بہرحال اس کے بعد بھی سودا سستا ہے۔

غرض ۷/ دسمبر تک اجودھیا میں مسلمانوں کا کوئی مکان اور دوکان سلامت نہیں تھی۔

ہاشم انصاری کا مکان بھی ملبہ کا ڈھیر تھا۔ ایک ہندو پڑوسن نے جے شری رام کے نعرے لگا کر غریب کا مکان بچانے کی کوشش کی اور کہا یہ میرا مکان ہے مگر کچھ مقامی ہندؤں نے کارسیوکوں سے کہا نہیں یہ ہاشم کا مکان ہے یہ عورت جھوٹ بول رہی ہے۔ بس ہاشم کا مکان بھی ڈھیر ہو گیا۔

اجودھیا کہاں ہے؟

انڈین انسٹی ٹیوٹ بنگلور میں طبعیات فلکی کے ماہر ڈاکٹر راجیش کوچر نے اپنے ایک مقالہ میں کہا ہے کہ ویدوں میں جس سرجو ندی (جس کے کنارہ اجودھیا ہے) کا ذکر کیا گیا ہے کیا واقعی وہ ہندستان میں ہے؟ ان کا کہنا ہے وہ سرجو ندی جس کے کنارے اجودھیا واقع ہے افغانستان میں ہو سکتی ہے۔ انھوں نے کہا اگر سرجو ندی افغانستان میں ہو سکتی ہے تو رام سے متعلق جس اجودھیا کا ذکر چل رہا ہے وہ اترپردیش میں نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر کوچر اکتوبر کے دوسرے ہفتہ میں دہلی میں کوسمبی یادگاری لکچر دینے آئے تھے۔ وہ اس سلسلہ میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ مشرق کا علاقہ [دہلی کے] اتنا قدیم نہیں ہے جسکو رگ وید سے وابستہ کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں ویدک اویستان ہورا یویا جدید ہری رود ہونا چاہئے۔ جس کے کنارے ہرات آباد ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مہابھارت کا محل وقوع ہندستان کی سرحدوں کے باہر ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں بعض ہندستانی شہروں اور دریاؤں کے ناموں کی حیثیت ایسی ہی ہے کہ آریوں نے جب ترک وطن کر کے ان علاقوں میں بود و باش اختیار کی تو اپنے پرانے شہروں اور ندیوں کے نام ان کی یاد

تازہ کرنے کے لیے رکھ لیے۔

وہ کہتے ہیں کہ پارسیوں کی اویستا اور ویدوں اور پرانوں میں ایک تعلق پایا جاتا ہے اسلئے کہ اویستا اور رگ وید کے لوگوں کی فرہنگ اور دیومالا اور رسم ورواج ایک جیسے ملتے ہیں۔ قدیم ہندستان کی کتابوں کے مطالعہ کے لیے اویستا کا مطالعہ ضروری ہے۔

مہابھارت سے متعلق ویدوں اور پرانوں سے شہادت پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر کوچر کہتے ہیں کہ کسی شہادت کے قابل تسلیم ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی دوسرے ذرائع سے بھی تائید ہو۔ لہٰذا پرانوں کے زمانہ کی تاریخ کیلئے آثار قدیمہ کی شہادت ضروری ہو جاتی ہے۔ آزادی کے بعد ایسی بہت سی جگہوں کی کھدائی کی گئی جن کا رزمیہ نظموں میں ذکر آیا ہے۔ ڈاکٹر کوچر کہتے ہیں کہ آثار قدیمہ سے حاصل ہونے والی معلومات کا جب ہم مقابلہ پرانوں کے زمانہ کی تاریخ سے کرتے ہیں تو ہم پریشانی میں پڑ جاتے ہیں۔ کیونکہ جمنا کے مشرق میں آثار قدیمہ کی کوئی جگہ پرانوں جیسی قدیم نہیں۔ [اجودھیا بھی جمنا کے مشرق میں ہے] ان میں سے کوئی جگہ بھی ایک ہزار قبل مسیح سے زیادہ پرانی نہیں ہے۔ اس دشواری کو دور کرنے کی کوئی راہ نکالنا ہوگی۔ آثار قدیمہ کی شہادت سے انکار غیر سائنسی ہوگا۔ پرانوں میں جو تاریخ بیان کی گئی ہے اگر وہ بکواس نہیں ہے تو اس کے جغرافیہ کو سمجھنا ہوگا،

اصل وطن:- ڈاکٹر کوچر کا بیان ہے کہ ویدوں اور پرانوں میں جو کچھ دیا گیا ہے اس سے آریوں کے وطن کے بارہ میں کوئی صاف بات سامنے نہیں آتی ہے۔ تاہم اس موضوع پر پارسیوں کی مقدس کتاب اویستا قیمتی معلومات فراہم کرتی ہے۔ اویستا میں جن پانچ جگہوں کا ذکر ملتا ہے سنسکرت اور ویدوں میں ان کے مرادف موجود ہیں دوسری چار جگہوں کو فارسی اور یونانی ذرائع سے تلاش کیا جاسکتا ہے انھیں محض دیومالا کہہ کر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اویستا کے زمانہ کے لوگوں کا تعلق وسط ایشیا سے تھا۔ ڈاکٹر کوچر کہتے ہیں کہ اویستا اور ویدوں کے زمانہ کے لوگ مشترکہ ورثہ

کے حامل تھے اسلئے ویدک لوگوں کو بھی وسط ایشیا سے ہی وابستہ کرنا ہوگا۔ دوسری اہم بات وہ ویدوں کے زمانہ کے لوگوں کے غیر ہندستانی ہونے کے بارہ میں جوتش کو بنیاد بناتے ہیں۔ ویدوں کا جوتش میں جو بیان ملتا ہے کہ سب سے طویل اور سب سے مختصر دن کا تناسب ۳ اور ۲ کا ہے۔ اس بیان کو دوسری قدیم کتابوں میں بھی کئی جگہ دہرایا گیا ہے اس سے کسی بھی جگہ کے محل وقوع کا جاننا آسان ہو جاتا ہے۔

وہ کہتے ہیں رگ وید میں بہت سی ندیوں کا ذکر ہے۔ جن کی شناخت ہونا باقی ہے اسکی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ رگ وید کی ندیوں کے بعض ناموں کو کیوں ترک کر دیا گیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ ان ندیوں کو پیچھے چھوڑ آئے اور دوسری جگہوں پر منتقل ہو کر کچھ ناموں کا دوبارہ استعمال شروع کر دیا اور باقی بھلا دیئے گئے۔

ڈاکٹر کوچر کا خیال ہے کہ ویدک اور اویستا والوں کے مورث اعلیٰ ایک ہی تھے وہ ساتھ رہتے تھے پھر ویدک آریہ افغانستان آئے وہاں سے سنہ ۱۵۰۰ قبل مسیح میں ستلج ندی تک پہونچے۔ اور سنہ ۱۰۰۰ قبل مسیح میں سندھ اور جمنا کے درمیانی علاقہ میں آباد ہوئے اس کے بعد نقل مکانی کر کے مزید مشرق کی جانب بڑھے۔ [۲۲ / اکتوبر سنہ ۱۹۹۲ء قومی آواز لکھنؤ]

پانچ اجودھیا:- جمشید پور میں ۱۴ / جنوری سنہ ۱۹۹۳ء کو دھرم نرپیکچھ سدبھاؤنا سمیتی کے زیر اہتمام ایک سیمنار میں سی۔ پی۔ آئی۔ ایل۔ ایم کے شری ویاس تیواری نے کہا کہ اجودھیا تو پانچ ہیں ایک اجودھیا سنگھ بھوم ضلع میں۔ دوسرا بہار کے مونگیر ضلع میں۔ تیسرا راجستھان کے گنگا نگر ضلع میں۔ چوتھا افغانستان میں اور پانچواں فیض آباد میں جہاں کی بابری مسجد کو شہید کروا دیا گیا۔ [آزاد ہند کلکتہ ۱۸ / جنوری سنہ ۱۹۹۳ء]

بابری مسجد اور ویڈیو کیسٹ

[آزاد ھند کلکتہ ۲۹/دسمبر سنہ ۱۹۹۲ء]

نیوز ٹریک میگزین نے ۶/دسمبر سے پہلے ہی اپنے کیمرے اجودھیا میں لگا دیئے تھے۔ جن کے بعض مناظر اور آوازیں منصوبہ بندی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

۶/دسمبر کو بیلچوں، رسیوں، لوہے کی چھڑوں، ہتوڑوں اور ڈائنامائٹ سے لیس کارسیوکوں نے ۱۲:۳۰ منٹ پر بابری مسجد پر حملہ کیا۔

بابری مسجد کی شہادت کے تین کردار بہت اہم ہیں۔ کارسیوک، کلیان سنگھ اترپردیش کے وزیراعلیٰ اور عظیم ہندستان کے عظیم وزیراعظم پی - وی - نرسمہا راؤ جنھوں نے سب پر بھروسہ کیا اور سب سے دھوکا کھایا۔ ہم پچھلے صفحات میں بھی نرسمہا راؤ کا ذکر کر چکے ہیں جب وہ آندھرا کے وزیراعلیٰ تھے۔ ہر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔

اوما بھارتی کی آواز ــــ کیا تمام ضابطوں کی پابندی کریں گے۔ [ضابطے طے ہو چکے تھے]

مجمع ــــ ہاں کریں گے۔

اوما بھارتی ــــ امن بنائے رکھیں گے۔

مجمع ــــ ہاں بنائے رکھیں گے۔

اسی بیچ ایک سادھو کی آواز گونجی ــــ "مندر تو بنتا رہے گا یہ جو کلنک کا ڈھانچہ ہے سب سے پہلے ختم ہونا چاہئے۔"

مجمع سے تالیاں اور جے شری رام کے نعرے۔

اشوک سنگھل کی تقریر ــــ بابر نے ایک مندر کو ختم کر کے یہاں پر ڈھانچہ کھڑا کیا

تھا ویسے ہی ہمارے وزیراعظم اگر سوچتے ہیں کہ دوسرا بابر بن کر یہاں مسجد پھر بنائیں گے تو وہ سمجھ لیں کہ دوسرا بابر بھارت میں برداشت نہیں کیا جائے گا۔

مجمع سے شور اور تالیاں۔

بجرنگ دل ایریا کمانڈر ریتش پرتاپ کی رہنمائی میں کارسیوکوں نے مسجد کے انہدام کی ریہرسل کی۔

انہدام سے چوبیس گھنٹے پہلے مارگ درشک منڈل سے اشوک سنگھل کی آواز کسی سوال کے جواب میں کیا وہ سپریم کورٹ کے حکم کی تعمیل کو تیار ہیں۔

اشوک سنگھل ۔۔۔ کون کہتا ہے۔ بکواس۔ دیکھئے ہمارا کورٹ سے کوئی مطلب نہیں کورٹ کی بات کیوں بیچ میں لا رہے ہیں آپ لوگ۔ ہم نے کہا ہے کہ کورٹ کا جو فیصلہ آنے والا ہے، ہم اس سے متاثر نہیں ہوں گے۔

سادھو کی آواز ۔۔۔ کوئی طاقت ہم کو نہیں روک سکے گی ڈھانچہ پر حملہ کرنے سے۔

پولیس اور آر۔ ایس۔ یس کے گھیرے کو جو ایکوائر زمین کے گرد تھا گیارہ بجے منظم کارسیکوں نے توڑا۔

اس کے بعد اشوک سنگھل، مرلی منوہر جوشی اور ایل۔کے۔اڈوانی نے معائینہ کیا۔

پندرہ منٹ تک کارسیوکوں کو روکنے کا ڈرامہ چلا۔

ایک سادھو کی آواز گونجی ۔۔۔ کارسیوا نہیں رکے گی چاہے نیتا روکیں یا سنت مہاتما۔ آج اس ڈھانچہ کو گرانا ہے۔

سوال ۔۔۔ کیا آج بالکل گرا لیں گے۔

آواز ۔۔۔ گرانے ہی کے مقصد سے تو ہم یہاں آئے ہیں۔

سوال ۔۔۔ اگر نہیں گرا تو؟

جواب ۔۔۔ نہیں گرا تو .... گرنا چاہئے۔ نہیں گرا تو اب ہمارے اوپر نہیں ہے ...... باقی ہم پبلک .... اس سے پہلے کہ وہ آگے کچھ کہے آواز نے اسے روک دیا۔

ضلع مجسٹریٹ اور ایس۔ایس۔پی بڑے سکون سے گھوم رہے تھے۔
اور سب ٹھیک ہے کی اطلاع دے رہے تھے۔

اسی بیچ کارسیوکوں کا خود کشی دستہ سروں پر پیلے کپڑے باندھے میدان میں کود پڑا۔ اور کارسیوکوں کو گھیرے والے علاقہ سے دور کرنے لگا۔ اسی بیچ مسجد پر تعینات پولیس نے بھی قطار باندھی اور وہاں سے چلتے بنے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈیوٹی پر تعینات پولیس دستہ کو یہ احکامات تھے کہ جب پیلے سروں والے نمودار ہوں تو تم چلتے بننا۔ اس وقت بھی ضلع مجسٹریٹ اور ایس۔ایس۔پی پرسکون تھے۔ بلکہ چائے پی رہے تھے۔ اسی وقت مسجد کی رکاوٹوں پر پہلا حملہ ہوا۔

اور اشوک سنگھل نے بھی اسی وقت فاضل کارسیوکوں کو پیچھے ہٹانا شروع کیا۔ بچے کچھے سپاہیوں پر پتھراؤ کیا گیا جس سے وہ بھی چلتے بنے۔

کارسیوکوں کو روکنے کے لیے نہ ہوا میں لاٹھیاں ہلائی گئیں، نہ آنسو گیس نہ ربر کی گولیاں نہ ہیلی کاپٹر سے جال نہ ہنسانے والی گیس جسکا بار بار اعلان مرکز کی طرف سے کیا گیا تھا گرانے والے اور حفاظت کے نام پر گروانے والی فورس دو سورما اور ایک بے ہاتھ پیر کی مسجد پانچ گھنٹہ جم کر خوب مقابلہ کیا۔۔۔ تاریخ نے بابری مسجد کی عظمت کو دنیا کے ہر گھر میں پہونچا دیا اور کمیونل اور سیکولر ہندوؤں کی بزدلی وعدہ خلافی اور منافقت کو پوری دنیا کے ہر گھر میں آشکارہ کر دیا۔

سادھو سنکھ بجا رہے تھے۔ تربیت یافتہ کمانڈو دستہ رکاوٹوں پر چڑھ رہا تھا۔ مسجد کا صدر دروازہ کھلا پڑا تھا بابر کی روح آخری نماز ادا کر کے ناکارہ مسلم قیادت کے منھ پر تھوک کر کہہ رہی تھی ہم بزدل قوم کی طرح ساڑھے چار سو برس تیری دوبارہ تعمیر میں تاخیر نہ کریں گے میرا کوئی اولوالعزم فرزند آئے گا اور تیری عظمت کو پھر کئی سو برسوں تک کے لیے بحال کر جائے گا۔

جب بابری مسجد پر کدالیں اور بیلچے چل رہے تھے تو کیمرہ نے یہ منظر قید کیا۔ ایس۔ایس۔پی، ڈی۔پی۔رائے پولیس والوں سے کہہ رہے ہیں بھئی کچھ تو کرو۔ ہوا

میں فائر ہی کرو۔ مگر کسی نے کچھ نہیں سنا مستی کا یہ عالم تھا۔ یہ بغاوت ہے یا ڈرامہ تھا۔ یا کہی سنی۔ مسجد میں رکاوٹیں اس طرح کی لگائی گئی تھیں کہ انھیں کو لیکر مسجد کے انہدام میں استعمال کر لیا جائے اور یہ بھی ہوا۔

اسی بیچ صحافیوں پر حملہ شروع ہو گیا۔ وائس آف امریکا کے پیٹر ہائن لائنس کو بھی بری طرح مارا اور اسباب لوٹ لیا۔ پرس بھی چھین لیا۔

تینوں گنبدوں کو گرانے کے لیے ڈائینامائٹ کا استعمال کیا گیا۔ ایسا لوگ کہہ رہے ہیں؟!!

دوسرے دن عورتوں اور بچوں کے ذریعہ اسی ملبہ پر مندر بنا کر ہٹائی گئی مورتیاں پھر وہیں براجمان کر دی گئیں اور یکم جنوری سنہ ۱۹۹۳ کو ہائی کورٹ سے مورتیوں کو پوجا اور نئے بنے مندر اور مورتی کو اوس اور کہرے سے بچانے کے احکامات کے ساتھ انتظامیہ اور اترپردیش سرکار کو ہر طرح کی کاروائی کی اجازت مل گئی یعنی باقاعدہ تعمیر مندر کا حکم نامہ پھر ہاتھ آ گیا اور مسلمانوں کا داخلہ علاقہ میں ممنوع تھا ممنوع ہے۔۔۔ مستقبل کی نشاندھی روح بابر کر گئی ہے۔ اور اب سپریم کورٹ نے بھی مندر کے تحفظ کا حکم دے دیا۔

پھر وہی گلی وہی داؤں

سنہ ۱۹۴۹ء ہی کی طرح پھر پوجا کی اجازت دے دی گئی۔ حکومت اتر پردیش کا کہنا ہے کہ اس پر کوئی پابندی تھی ہی نہیں بعض انتظامی معاملات کی بنا پر رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ فیض آباد ضلع انتظامیہ نے اسے دور کر دیا ہے اور یہ اجازت سنہ ۱۹۸۶ء کے عدالتی فیصلہ کے مطابق ہے جبکہ تالا کھولنے کا حکم جاری ہوا تھا۔ مگر اب جبکہ نہ وہ عمارت ہے نہ در و دیوار نہ گیٹ و تالا تو وہ اجازت خود بخود ختم ہو گئی مگر جہاں انصاف کا چلن ہی نہ ہو وہاں کس کو کون اپنی داستان درد و غم سنائے۔

وزیر مفتی بنے:- اور جب مرکزی وزیر داخلہ ایس۔ بی۔ چوان قرآن کے حوالہ سے مفتی کے فرائض انجام دینے لگے۔ جب ایک اخبار نویس نے پوچھا کہ جس طرح پوجا کی اجازت دی گئی نماز پڑھنے کی بھی اجازت دی جائے گی؟

مسٹر چوان نے کہا کہ اگر امن عامہ کو خطرہ میں ڈالے بغیر وہاں نماز اور پوجا ایک ساتھ ہو سکتے ہیں تو ہم کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ آگے انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن میں لکھا ہے کہ اس جگہ نماز نہیں ہو سکتی جہاں مورتیاں رکھی ہوں۔ (۲۸/ دسمبر دہلی) آپکا آئین سیکولر مگر مسلمانوں کا کتنا احترام اور ان کی کتاب کے احکامات پر عمل آوری کا اتنا شدید احساس ہندستان کے وزیر داخلہ کو ہے کہ شاید ہی یہ احساس کسی مسلم ملک میں پایا جاتا ہو۔ جہاں اپنا مطلب ہو وہاں اپنی مرضی سے قرآن کا فیصلہ ہم پر نافذ کرنے کا کیسا بھونڈا عمل ہے دنیا دیکھ لے؟!

مارکسی کمیونسٹ پارٹی نے اجودھیا میں رام للا کے درشنوں سے لیکر ہر طرح کی مذہبی سرگرمی پر مرکز سے پابندی کا مطالبہ کیا ہے۔

۲۹/دسمبر سنہ ۱۹۹۲ء کو تریوندرم میں انسانی ترقی وسائل کے وزیر ارجن سنگھ نے کہا کہ اجودھیا میں درشن کی اجازت کا فیصلہ وہاں کشیدگی کم کرنے کی غرض سے کیا گیا۔

اسی دن بنگلور میں وزیراعظم سے جب اس اجازت کے بارہ میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ مرکزی داخلہ سکریٹری اس وقت اجودھیا میں ہیں ان کی رپورٹ ملنے پر بیان دیا جائے گا۔ وزیراعظم کچھ کہیں وزیرداخلہ کچھ اپوزیشن پارٹیاں جو سیکولر ہیں کچھ کہیں اور بی۔جے۔پی اور آر۔ایس۔ایس کچھ مگر اس ہندو ذہن کے خارجی اختلاف میں اتحاد اس نکتہ پر ہے کہ مسلمانوں کو بے توقیر بنا کر اپنا غلام بنا کر رکھا جائے یہ الگ متحد نہ ہوں بس ہماری چاکری کریں۔ وہ وی۔پی۔سنگھ کی ہو یا ملائم سنگھ کی یا نرسمہا راؤ کی اور اگر ایسا نہیں تو یہ سب یک آواز کہیں گے کہ پھر ہم ہندو اکثریت کے عتاب سے تم کو بچا نہیں سکیں گے۔ اصل میں سیکولر پارٹیوں اور کانگریس نے ہندو فرقہ پرست تنظیموں کو چھوٹ اسلئے دی تھی کہ ان کے خوف سے ملک کا بائیس فی صد مسلم ووٹ انکو ملتا رہے گا اور کچھ ہندو برادریوں کا ووٹ۔ لیکن اب صورت حال بدل چکی ہے اور یہ تنظیمیں اتنی طاقت ور ہو چکی ہیں کہ خود ان کی بنیاد ڈانواں ڈول ہے اسلئے یہ فرقہ پرست تنظیموں کے خلاف کھڑے ہو گئے کسی نظریاتی اختلاف کی بنیاد پر نہیں صرف اقتدار کے حصول کی بنیاد پر۔

اڈوانی، مرلی منوہر جوشی، اشوک سنگھل اور دوسرے ہندو لیڈروں کی نظربندی ان کے تحفظ کے لیے کی گئی تھی تاکہ بابری مسجد کے انہدام کی پاداش میں ــــ بالکل ویسے ہی جیسے گاندھی جی کے قتل کے بعد آر۔ایس۔ایس کے لیڈروں کو اسلئے گرفتار کرلیا گیا تھا کہ کہیں ان کے خلاف عوامی غصہ نہ بھڑک اٹھے۔ مگر جب یہ خطرہ ٹل گیا تو ان کو چھوڑ دیا گیا اور "راشٹر پتا" یعنی بابائے قوم کے قاتل کی جماعت پر سے پابندی بھی اٹھا لی گئی اسلئے کہ گاندھی جی بنیا برادری کے آدمی تھے اور برہمن ذہن بنیا قیادت کو کب تک برداشت کرتا۔ آر۔ایس۔ایس پر مہاراشٹر کے برہمنوں کا غلبہ ہے۔ پنڈت نہرو بھی برہمن تھے۔

سنہ ۱۹۷۷ء کے بعد کے واقعات میں سنہ ۱۹۸۰ء میں افغانستان میں روسی یلغار کے بعد اندرا گاندھی آر-ایس-ایس کے ارادوں کی تکمیل کر سکتی تھی روس سے اپنے تعلقات کی بنیاد پر سوویت یونین اور ہندستان ملکر اندرا گاندھی کی قیادت میں پاکستان توڑ کر مزید تین حصے کر سکتے تھے اسی بنیاد پر اندرا گاندھی کو آر-ایس-ایس نے ہری جھنڈی دکھادی دوسری طرف روس کے ہمنوا علماء ملک وملت بچاؤ کی بنیاد پر مسلمانوں کو بھی اندرا گاندھی کا طرف دار بنانے میں کامیاب ہوگئے مگر..... ضیاء الحق، افغان مجاہدین اور اسلامی بلاک کی امداد اور کمیونزم مخالفت میں امریکا کی مجاہدین کو مدد نے سوویت یونین کے ہی نظام کو میٹ دیا..... آگے کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ آر-ایس-ایس کا کیا رول ہوگا۔ ہوسکتا ہے ایک بار پھر دہی کارڈ کھیلا جائے اور نرسمہا راؤ کو موقع دیا جائے اور ہندستان کو ان کے ہاتھوں مسلمانوں کا قبرستان بنایا جائے پھر لوح مزار پر یہ لکھ دیا جائے.....

ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے
آہ! اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

سلطانی محلوں کے راز

دہلی میں بابری مسجد ریلی کی جگہ اور کہاں سے اسکا آغاز ہو اس مسئلہ پر سید عبداللہ بخاری امام جامع مسجد دہلی اور سید شہاب الدین کے درمیان زبردست ٹکراؤ ہوا پھر بوٹ کلب پر ملت کے دونوں سیدزادے لڑ پڑے ہاتھا پائی تک کی نوبت آ گئی۔ اس چھینا جھپٹی کو اپنے اور پرائے سب نے دیکھا۔

اسی کے بعد یوم جمہوریہ کے بائی کاٹ کا نعرہ شہاب الدین نے دیا مگر اس کے رد عمل اور دباؤ کو وہ برداشت نہ کرسکے اور رابطہ کمیٹی نے اپنے پرانے تعلقات کی بنیاد پر جناب چندر شیکھر، چندر جیت یادو اور ھیم دتی نندن بہوگنا سے درخواست کی کہ آپ حضرات اس کال کی واپسی کا مطالبہ کردیں تو یہ کال واپس لے لینے کا بہانا ہاتھ آجائے گا۔ اسی بیچ صدر جمہوریہ سے بھی ایسی اپیل کرنے کو تیار کرلیا گیا اور اس طرح عام مسلمانوں کو معتوب کر کے دھوبی بیٹا چاند سا بن بیٹھا اور یہ کال واپس لینے کا شہاب الدین کی طرف سے اعلان ہو گیا۔

درمیانی گنبد میں بتوں کی پوجا اور اِدھر اُدھر کے دونوں گنبدوں میں ذکر خدا

احمد بخاری اور جاوید حبیب یہ تجویز منت اللہ رحمانی مرحوم کے پاس لیکر گئے کہ اگر درمیانی گنبد ہندوؤں کے سپرد کردیا جائے تو چندر شیکھر وزیراعظم ہند باقی مسجد مسلمانوں کے سپرد کردینے پر ہندوؤں کو راضی کرلیں گے۔ خیال رہے کہ بابری مسجد میں بُت بیچ کے گنبد میں منبر کے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ منت اللہ رحمانی صاحب نے اس کی منظوری نہیں دی۔

عدنان خشوگی ہندستان میں:- چندرا سوامی اور چندر شیکھر کی مشترکہ کوششوں سے عدنان خشوگی کو ہندستان بلایا گیا تاکہ بابری مسجد کی منتقلی کا فتویٰ سعودی عرب سے حاصل کیا جائے۔ڈاکٹر جے۔کے۔جین کے یہاں کھانے کی دعوت پر نائب امام سوامی اور خشوگی کے ساتھ موجود تھے اور کھانے کی میز پر سبھی کے دست طمع دراز تھے۔مگر مسلم مجلس اور ملت کے دیگر بہی خواہوں کو پتہ چلا تو انھوں نے سعودی سفیر کو اس سازش سے آگاہ کر کے اسے ناکام بنا دیا۔اور عدنان خشوگی کو بعد از خرابئ بسیار وطن واپس جانا پڑا۔

کلیان سنگھ کی حکومت کے زمانہ میں امریکی سفیر لکھنؤ تشریف لائے۔سفیر موصوف کے اعزاز میں کلیان سنگھ نے کھانے کا اہتمام کیا اس دعوت میں ایکشن کمیٹی کے ایک وکیل صاحب جو اس کے کنوینر بھی تھے بابری مسجد سے ہاتھ دھو کر بیٹھے دیکھے گئے۔

نرسمہا راؤ کی حکومت میں ایکشن کمیٹی اور وشو ہندو پریشد کے درمیان مذاکرات میں ایکشن کمیٹی نے ایک نکاتی ریفرنس کو قبول کر لیا جس کے بعد بابری مسجد کی ملکیت کے سارے مقدمے ختم کر دیئے گئے۔رابطہ کمیٹی نے ایک قدم آگے بڑھ کر اسے تحریری طور پر تسلیم کر لیا۔اسلئے کہ ایکشن کمیٹی اور رابطہ کمیٹی میں سرکار سے چاپلوسی کر کے قریب رہنے کی رقابت چل رہی تھی۔

آخری کلام

سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح
دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے لباس میں

اگر ہم راہ حق سے ہٹ کر اور کفروشرک والحاد کو ناراض کئے بغیر وقار اور سربلندی کی تلاش میں اپنی زندگی کے تاریک پہلو کو چھپا کر دنیا میں عظمت حاصل کرنے کے خواہاں ہیں، اور اپنی پیشانی کے کلنک کو ہندستان کے ماتھے کا کلنک بتا رہے ہیں تو دنیا کی آنکھ ہمیں ہم سے پہلے دیکھ لینے کی مالک بن چکی ہے۔

بابری مسجد جب شہید کی جارہی تھی تو دنیا اپنے گھروں سے یہ گھناؤنا منظر دیکھ رہی تھی کہ پچیس کروڑ مسلمانوں کے ہوتے ہوئے، مساجد، مدرسوں اور علمائے کرام کے جھرمٹوں میں بار بار قرآن کا یہ درس سننے اور سنانے والے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں انہیں مردہ نہ کہو یہ زندہ ہیں لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں...... موت کے خوف سے مصلحت کی چادروں میں لپٹے شعائر اسلامی کی تباہی کے دردناک منظر کو دیکھ رہے تھے...... ہر سال لکھنؤ کے احاطہ شوکت علی میں شہداء اسلام پر گلا پھاڑ پھاڑ کر شہادت کی عظمت بتانے والے آج جب اپنے نکلنے کا وقت آیا تو شہادت کو ہلاکت بتا رہے تھے...... لیکن ۶/ دسمبر کی شام تک یہ خبر بی۔ بی۔ سی کے ذریعہ عام ہوتے ہی غریب مسلمان گھروں سے شہادت کی طلب میں نکل پڑے اور سرکاری اعدادوشمار کے مطابق ایک ہزار سے زیادہ شہدائے اسلام نے اپنے خون سے سرزمین ہند کو لالہ زار بنا دیا مگر مسلمانوں کے خودساختہ لیڈر اسی دستور ہند کی دُہائی دیتے رہے جس کے زیر سایہ بابری مسجد کی شہادت اور اس شہادت پر واویلا کرنے والوں کو آگ و خون کے سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ پنجاب اور آسام میں سرکاری ناانصافی کے خلاف جدوجہد کو دہشت گردی کا نام دیکر اور اسے

پاکستان کے سر باندھ کر دنیا میں پاکستانی دہشت گردی کے عوض اسے دہشت گرد ملک قرار دیئے جانے کی مانگ کرنے والا ہندستان اپنی ہی انتظامیہ کے زیر سایہ ہندستان کی عدالت عالیہ کی تمام یقین دہانیوں کے باوجود کھلے عام اترپردیش کی پولیس اور مرکزی فورس کی موجودگی میں بابری مسجد کے خلاف ہونے والی دہشت گردی کو روک نہ سکا۔

اسپین کا آخری حاکم ابوعبداللہ جب اسپین سے بھاگ کر ایک پہاڑی سے قرطبہ میں اٹھتے ہوئے آگ کے شعلوں کو دیکھ کر رونے لگا تو اسکی بوڑھی دادی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا بیٹا وقت پر نہ چونکنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے اب رونے سے کچھ حاصل نہ ہوگا چلو تمہارا کام ختم ہو گیا۔ اس کے الفاظ تاریخ نے یوں محفوظ کر دیئے۔۔۔ "اب عورتوں کی طرح آنسو بہانے سے کیا ہوگا جب وقت پر مردوں کی طرح حفاظت نہ کر سکے۔" وقت کی پکار پر نہ چونکنے والے، اپنی جدوجہد کیلئے دوسروں کے محتاج کوڑھیوں کو یوں ہی ذلیل ہونا پڑتا ہے جس طرح کفروشرک و الحاد کو بابری مسجد سونپ کر اکابرین ملت اپنے راحت کدوں میں چلے گئے۔

دستوری ضمانتوں کو ارباب اقتدار و اختلاف کے قدموں تلے روندا جا چکا ہے۔ عدلیہ کمزوروں کا سہارا ہوا کرتی ہے اگر حکومت کے مضبوط ہاتھ ہی قانون کو توڑنے لگیں تو کمزوروں کو انصاف کہاں ملے گا/ بابری مسجد کے انہدام کے بعد مسلمانوں کو کوئی حق نہیں رہ گیا ہے کہ وہ دستوری مراعات کی دہائی دیں اور دستوری حقوق کا استعمال کریں اور عدالتوں کی قانونی موشگافیوں میں الجھیں وشوہندوپریشد بابری مسجد کو گرانے کا اعلان کرتا رہا۔ بابری مسجد کی لڑائی لڑنے والے، سیکولر ٹائپ آف ہندو لیڈروں کو بابری مسجد کی کمان دیکر منظر سے غائب ہو گئے علمائے محترم دستو ہند کے دائرہ میں رہتے ہوئے حقوق طلبی کا مشورہ دیتے ہوئے ہر وزیر کے لیے دعائے خیر کرتے رہے وہ سیکولر ہو یا کمیونل اور بابری مسجد کے انہدام کے بعد بھی ملک سے وفاداری اور یوم دغا کے بعد یوم دعا کی اپیلیں کرتے رہے اور ملک سے وفاداری کے ساتھ ہی نئے مطالبات کی بھیک مانگتے رہے۔۔۔

حق نے چھانتا تھا تمھیں دنیا کی شاہی کیلئے
تم نے پیہم کروٹیں بدلیں تباہی کیلئے

مسلم علماء کو اس واقعہ سے دکھ ہوا۔ اٹل بہاری باجپئی اور بالاصاحب دیورس کو بھی دکھ ہوا۔ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز!

میں بابری مسجد کی شہادت کے بعد کسی بھی طرح کے مطالبات، حقوق طلبی اور گفتگو کو بے حیائی، بے غیرتی اور کمینگی کے سوا کچھ نہیں سمجھتا۔ اب مسلمانوں کو خاموش رہ کر دیکھنے اور انتظار کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر طرح کی سیاسی سرگرمیاں روک کر ووٹ کی سیاست[1] سے الگ ہو کر میدان سیاست میں صرف ہندو کو چھوڑ دینے کی ضرورت ہے۔ سیاست میں ہماری موجودگی سے ہی ہندو فرقہ پرستی مسلمانوں کے خلاف یہ سمجھ کر نعرے بلند کرتی ہے کہ مسلمان ہندو راشٹر کی تکمیل کی راہ میں روک بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔

اگر مسلمان اپنے کو ووٹ کی سیاست سے الگ کرلیں تو اب میدان میں ہندو ہی رہ جائیں گے اور مسلمانوں سے ٹکراؤ ختم ہو جائے گا۔

چالاک ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کو ووٹ میں شریک کر کے حکومت سازی میں تو شریک کر لیا مگر حکومت چلانے میں شریک نہیں کیا!

اس طرح مسلمان سیاسی انتشار کا شکار ہو گیا۔ چار ہندو پارٹیوں کے لیڈر الکشن لڑ رہے ہیں۔ حلقہ کے چار مسلمان ان لیڈروں کی جیپ پر بیٹھے ہیں اور آپس میں غیروں کو کامیاب بنانے کے لیے دست و گریباں ہیں اور وہ چاروں کسی ہوٹل میں ایک ہی میز پر بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد ہونے والے ہنگاموں میں کئی جگہوں پر ووٹر لسٹ سے مکانوں کی شناخت کر کے مسلمانوں کے گھروں کو جلایا گیا اور انھیں قتل کیا گیا۔

جس طرح آگ کے الگ الگ انگارے شعلہ نہیں بنا سکتے اسی طرح ووٹ کی سیاست میں مسلمان الگ الگ ہو کر شعلہ نہیں بن سکتے چند لمحوں میں ان انگاروں کی طرح راکھ کا ڈھیر بن جائیں گے۔

[1] یہ مشورہ عارضی تھا

قبلہ کا نام بلند کرنے کے لیے قبلہ نما کی بے چینی تو ہو مگر مقناطیسی سوئی کی یکسوئی نہ ہو تو خالی بے چینی سے قبلہ رخ نہیں ہوا جاسکتا۔

امت کے ہر فرد کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ دین و سیاست و طاقت ایک ہی تصویر کے مختلف رخ ہیں جسکا سرچشمہ اتحاد ہے۔ اصلاح نفس ہے۔ اگر ہم عمل سے قوم کی طاقت کو ہزار گنا نہیں بنا سکتے تو قوم ہمارے گرد جمع نہیں ہو سکتی۔

چھوٹے چھوٹے گروہوں کی سرداری جو چھپکلی کے بچہ کو بھی بھگا نہ سکے بے نتیجہ ہوگی اصل چیز ہے طاقت۔ طاقت سے سرداری، سرداری سے قوم کی آزادی— مگر جو بڑی موجود ہی نہ ہو اس کے لیے باہمی جنگ کا نتیجہ ہر طرف دھتکار کے سوا کچھ نکلنے والا نہیں۔

ہندستان میں مسلمانوں کی بہبودی چاہنے والوں کی اولین ذمہ داری ہے کہ ہندو سیاست کی بھول بھلیوں سے قوم کو نکال کر کھلے میدان میں لے آئیں۔ اسلئے کہ سیاست کی موجودہ روش جس میں لاکھوں برباد ہوں اور چند مقدر سنور جائیں خود غرضی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ لاعلاج حالت کے پیش نظر یہ بہت ضروری ہے کہ لیڈر صاحبان جو کمرہ میں رکھے ہوئے گلدان سے زیادہ نہیں ہیں قوم کو سیاسی گورکھ دھندوں سے الگ کرلیں۔ جس کے ذریعہ غیروں کی تاجپوشی کر کے ہماری حیثیت مکھی ہنکانے والے ملازم سے بھی کم تر ہو گئی ہے۔

اس طرح ہم قوم کو باہمی تصادم سے بچا سکتے ہیں۔ جس سے قوم خانوں میں بٹ کر نفرتوں کا شکار ہوتی چلی جارہی ہے۔ کمزور قوم زور آور کے ساتھ سیاست کر کے نقصان ہی میں رہے گی۔ ان حالات میں ووٹ کی سیاست سے علاحدگی اصلاح نفس اور بُت شکنی سے کم نہیں اور غصہ و انتقام کی غلیظ زندگی سے نجات بھی۔

جس قوم کے عوام میں دین و سیاست دونوں ہوں۔ اسلام کی سربلندی کیلئے سر کٹانے کا جذبہ بھی ہو۔ امت کی گاڑی کو آگے لے جانے کے لیے دینی حس کا طاقتور انجن بھی ہو۔ غربت میں فیاضی کا جوہر بھی ہو۔ اور اس کے بعد بھی ہر طرف رسوائی کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگ رہا ہو بلکہ اس جذبہ سے دوسرے فائدہ اٹھا رہے ہوں تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے

خواص اپنی خواہشوں کے غلام بن کر ملت کو ٹکے ٹکے میں نیلام کر رہے ہیں۔ قوم کی سرفروشی سے ذاتی فائدہ انھار رہے ہیں۔ اس کے دونوں کے بل پر ہوائی جہاز اور ٹرین کے اعلیٰ درجہ میں سفر کر کے ملت کو مصائب میں مبتلا کر کے اور اس کے درد و دکھ کو محسوس نہ کر کے قوم کو ہر روز اپنے سے بدظن کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کو جو مرتبہ ملا ہے اس کے ذریعہ انھیں قوم کی عزت و شرف میں اضافہ کرنا چاہئے تھا مگر یہ الٹے قوم کا مذاق اُڑا کر اپنے کو بھی بے توقیر بنانے پر لگے ہوئے ہیں۔

ایسی حالت میں ضروری ہو گیا ہے کہ مسلم رہنما ووٹ کی سیاست کی گندگی سے الگ ہو کر قوم کے وقار و اتحاد کے لیے کام کریں۔ آپسی فرقہ بندیوں میں گرفتار قوم کو ووٹ کی سیاست کی راہوں پر دوڑانا اتنا ہی خطرناک ہے جتنا کہ کسی دل کے مریض کو کسی پہاڑی پر چڑھانے کی کوشش کرنا جسکا نتیجہ موت کے سوا کچھ نہیں ہے ..... اور یہی ہماری حالت ہے۔

سیاست دراصل طاقت کا دوسرا نام ہے۔ جس کے بل پر حقوق طلبی کی مانگ کرتے کرتے اقتدار پر قابض ہونا فطری چیز ہے۔ لیکن بے طاقت، کمزور اور انتشار کا شکار قوم اپنے ووٹ سے اپنے دشمنوں کو حاکم بنا سکتی ہے خود نہیں بن سکتی۔ موجودہ ووٹ کی سیاست میں ملت کو متحد کر کے کوئی بھی سیسہ پلائی ہوئی دیوار نہیں بنا سکتا ہاں مسلم عوام کو بے وقوف بنا کر اس کے جذبہ ایمانی کے کاندھوں پر سوار ہو کر راجیہ سبھا میں پہونچ کر اور ملت کے جذبہ قربانی کو بتوں کی قربان گاہ پر چڑھا کر غیرخدائی نظام سے وفاداری کی قسم کھا کر اسی پر فخر و افتخار کرتے ہوئے، مذہب و سیاست کی دھار کو اپنے ہی عوام کی گردنوں پر چلانے کا کام کرتے ہوئے، کفر سے دوستی کے ذریعہ ملت کو بچانے کے بیہودہ تصور کو عام کر کے اور مسلمانوں میں مزید انتشار کی آگ بھڑکا کر انھیں بس وعدوں پر ٹالتا رہے گا۔

موجودہ حالات میں ووٹ مسلم اتحاد کی سب سے بڑی قینچی ہے اس قینچی کو مسلم سیاسی رہنما توڑ کر ملت کے شیرازہ کو یکجا کریں گے تو ہندستان میں مسلمان اپنا کھویا ہوا وقار

حاصل کر سکیں گے۔

اسلئے کہ آج ہندستانی سیاست میں مسلمانوں سے زیادہ بے غیرت دوسری کوئی قوم موجود نہیں جو غیروں کی حکومت بنانے کے لیے اپنی بیوی، بیٹی، بہن اور ماں کو غیروں کی بھیڑ میں کھڑا کرکے تمام دستوری حقوق کی پامالی کے باوجود صرف ووٹ کے حق کو بڑی شدومد سے استعمال کرنے پر لگی ہے اگر سارے دستوری حقوق ہمارے پامال ہوچکے ہیں تو جبتک ان حقوق کی بحالی نہ ہوجائے۔ مسلمان ووٹ کے حق کو چھوڑ کر الگ بیٹھ جائیں۔

اسکا نہیں ہے غم کہ حکومت نہیں رہی
غم یہ ضرور ہے کہ شرافت نہیں رہی

آپ ووٹ کی سیاست کا کرشمہ دیکھیں کہ بمبئی کے آگ و خون کے سیلاب میں کھیل کے میدان کا سنیل گواسکر اپنے فلیٹ سے کود کر قاتلوں کے جبڑوں سے آٹھ مسلمانوں کی جان اپنی جان خطرہ میں ڈالکر بچالیتا ہے۔ جس نے نہ ووٹ مانگا نہ مسلمانوں سے کوئی وعدہ کیا مگر مسلمانوں کے دونوں کی بھیک مانگنے والا ایک بھی سیاسی کھلاڑی گھر کے باہر نہیں نکلا چھیالیس برس سے ایک گروہ مسلمانوں کو گالیاں دے رہا ہے ان کی املاک برباد کر رہا ہے ان کی قتل گاہیں بنارہا ہے۔ دوسرا گروہ جو سیکولرازم کا دعویدار ہے قتل گاہوں پر بس اگربتیا سلگا رہا ہے اور گدوں کی طرح منڈلا رہا ہے کہ کب فرقہ پرست مسلمانوں کی لاشوں کے انبار لگائیں اور سیکولرازم کے شیدائی ان پر ٹوٹ کر اپنے ووٹ کے لیے انھیں پر چائیں اور مسلمانوں کی تباہی پر اور ان کی بربادی پر دونوں گروہ اپنی سیاست چلائیں اور پھر دونوں مسلمانوں کو دھمکائیں کہ مسلمانوں کو ہندستانی بنکر رہنا ہوگا یا بھارتی بنکر رہنا ہوگا یا ہندو بنکر رہنا ہوگا ورنہ ان کے خلاف نفرتوں کا طوفان نہیں رکے گا اور اسکا پیمانہ خود سیکولر اور کمیونل ہندو کے پاس ہے ان دونوں نے ہندستانی، بھارتی یا ہندو ہونے کا کوئی اصول وضابطہ طے نہیں کیا ہے۔ بس ان دونوں کی مرضی ہی اصول ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب فسادات کی آگ سلگتی ہے تو سیکولر ہندو لیڈر کہاں روپوش ہو جاتے ہیں سنیل گواسکر کی طرح ظالموں کے سامنے آتے کیوں نہیں اور اگر ہر علاقہ کے یہ

سیاسی کھلاڑی بھی اس آگ میں کود جائیں تو فسادیوں کے حوصلے پست ہو جائیں گے اور پولیس کی گولی بھی بے دریغ چلنا بند ہو جائے گی۔۔۔ مگر مسلمان کو سب ذلیل، کمزور اور اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں ایک دہشت پھیلا کر۔۔۔ دوسرا دہشت زدوں سے ہمدردی جتا کر نفرت کی آگ ایک کے سینہ میں ہے دوسرے کی زبانوں پر ایک عمل سے مار رہا ہے دوسرا رل سے اور اس سب کے پیچھے وہی ووٹ کا سودا ہے اور بس!

جسکا جیتا جاگتا ثبوت ۶ / جنوری سنہ ۱۹۹۳ء سے تین ہفتوں تک چلنے والا بمبئی کا فساد ہے۔ لیکن مرکزی سرکار کا وہی رُخ جو اجودھیا میں تھا یہ تاثر دیتا رہا کہ اسکا تعلق اجودھیا سے نہیں ہے بال ٹھاکرے شیوسینا کے قائد نے اعلان کیا مسلمانوں کو سبق سکھا دیا گیا ہے اگر انھیں بھارت میں رہنا ہے تو وہ اچھے شہری بنیں۔ اور اگر انھوں نے دوبارہ سر اٹھایا تو یہ سبق پھر سکھایا جاسکتا ہے۔

مگر کانگریس کے لیڈروں کا بیان تھا کہ بمبئی کے فساد کا تعلق ملک کی موجودہ فرقہ وارانہ فضا سے نہیں تھا۔

مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ سدھا کر نائک کا بیان تھا۔۔۔ فسادات میں سماج دشمن عناصر کا ہاتھ تھا۔

وزیر دفاع کہہ رہے تھے۔ یعنی شرد پوار سماج دشمن فساد کروا رہے تھے۔

وزیر اعظم نرسمہا راؤ کہہ رہے تھے۔۔۔ انھیں شرد پوار کی رائے سے اتفاق نہیں ہے فساد میں غنڈوں کا ہاتھ ہے۔ زیادہ دنوں تک چلنے کا سبب سیاسی طاقتوں کی سرپرستی تھی۔

وزیر داخلہ ایس۔ بی۔ چوان نے کہا۔۔۔ اس فساد سے اجودھیا کا کیا رشتہ یہ تو سماج دشمنوں اور سیاست دانوں کے گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہے۔

مگر ان بیانات کا رخ بتا رہا ہے کہ چونکہ ہر عمل کی چوٹ وہ سماج دشمنوں کی ہو، سیاسی سرپرستی ہو یا غنڈوں اور سیاست دانوں کے گٹھ جوڑ کی ہو یا کانگریس کی اندرونی پھوٹ کی ہو مسلمانوں پر پڑ رہی تھی اسلئے قابل گرفت اور قابل توجہ نہیں ہے۔

شیوسینا پکار کر کہہ رہی ہے کہ مسلمانوں کو سبق سکھا دیا گیا ہے مگر اقبالی مجرم کو

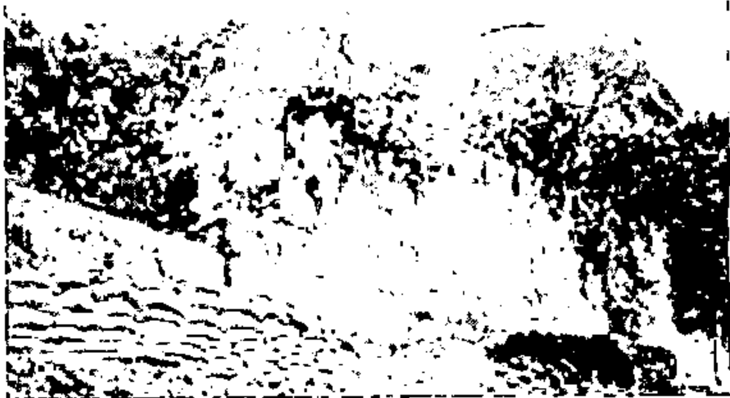
پکڑنے والا نہ اجودھیا میں کوئی تھانہ بمبئی میں۔

اس طرح ہندستان کی تاریخ میں وشو ہندو پریشد کے کارسیوک اور شیوسینا بابری مسجد اور مسلمانوں پر حملہ آوروں کی صورت میں، کانگریس کی کمزور قیادت اور دل کی کثافت کی صورت میں، پولیس اور انتظامیہ بلوائیوں اور قانون شکنوں کی پشت پناہی کے لیے، غنڈے پولیس کے سایہ میں اپنی غنڈہ گردی کے لیے۔ حزب اختلاف اپنی کاہلی اور دوغلی پالیسیوں کے لیے ۶/دسمبر سنہ ۱۹۹۲ء اور ۶/جنوری سنہ ۱۹۹۳ء کے پس منظر میں ہمیشہ یاد کی جاتی رہیں گی...... اور مسلمانوں کو ہندو اقتدار کی کشمکش کی چکی میں پیسا جاتا رہے گا اور مسلمان اپنی غفلت اور صیاد کے جال کے نزدیک بازو سمیٹنے کے عمل کی پاداش میں مارا جاتا رہے گا جس کا سبب خود مسلمانوں کی چند سرکردہ ہستیاں ہیں جو اپنی خواہشوں کی غلام بنکر ملت اسلامیہ ہند کے پیروں میں ووٹ کی بیڑیاں ڈالکر اسے گرفتار بلا بنانے کا کام کرتی رہی ہیں اور کرتی رہیں گی۔

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

موجودہ سیاسی نظام سے علاحدگی کے بغیر، مختلف سیاسی پارٹیوں کی گندی نالیوں سے الگ ہو کر مسلمان جبتک اسلام کے صاف وشفاف دریا کے کنارہ کھڑا نہیں ہوتا وہ اپنے کو پہچان نہیں سکتا گندی نالیوں میں اسے اپنا عکس دکھائی نہیں دے رہا ہے کھلے دریا کے کنارے پہونچے تو اپنے کو پہچان کر جان لے گا کہ پرجاتنتر پرجاتنتر والوں کے لیے ہے اور اسلام مسلمانوں کے لیے ہے اسی سے اسکی سیاسی شناخت بنے گی اور موجودہ سیاسی نظام پر بھرپور سیاسی وار کر کے علاحدہ کھڑے ہوتے ہی اقوام عالم اور ہندستانی قوموں میں اسکی جداگانہ شناخت پیدا ہو جائے گی جسکی آخری منزل حصول اقتدار اور آزادی ہوگی۔

فنا ہو جا جھلک اٹھے گا سینہ نور عرفاں سے
ابھی تو دل کے آئینہ پہ غافل داغ ہستی ہے



مسجد کی پچھلی دیوار

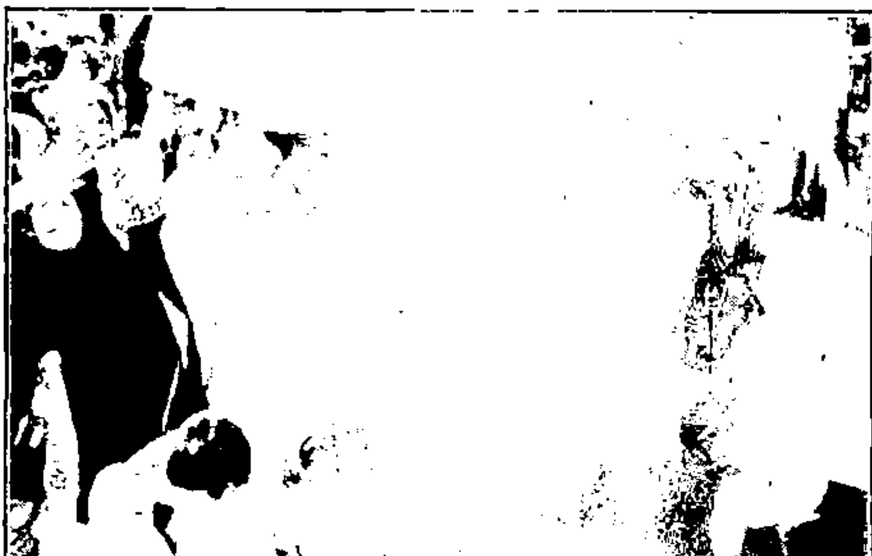
مسجد کی حفاظت کے لئے سرکاری عملہ





مذہبی جنون کا ننگا ناچ





مسلمانوں کا احتجاج



انہدام کے بعد کارسیوکوں کی خوشی

Ayodhya:
A legal reckoner



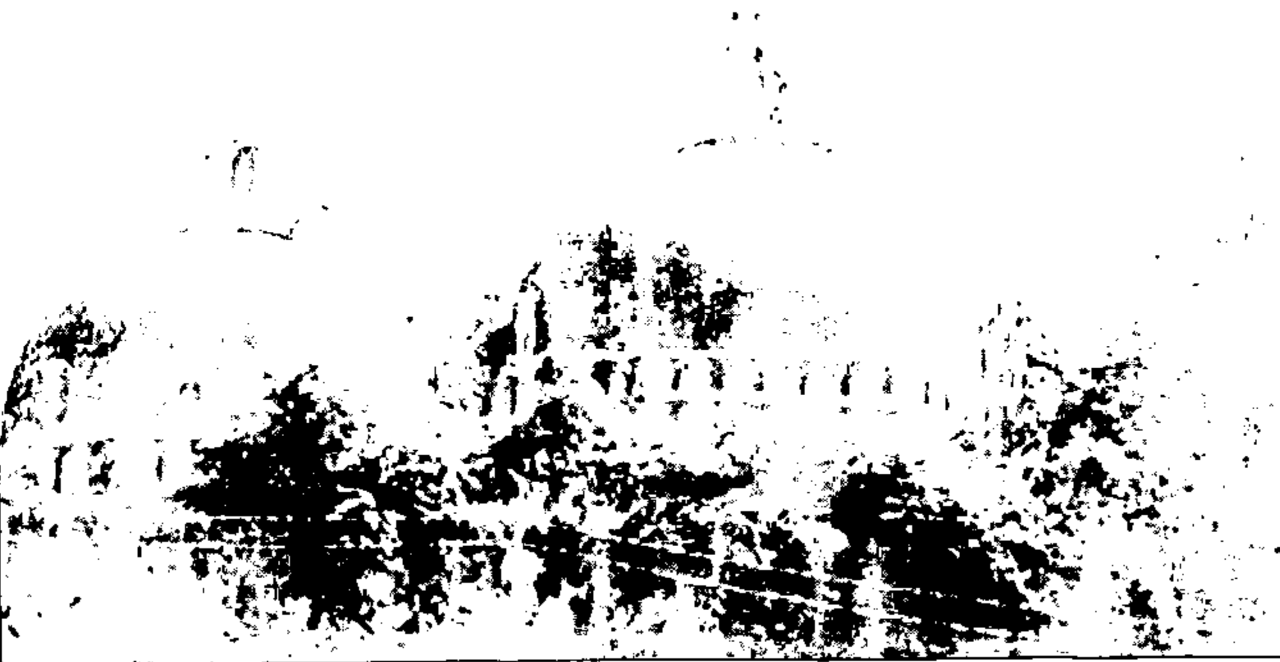




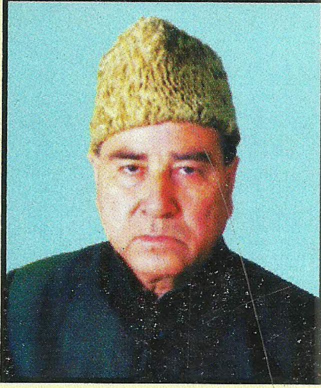
بابری مسجد کا اندرونی منظر



بابری مسجد کا اندرونی منظر



بابری مسجد کے اوپر چڑھے کارسیوک



تقسیم بنگال سے
بابری مسجد
کی شہادت تک

پروفیسر خان محمد عاطف خان

ڈاکٹر خان محمد عاطف کی بیس سالہ قلمی کاوش کا نتیجہ!

ایک سیاسی داستان خونچکاں،

تقسیم بنگال ۱۹۰۵ء سے بابری مسجد کی شہادت ۱۹۹۲ء تک کے اہم سیاسی واقعات، حکومتوں کی وعدہ خلافیاں، پارٹیوں کی بدعہدیاں، ملت کے بزرگوں کی ناعاقبت اندیشیاں، فرقہ پرستوں کی دھمکیاں، مسلم عوام کی قتل گاہیں، آبادیوں کی ویرانیاں، یتیموں کی سسکیاں، بیواؤں کی آہیں، انتظامیہ کے دلخراش قہقہے اور ملت کے رہنماؤں کی بریانی اور قورمہ پر دست درازیاں۔

ایک دستاویز — ایک آئینہ،

اس آئینہ میں اپنوں اور غیروں کے داغدار چہرے 'مسلمانوں کی کی لاشوں پر اگربتیوں اور ملت مظلوم کے گول مول سودے، بدعہدوں کے لئے دعاؤں کا طوفان۔

غرض کہ یہ کہ تاریخ بھی ہے — ادب بھی — سیاست بھی — مگر اپنی طرف سے کچھ نہیں!

ان ہی کے بیانات، اخبارات اور لٹی ہوئی آبادیوں کے خس وخاشاک سے اٹھتے ہوئے شعلوں اور دھویں کے بیچ ہندوستانی سیاست کے............ پن کی مکمل اور نئے مباحث کے باب کھولنے والی داستان حق اور سب کو دعوت فکر دینے والا تاریخی، عملی، ادبی اور سیاسی صحیفہ —

یکم جنوری ۲۰۰۰ء سے اکیسویں صدی کے چڑھتے سورج کی روشنی میں بیسویں صدی کے ڈوبتے سورج کی خونی شفق کے ساتھ!

Price:150/-

Designed & Printed By:- Nice Graphics